Mahmood Ali Collection

المقام المحمود

یعنی

تفسیر

مولانا عبیداللہ سندھی

جزء عم

ناشران

انٹرنیشنل بک کارپوریشن

ھیرآباد۔ حیدرآباد سندہ (پاکستان)

المقام المحمود

یعنی

تفسیر

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی

جزء عم

مع ترجمہ

شیخ الہند مولانا محمود الحسن

پیش لفظ

ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوٹہ

ایم - اے - (بمبئی)، ڈی - فیل (آکسفورڈ)

پروفیسر و صدر شعبہ دین و تمدن اسلام

سندھ یونیورسٹی

تزئین

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

ایم - اے، ایل ایل - بی، پی - ایچ - ڈی، ڈی - لٹ،

پروفیسر و صدر شعبہ اردو - سندھ یونیورسٹی

طبع

سندھ یونیورسٹی پریس - حیدرآباد سندھ

پاکستان

297.1227
O16M

طبع اول　　　　تعداد ۱۰۰۰

سنہ ۱۳۷۹ھ — ۱۹۵۹ع

U-109118
ACC No.
DATE. 7.11.06
LIBRARY New Delhi-62

مسٹر اعجاز محمد صدیقی
انچارج، سندھ یونیورسٹی پریس نے چھاپا
اور
مسٹر نظام الدین ھالیپوٹہ
پروپرائیٹر، انٹرنیشنل بک کارپوریشن
حیدرآباد سندھ نے شایع کیا

LIBRARY
Jamia Hamdard
U109118

ھدیہ:- ۵-۰-۰

اظہار تشکر

ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے بڑی مسرت ہے کہ ہم نے قرآن کریم کی مکمّل تفسیر اردو میں شایع کرنے کا انتظام کرلیا ہے۔ اور پارہ عمّ کی تفسیر سے ابتدا کی ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اسے پسند فرمائیں گے۔ باقی پاروں کی تفسیر بھی انشاء اللہ عنقریب شائع کی جائے گی۔

ہم ڈاکٹر عبدالواحد ھالی پوٹہ صاحب، صدر شعبۂ دینیہ و تمدن اسلامی و عربی، سندھ یونی ورسٹی کے مرھون منت ھیں کہ انہوں نے اِس تفسیر کے لیے پیش لفظ لکھا اور اسکی اشاعت میں ھماری مدد اور رھنمائی کی۔ یہ آپ ھی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ تفسیر شائع ھو سکی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب، صدر شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی نے ھمیں اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے نوازا، تفسیر کی زبان اور پروف کی تصحیح فرمائی اور مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا عبداللہ لغاری کے سوانح حیات بھی شامل کیے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے عدیم الفرصتی کے باوجود اس کار خیر میں بڑی اعانت فرمائی ہے جس کے لیے ہم ان کے مشکور ھیں۔ ہم پروفیسر حاجی غلام حسین جلبانی صاحب، ریڈر شعبۂ عربی، سندھ یونی ورسٹی کے بہت ممنون ھیں کہ انہوں نے دو ھزار روپیہ کی گراں قدر رقم اِس تفسیر کی اشاعت کے لیے بطور امداد عطا فرمائی جس کے بغیر شاید اس کی اشاعت اِتنی جلد نہ ھو پاتی۔

آخر میں ہم سندھ یونی ورسٹی پریس کے عملے اور خاص طور پر پریس کے اِنچارج جناب اعجاز محمد صدیقی اور مولانا محمدحسن بلوچ، کمپوزیٹر، کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ھیں جنہوں نے تفسیر کی چھپائی کے سلسلے میں بے حد محنت کی اور اس کی طباعت کو دیدہ زیب بنایا۔ خداوند تعالیٰ اِن سب کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین۔

نظام‌الدین ھالی پوٹہ۔
پروپرائٹر، انٹر نیشنل بک کارپوریشن۔
حیدرآباد (پاکستان)۔

پیش لفظ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

شکر ہے اس پروردگار رب الاعلیٰ رب العظیم کا کہ جس کی عنایت و رحم و کرم کے طفیل اس عظیم الشان اور نادر تفسیر کا ایک جزء (پارہ عم) شایع ہو رہا ہے۔ آمید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دوسرے اجزاء بھی شایع ہو جائیں گے اور مسلمانوں اور شایقین قرآن کے لیے مشعل علوم و کوائف ثابت ہوں گے۔

یہ تفسیر مولانا عبداللہ سندھی، مکۂ معظمہ کے پُر انوار ماحول میں اپنے تلامیذ اور محبّین قرآن کے سامنے پیش کرتے تھے اور ان کے تلمیذ اور سفر کابل کے رفیق مولانا عبداللہ لغاری صاحب روزانہ قلمبند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دو سال کی مسلسل محنت اور جفا کشی سے یہ ساری تفسیر قلمبند ہوگئی۔ اس کی نقلیں دھلی، لاھور، کراچی وغیرہ میں بھی موجود ھیں لیکن اس کا اصل نسخہ جو خود مولانا لغاری صاحب کے ھاتھ کا لکھا ھوا ھے، سندھ یونیورسٹی میں موجود ھے۔

تفسیر کی اھمیت:

مولانا عبیداللہ سندھی، علماے ھند میں ایک اعلیٰ پایے کے مستند عالم اور اھل اللہ تھے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی دین کی خدمت، دینی علوم و فنون کے مطالعے اور مسلمانوں کی سیاسی اور علمی برتری کے حصول کے لیے وقف کردی تھی۔ بچپن ھی سے بڑے ذھین تھے۔ للّٰھیت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ خوش قسمتی سے ان کو اعلیٰ پایہ کے استاد مل گئے اور روحانیت کے سلسلے میں قطب زمان حافظ محمد صدیق صاحب بھرچونڈوی رح اور عارف باللہ حضرت غلام محمد صاحب خانپوری رح جیسے بزرگوں کی صحبت اور ارشاد میسّر ھوا جس کی برکت سے مولانا صاحب کا علمی، روحانی اور عملی پایہ بہت ھی بلند و اعلیٰ ھوگیا۔

مولانا صاحب ایک طرف علوم عقلیہ کے ماھر تھے دوسری طرف علوم نقلیہ۔ علم حدیث، علم تفسیر و علوم الاصول میں بے نظیر دسترس رکھتے تھے۔ ساتھ ھی ساتھ جدید علوم کا بھی مطالعہ کیا تھا اور قوموں کی سیاست اور ترقی و تمدن کے حالات اور اصول کی گہرائیوں تک غور و فکر کرنے کے عادی تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ حضرت شاہ ولی اللہ رح کے فلسفے اور تعلیمات کے مطالعہ اور اس کی اھمیت کے معلوم کرنے اور تدقیق و تحقیق میں گذارا۔ دنیا کی بھی سیر و سیاحت کی اور چشم دید حالات و حقایق سے روشناس ھوئے۔

تفسیر قرآن، مولانا صاحب کا عمر بھر کا مرغوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ ان کی ابتدائی تفسیر جو انھوں نے قیام دھلی کے دوران میں پہلی عالمی جنگ سے پہلے مرتّب کی تھی اس کی نقلیں سندھ یونیورسٹی حیدرآباد اور دوسری جگھوں میں موجود ھیں لیکن یہ تفسیر جو اب شایع ھورھی ھے اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ مولانا صاحب کا تجربہ و مشاھدہ اور علمی معیار بہت بڑھ چکا تھا۔ اس وقت تک ان کا نقطۂ نظر بہت ھی وسیع ھو چکا تھا اور ان کا قلب دیار حبیب (صلّی اللہ

علیہ وسلم) اور فیوض الحرمین کے انوار کا منبع بن چکا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تفسیر بڑے بڑے علمی مباحث اور نکات و رموز سے پُر ہے ۔ اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کے اصول، سیاسیات اور تمدن و ارتقاء ملل کی تعلیمات وغیرہ سبھی کی اثر اندازی موجود ہے ۔ تاہم کہیں بھی عقل کو روحانیت اور طبعیات کو اشراقیت پر اس قدر فوقیت نہیں دی گئی کہ اصولی عقائد میں سلف صالحین سے کسی بھی اہم بات میں لا ینحل اختلاف ہو۔

اس تفسیر میں یہ خصوصیت ہے کہ طبعیات اور جدید سائینس اور علوم کو بھی قرآنی مسائل کے سمجھنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ قرآنی نقطۂ نظر سے ان کی اصلیت کا اندازہ لگانے کے راستے بھی دکھائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو مختلف حالات اور رجحانات پیدا ہو رہے ہیں ان سب میں قرآن پاک ہی سے ہدایت حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک انسانی ہدایت کے لیے ایک بین الاقوامی راہ ہے اور نجات دلانے کا ایک واحد مصدر عام ہے ۔ اس میں انسانیت کے لیے ہر زمانے اور تمام حالات میں نورِ ہدایت، راہِ نجات اور فلاح و عروج کے لیے فیوض و برکات میسّر ہوتے رہیں گے ۔ یہ تفسیر بعض دیگر تفسیروں سے مختلف ہے جن میں فقط شان نزول اور اسرائیلی قصّے اور کہانیوں پر اکتفا کرنے کی وجہ سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن فقط مخصوص مواقع اور گذشتہ زمانے کے لیے ہی نازل ہوا تھا۔ لیکن اس تفسیر سے قرآن شریف کی تعلیمات کی عمومیت اور بین الاقوامیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ تعلیم جو ساری انسانیت کے لیے اور ہر وقت، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہے، حاصل ہوسکتی ہے۔

اس تفسیر میں بعض جگہ بہت بڑے بڑے مضامین، اعلیٰ افکار اور دقیق مسائل بھی زیر بحث ہیں ۔ اس وجہ سے بعض مواقع قدرے مشکل معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن سمجھدار اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے ان کا سمجھنا اور حل کرنا مشکل نہیں ۔ بعض مواقع پر کافی تفصیل سے کام لیا گیا ہے لیکن بعض جگہ اختصار بھی پایا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ چونکہ بعض مسائل پر پہلے ہی تفصیل سے بحث آچکی ہے اس لیے اس آخری پارے میں ان کے متعلق اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ پھر بھی ماشاءاللہ اتنی تفصیل اور اس قدر علوم، رموز اور کوائف پائے جاتے ہیں جو دوسری تفاسیر میں نہیں ملتے۔

ہر مفکّر اور مفسّر کا کوئی نہ کوئی علمی اور ذہنی موقف ہوتا ہے۔ اس تفسیر میں مولانا عبیداللہ صاحب کا علمی اور فلسفی موقف شاہ ولی اللہ دہلوی کی حکمت اور فلسفہ و تعلیم ہے۔ اسی وجہ سے شاہ ولی اللہ کی حکمت کی بکثرت اصطلاحات اور الفاظ مستعمل ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس حکمت اور فلسفے سے روشناس ہوں گے ان کو اس تفسیر کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہوسکے گا ۔ ایسے الفاظ و اصطلاحات یہ ہیں :- روحِ اعظم یا روح اکبر۔ شان الٰہی۔ ابداع ۔ خلق ۔ تدبیر ۔ عرش۔ ماء، الملا الاعلیٰ ۔ حظیرۃ القدس۔ تجلّی ۔ حیوانیت ۔ بہیمیت ۔ ملکیت۔ عالم الشہادۃ" وغیرہ وغیرہ۔

حضرت شاہ ولی اللہ رح کے فلسفہ اور حکمت سے اگر ہمارا تعلق ہوگا تو ہم کو قرآن

پاک کے مختلف رموز و حقائق سے زیادہ وقوف حاصل ہوگا اور پھر ہمیں اس تفسیر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوسکے گا کہ قرآن انسان کی فطری ضروریات اور حاجات کو پورا کرنے کے لیے ضروری اسباب و سامان مہیا کرتا ہے اور طریقے بھی بتاتا ہے اور واقعی اسلام دین الفطرت ہے اور قرآنی تعلیمات دین الفطرت کی حامل ہیں۔

حضرت مولانا مضمون کے لحاظ سے اس جزء **عم** کو تین حصوں میں تقسیم کرکے بتاتے ہیں کہ سورہ **نباء** سے لے کر سورہ **اعلیٰ** تک انسان کے معاد اور مستقبل کی زندگی اور قیامت کے متعلق بیان ہے۔ اور سورہ **اعلیٰ** سے لے کر سورہ **قدر** تک انسانیت کی فطرت کے متعلق ارشادات ہیں اور سورہ **قدر** سے لے کر آخر تک قرآن شریف کی تعلیمات کا لب لباب بیان کیا گیا ہے۔ اس سے سمجھدار لوگوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف انسانی فطرت کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بہترین نسخہ ہے اور جو اس نسخہ کو استعمال کرے گا وہ فطری ترقی اور عروج اور ہمیشہ کی زندگی کی بہتری اور کمال میں سبقت لے جائے گا۔ اس کے علاوہ اس پارہ کے مطالعہ سے زندگی کے رموز و اسرار اور اعلیٰ علوم بھی حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً قوموں کے عروج و زوال کے اصول، انقلاب کے نظریے، ارتقاء اور ترقی کے مسائل، دنیا اور کائنات میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبعی اور اصولی قوانین، اللہ کی اور غیر اللہ کی پرستش کی نفسیات، روز محشر، کتابتِ اعمال، سلسلۂ حیات۔ شرائع و ملل کے تعلقات وغیرہ وغیرہ مسائل کے بارے میں فہم و بصیرت حاصل ہوسکتی ہے۔ اور اس کا حصول اللہ کے فضل و کرم کی ایک بڑی نشانی ہے۔

اس تفسیر کے ساتھ قارئین کی سہولت کے لیے قرآن شریف کی آیات اور ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رح کا ہے جو مولانا عبیداللہ سندھی کے استاد تھے۔ تفسیر کے جامع مولانا عبداللہ لغاری صاحب کے مشورہ ہی سے یہ ترجمہ منتخب کیا گیا ہے تاکہ دونوں بزرگوں کی قرآنی خدمات سے استفادہ ہوسکے۔ کبھی کبھی ترجمہ اور تفسیر میں قدرے مطابقت نہیں پائی جاتی لیکن یہ اختلاف درحقیقت علم کے ازدیاد کا باعث ہوگا۔ کیونکہ پڑھنے والے کو دونوں بزرگوں کے نقطۂ نظر سے واقفیت ہوگی اور قرآن کے سمجھنے میں مزید وسعت حاصل ہوگی۔

اللہ پاک ہم سب کو قرآن کے علوم و حقائق سے آگاہ فرمائے اور قرآن پر عمل کرنے کی توفیق اور استقامت عطا فرمائے۔ (آمین)

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

المفتقر الی اللہ

ڈاکٹر عبدالواحد ہالیپوتہ۔ ایم - اے (بمبئی)، ڈی فل (آکسفورڈ)

فاضل علوم دینیہ مدرسہ مظہرالحق نصرپور سندھ

صدر شعبۂ علوم دین و تہذیب اسلام سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (سندھ)

مولانا عبیداللہ سندھی رح کی تفسیر اور اس کی ترتیب

مولانا عبیداللہ، صفر ۱۳۴۵ھ (اگست ۱۹۲۶ع) میں مکۂ معظمہ پہنچے تھے- وہاں ۱۲-۱۳ سال قیام رہا اور جیسا کہ ذاتی ڈائری (صفحہ ۲۰) سے معلوم ہوتا ہے انہوں نے وہاں کے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا- لیکن ولی اللھی فلسفے میں قیام دیوبند کے زمانے ہی سے جو شغف پیدا ہوا تھا اور ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ع) سے جس کی علمی اور سیاسی اشاعت کے لیے وہ سر بکف ہوئے تھے اس کی ترجمانی کا موقع آنھیں یہیں ملا- چنانچہ انہوں نے جلد ہی اس تفسیر کی طرف توجہ فرمائی- مکۂ معظمہ میں رباطِ ٹونک میں قیام تھا- تیسویں پارے کی تفسیر جو تعارف کے لیے پہلے شائع ہو رہی ہے وہ یوم الاحد ۱۱ شعبان ۱۳۵۳ھ (۱۸ نومبر ۱۹۳۴ع) سے شروع ہوئی اور جمعہ ۲۳ شعبان ۱۳۵۳ھ (۲۹ نومبر ۱۹۳۴ع) کو مکمل" ہوئی- ہمارے محترم فاضل ڈاکٹر عبدالواحد ھالی پوتہ صاحب جو براہِ راست مولانا مرحوم سے اور مولانا عبداللہ لغاری مرحوم سے مستفیض ہوئے ہیں اور جنھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے فلسفے پر آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ حاصل کی ہے، اس تفسیر کا صحیح طور پر تعارف فرمائیں گے- تاہم مولانا مرحوم نے خود بھی مکۂ معظمہ کے قیام کے زمانے میں اس تفسیر سے متعلق یوں ارشاد فرمایا تھا-

" میں یقیناً ۱۲-۱۳ سال سے قرآنِ عظیم اور حجۃ اللہ البالغہ کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا رہا- تفسیرِ قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے اس زمانے میں آنھیں امام ولی اللہ دھلوی رح کے اصول پر بالاطمینان حل کر سکا- جو لوگ میری طرح امام ولی اللہ دھلوی کو نہیں مان سکتے آن کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کر سکتا- لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآنِ عظیم میں اس زمانے میں قابلِ عمل تعلیم کا ایک عملی نصاب نظر آیا- اس میں اِس تجلّی ربز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے- میں نے امام ولی اللہ دھلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا- مثلاً بدورِ بازغہ، خیرِ کثیر، تفہیماتِ الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ- ان کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے مولانا شاہ رفیع الدین دھلوی رح کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسمعیل شہید رح کی عبقات اور مولانا محمد قاسم رح کی قاسم العلوم، تقریر دلپذیر اور آبِ حیات کو استعمال کیا- مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا- اور ساتھ ہی مدارسۂ قرآن حکیم بھی جاری رہا- اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے- للہ الحمد"-*

مولانا عبیداللہ جو کچھ تفسیر بیان فرماتے تھے مولانا عبداللہ لغاری قلمبند کرتے جاتے تھے- اور اس املاء کی نوعیت کچھ وعظ جیسی تھی- اسی لیے بعض اوقات ایک ہی بات مختلف

---

* " ذاتی ڈائری "- مطبوعہ لاھور ۱۹۴۶ع- صفحہ ۲۵-۲۶

انداز سے سمجھائی گئی ہے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ مضامین کی تکرار اس طرح اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ راقم الحروف کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ عبارت میں جہاں کہیں الجھاؤ تھا وہ دور کردیا ہے اور حتی الامکان اصل زبان و عبارت قائم رکھی ہے۔ لیکن اس مقصد کے حصول میں خاصی دقت اٹھانی پڑی۔ سندھ یونی ورسٹی پریس کے کمپوزیٹر محمد حسن صاحب (جن کی خصوصی توجہ کے ہم ممنون ہیں) پہلے اصل تفسیر کے اجزاء کی نقل کرتے تھے لیکن عموماً کاربن کاپی یا کاربن پنسل والی تحریر مجھے دیتے تھے۔ اس کے پڑھنے اور درست کرنے میں غور و فکر کی ضرورت تھی۔ پھر بعض مقامات ایسے بھی تھے جہاں مولانا عبداللہ لغاری کے قلم سے اضافے تھے۔ اُن کو چسپاں کرنا مزید احتیاط کا متقاضی تھا۔ پھر پہلا پروف جناب محمد حسن صاحب خود ہی درست کرتے تھے لیکن بقیہ دو پروف مجھے روانہ فرماتے تھے۔ اور آخری پروف کی تصحیح کے بعد جو کاپی تیار ہوتی تھی اُس پر نظر ڈالنے کا موقع مجھے حاصل نہ تھا۔ چنانچہ بعض اغلاط پھر بھی موجود ہیں اور میں اپنے کام کی تمام خامیوں کا خود ہی ذمہ دار ہوں۔

مولانا عبداللہ لغاری کو اس تفسیر کی اشاعت کا بڑا اشتیاق تھا۔ شکر ہے کہ اس کے چند مطبوعہ صفحات انھوں نے اپنے انتقال سے پہلے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا تھا۔ خدا کرے کہ مولانا عبیداللہ کی مفصل "ذاتی ڈائری" جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے اور جو مولانا عبداللہ لغاری کی کوشش سے مرتب بھی ہوچکی ہے جلد از جلد منصۂ شہود پر آجائے تاکہ ان کی سیاسی تحریک کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو سکیں۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفسّر اور تفسیر کے جامع دونوں کے مختصر حالات بھی درج کردیے جائیں تاکہ اُن کے ماحول اور مختلف رجحانات کا صحیح جائزہ لیا جا سکے۔

ازین نورے کہ از تو بر دلم تافت
یقین دانم کہ آخر خواهمت یافت

احقر۔ غلام مصطفیٰ خاں

شعبۂ اردو۔ سندھ یونی ورسٹی۔ حیدرآباد

سہ شنبہ ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ (۲۱ مارچ ۱۹۵۹ع)

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمہ کے حالات زندگی*

سیالکوٹ کے ایک گاؤں چیان والی میں شب جمعہ ۱۲ محرم ۱۲۸۹ ھ (مطابق ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ع) کو پیدا ہوئے۔ ان کا باپ رام سنگھ جو اپنے خسر کی ترغیب پر سکھ ہوگیا تھا، ان کی ولادت سے چار ماہ پہلے فوت ہوچکا تھا۔ اس لیے ان کی ماں ان کو اپنے باپ کے پاس لے آئی اور اس کے فوت ہونے پر اپنے بھائیوں کے پاس جام پور (ضلع ڈیرہ غازی خان) لے گئی۔ وہاں ۱۸۷۸ع میں اردو مڈل اسکول میں انہوں نے داخلہ لے لیا۔ ۱۸۸۴ع میں وہاں کسی ساتھی کے پاس تحفۃ الهند دیکھی، پھر شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان اور مولوی محمد کی کتاب احوال الآخرۃ (پنجابی) پڑھی اور تحفۃ الهند سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کے مصنّف کے نام پر اپنا نام بھی خود ھی عبیداللّٰہ رکھ لیا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۷ع کا ھے جب کہ وہ مڈل کی تیسری جماعت کے ایک ممتاز طالب علم تھے۔ چنانچہ عربی پڑھنے کے شوق میں اور اپنے اعزاز کے تعاقب کے خوف سے ایک رفیق عبدالقادر کے ساتھ سندھ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ اور بھرچونڈی (ضلع سکھر) میں سیّد العارفین حافظ محمد صدیق صاحب کی خدمت میں پہنچ کر بہت متاثر ہوئے اور ان سے قادری راشدی طریقے میں بیعت بھی ہوگئے۔ پھر وہاں سے رخصت ہو کر ریاست بہاولپور کے دیہات کی مسجدوں میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھیں اور دین پور میں هدایۃ النحو تک کتابیں پڑھ لیں۔ پھر کوٹلہ رحم شاہ (ضلع مظفرّ گڑھ) میں مولوی خدابخش سے کافیہ پڑھی اور اس کے بعد کسی طالب علم کی نشان رھے۔ صفر ۱۳۰۶ھ میں دیوبند پہنچ گئے۔ قریب پانچ ماہ میں قطبی تک منطق کے رسائل مختلف اساتذہ سے اور شرح جامی مولانا محمد محسن سے پڑھی۔ پھر چند ماہ کے لیے مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسے میں پڑھا اور چند ماہ مدرسۂ عالیہ رامپور میں مولوی ناظرالدین سے تعلیم حاصل کی اور صفر ۱۳۰۷ھ (اکتوبر ۱۸۸۹ع) میں واپس دیوبند آگئے۔ وھاں ۲-۳ ماہ مولانا حافظ احمد سے پڑھنے کے بعد حضرت شیخ الهند رحمۃ اللّٰہ کے درس میں شامل ہوگئے۔ ھدایہ، تلویح، مطوّل، شرح عقائد وغیرہ کے امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کیے۔ رمضان المبارک میں اصول فقہ ایک رسالہ لکھا جسے شیخ الهند رحمہ نے پسند فرمایا۔ اسی دوران میں حضور انور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللّٰہ علیہ کو خواب میں دیکھا اور احباب نے ان کے متعلق خواب دیکھے۔ شوال ۱۳۰۷ھ میں تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوئے اور جامع ترمذی مولانا شیخ الهند سے پڑھی۔ پھر گنگوہ جا کر سنن ابو داؤد، حضرت مولانا رشید احمد

---

* یہ حالات مولانا عبیداللہ کی خود نوشتہ سوانح عمری (ذاتی ڈائری۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۶ع) سے ماخوذ ھیں۔

سے پڑھی لیکن وہاں بیمار ہوگئے تو دہلی چلے آئے اور مولوی عبدالکریم صاحب سے (جو مولانا محمد قاسم اور مولانا رشیداحمد کے شاگرد تھے) حدیث کی بقیہ کتابیں پڑھیں - ۲۰ جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ (۳۱ جنوری ۱۸۹۱ع) کو دہلی سے بھرچونڈی پہنچے لیکن وہاں ان کے شیخ صرف دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ اس لیے اس سال شوال میں اپنے شیخ کے خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود کے پاس امروٹ (ضلع سکھر) چلے گئے۔ تو انہوں نے مولوی محمد عظیم خاں کی صاحبزادی سے ان کی شادی کردی اور ان کی والدہ کو بھی وہیں بلوادیا۔ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ع) تک وہیں رہے۔ اسی دوران میں گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد) کے کتب خانے سے اور وہاں کے حضرات سے بھی استفادہ کیا اور اسی زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ اسلام سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری پڑھنے سے انقلابی پروگرام ذہن میں آیا۔ ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ع) میں دیوبند پہنچے اور اپنے اس پروگرام میں چند اصلاحات حضرت شیخ الہند سے حاصل کیں۔ اس کے بعد امروٹ واپس آکر ایک مطبع قائم کیا جس میں دو سال تک عربی و سندھی کی بعض نایاب کتابیں چھپتی رہیں۔ ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان بھی یہیں جاری کیا۔ لیکن ایک مدرسے کی بھی ضرورت تھی جو ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ع) میں گوٹھ پیر جھنڈا میں پیر مولانا رشداللہ (صاحب العلم الرابع) کے نام پر "دارالرشاد" نام سے قائم کیا اور سات سال تک اس کے مہتمم رہے۔

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ع) میں حضرت شیخ الہند کی طلبی پر دیوبند گئے اور وہاں چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتے رہے۔ مولانا محمد صادق سندھی اور مولانا ابومحمد احمد لاہوری اور مولوی احمد علی بھی ان کے ساتھ تھے۔ پھر ۱۳۲۱ھ میں یہ کام دہلی منتقل ہوا۔ وہاں نظارۃ المعارف قائم ہوئی جس کے سرپرست حکیم اجمل خاں اور نواب وقارالملک بھی تھے۔ حضرت شیخ الہند نے یہیں ان کا تعارف ڈاکٹر انصاری سے کرایا اور انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی سے ملاقات کرادی۔

۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ع) میں حضرت شیخ الہند کے حکم سے کابل گئے اور وہاں جاکر اندازہ ہوا کہ پچاس سال سے جو طلبہ شیخ الہند تیار کر رہے تھے وہ سب کے سب مولانا عبیداللہ کے اتباع کے لیے گویا تیار بیٹھے تھے۔ چنانچہ سات سال تک وہ حکومت کابل کی شرکت سے اپنا کام کرتے رہے اور ۱۹۱۹ع میں امیر حبیب اللہ خاں کے مشورے پر ہندوؤں سے مل کر کام کرنا شروع کیا اور انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی بیرونی شاخ ۱۹۲۲ع میں کابل میں قائم کی جس کے صدر مولانا عبیداللہ ہی ہوئے۔

۱۹۲۳ع میں ترکی جاتے ہوئے سات ماہ ماسکو میں رہے اور نیشنل کانگریس کے تعلق کی وجہ سے سرکاری مہمان بنائے گئے۔ ترکی میں قریب تین سال قیام رہا اور اس طرح غیرملکوں میں اسلام کا اور اپنی تحریک کا تعارف کراتے رہے۔ ۱۳۴۴ھ میں حج کے موقع پر مؤتمر خلافت منعقد ہوئی۔ اس میں مولانا اپنے احباب سے ملنے کے خواہش مند ہوئے لیکن کچھ دیر

سے پہنچے یعنی صفر ۱۳۴۵ھ (اگست ۱۹۲۶ع) میں پہنچے اور حکومت حجاز کو یقین دلایا کہ سیاسی پروپگنڈا نہیں کیا جائے گا۔ بہرحال مکۂ معظمہ میں مولانا پھر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے پر اور قرآنی حکمت پر غور و فکر کرتے رہے۔ وھیں یہ تفسیر تیار ھوئی۔

مارچ ۱۹۳۹ع میں وہ ھندوستان واپس آئے۔ سیاسی جماعتوں سے بھی تعلق رھا لیکن زیادہ تر ولی اللہی فلسفے کی تلقین میں مصروف رہے۔ بالآخر دوشنبہ ۲ رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ (۲۱- اگست ۱۹۴۴ع) کو بمقام دین پور (ریاست بہاول پور) وفات پائی۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔ اقبال کا یہ شعر شاید آن کی زندگی کی ترجمانی کر سکے:-

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ھو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

تفسیر کے جامع مولانا عبداللہ لغاری مرحوم کے حالات*

عبداللہ بن نہال خان بن محمد خان بن رستم خان بن فتح محمد خان لغاری ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ع) میں بمقام "دادلغاری" تحصیل میر پور ماتھیلا (سندھ) پیدا ہوئے - اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد یعقوب سے صرف کی کچھ کتابیں پڑھیں - صرف کی بقیہ کتابیں اور نحو کی کچھ کتابیں "گوٹھ پنھواری" میں مولوی عبدالقادر سے پڑھیں - اس کے بعد "نوشھرہ فیروز" میں قاضی محمد عالم ، قاضی عبدالرؤف ، قاضی عبدالحفیظ اور مولوی فیض الکریم کے یہاں تعلیم حاصل کی پھر سندھ کے مشہور حکیم شمس الدین احمد صاحب (سلمہ اللہ تعالیٰ) کے چچا مولوی عبدالکریم بن مولوی محمد عثمان سے (جو حافظ حدیث تھے اور علامہ شوکانی رح کے شاگرد تھے) تعلیم پائی - پھر موقع ملا تو مقام "ڈبھرہ" کے قریب مخدوم غلام محمد بن مخدوم حبیب اللہ سے مستفیض ہوئے - اسی مقام کے قریب ایک گانو "تگون" ہے - وہاں ایک صوفی اور مشہور خطاط مولوی عبدالقدوس تھے - ان سے بھی فیض حاصل کیا - پھر کراچی میں مولانا محمد صادق کے والد مولانا عبداللہ سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں - اس کے بعد ٹھٹھہ کے مشہور عالم مولانا محمد علی مرحوم کے بعض شاگردوں سے بھی استفادہ کیا اور گھر واپس آئے تو مولوی محمد امین ناراض ہوئے کہ تم نے سیر و سیاحت میں اپنا وقت ضایع کیا ہے اب ملتان جاؤ - چنانچہ یہ ملتان کے مشہور محدث مولانا سلطان محمود کے پاس ایک سال تک علم حدیث حاصل کرتے رہے - پھر بہاول پور میں "صاحب السیر" کی خانقاہ میں مولوی عبدالرشید سے تعلیم حاصل کی اور کچھ دن مولوی عاقل سے بھی مستفیض ہوئے - پھر مولوی الٰہی بخش لانگاہ منطقی عمرپوری سے حدیث ، فقہ اور منطق کی آخری کتابیں پڑھیں اور سلسلۂ تعلیم ختم ہوا - وطن واپس آئے تو ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ع) میں شادی ہوئی - اس کے بعد "امروٹ" میں مولانا عبیداللہ سندھی رح سے ملاقات ہوئی اور ان کی انقلابی سیاست میں رفیق کار بن گئے مولانا کے نظریات کے نشر و اشاعت کے لیے امروٹ میں ایک مدرسہ اور ایک پریس بھی قائم کیا اور ایک رسالہ ھدایت الاخوان جاری کیا - لیکن کچھ عرصے کے بعد ھی گوٹھ "پیر جھنڈا" میں وھاں کے پیر صاحب کی حمایت سے ایک مدرسہ "دارالرشاد" قائم کیا - مولانا عبداللہ اس کے مہتمم مقرر ہوئے - اس طرح وھاں ان دونوں بزرگوں کو ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ع) سات سال تک طلبہ میں "ذھنی بیداری" پیدا کرنے کا موقع ملا - اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمودالحسن علیہ الرحمہ نے مولانا عبیداللہ اور مولانا محمد صادق کو طلب کیا اور سیاسی زندگی میں حصہ لینے کی دعوت دی - مولانا عبداللہ

---

* یہ حالات جناب حافظ محمد صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین - سندھ یونی ورسٹی) سے حاصل کیے گئے ھیں . جنھوں نے سندھی ادبی بورڈ کے رسالہ مھران کے "سوانح حیات نمبر" (مطبوعہ حیدر آباد ، ۱۹۵۷ع . ص ۲۷۰ - ۲۷۹ اصل مضمون بعنوان "مولوي عبدالله لغاري" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سے بہت کچھ اخذ کیے تھے .

بھی ساتھ گئے تھے - وہ بھی متاثر ہو کر واپس آئے اور شیخ الہند رح کے مشورے کے مطابق ۱۹۱۴ع تک اس مدرسے کا انتظام سنبھالتے رہے۔ لیکن اسی سال مولانا عبیداللہ وہاں تشریف لائے اور "کابل" چلنے کے لیے فرمایا - چنانچہ ۱۹۱۵ع میں ان کے ساتھ "کابل" گئے اور مولانا عبیداللہ کے رفیق کار اور معتمد خاص بن کر رہے۔

تقریباً دو سال بعد مولانا عبیداللہ نے ان کے ہاتھ اپنے اور راجہ مہندر پرتاب کے چند خصوصی خطوط بھیجے کہ وہ ہندوستان میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خان وغیرہ کو پہنچادیں - نیز یہ کہ دین پور، امروٹ اور پیر جھنڈا والے بزرگوں سے ایک عبارت پر (جو کہ ان کو قلم بند کرادی گئی تھی) دستخط لے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کی اجازت لیں۔ مولانا عبداللہ نے یہ دونوں کام کیے اور اجازتیں لے کر سردار عبدالرزاق (میزان العلماء) کو کابل روانہ کردیں .

"ریشمی خطوط" والے واقعے کے سلسلے میں مولانا عبداللہ صاحب اور چند رفقاء گرفتار کیے گئے لیکن مولانا کے بیان سے وہ رفقاء بعد میں رہا کر دیے گئے اور خود مولانا دو سال تک لاہور، پٹھان کوٹ، دین پور اور کراچی وغیرہ کے جیلوں میں نظر بند رہے او، پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر رہا کیے گئے۔ پھر جب انگریزوں کے خلاف امیر امان اللہ خان (والی کابل) برسر پیکار ہوئے تو مولانا عبداللہ کو ان کے گھر میں نظربند کردیا گیا کیونکہ اس جنگ کے محرک مولانا عبیداللہ سندھی ہی تھے جن کے یہ رفیق تھے .

۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ع) میں مولانا عبیداللہ سندھی مکۂ معظمہ پہنچے - بعد میں مولانا عبداللہ لغاری بھی یہاں سے آن کی خدمت میں پہنچے - مولانا سندھی نے تفسیر قرآن، علوم اسلامیہ اور فلسفۂ شاہ ولی اللہ رح پر جو تقریریں کیں وہ سب مولانا عبداللہ نے قلمبند کیں بلکہ جتنی کتابیں مولانا سندھی کی افکار اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے سے متعلق شایع ہوئی ہیں ان سب کا مواد درحقیقت مولانا عبداللہ ہی کا جمع کردہ تھا - ۱۹۳۹ع میں مولانا سندھی واپس تشریف لارہے تھے تو بعض انتظامات کی خاطر مولانا عبداللہ آن کے آنے سے پہلے سندھ پہنچ گئے اور ان کے آخری دم تک ساتھ رہے - مولانا سندھی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد قریباً چھ سال سندھ یونی ورسٹی کے بعض استادوں اور شاگردوں کو قرآن پاک کی تفسیر و حکمت سمجھانے کے لیے یونیورسٹی میں وہ ڈاکٹر بلوچ صاحب اور ڈاکٹر ھالیپوتہ صاحب کے یہاں مقیم رہے۔ بلکہ آخر کے تین سال ڈاکٹر ھالیپوتہ صاحب کے مکان پر ہی مقیم رہے اور وہاں سے قرآن شریف اور حکمت ولی اللّٰہی کی تعلیم جاری رکھی - آخر میں سندھ یونیورسٹی میں ایم - اے کے طلبہ کو تفسیر پڑھانے کے لیے معلم مقرر ہوئے - لیکن جلد ہی اچانک ۱۳ ستمبر ۱۹۵۸ع کو پیشاب بند ہوا تو ۱۵ ستمبر کو سیول ھسپتال، حیدرآباد میں داخل ہونا پڑا - ۱۷ ستمبر بروز چہارشنبہ آن کا آپریشن ہوا - حافظ محمد صاحب سے فرمایا کہ :-ع "دمے چند خوردیم و گفتیم و بس-" اس کے بعد والی شب یعنی شب پنجشنبہ (۴- ربیع الاول ۱۳۷۸ھ) کو ۱۱ بجے انتقال فرمایا اور اسی روز شام کو سانگھڑ میں دفن ہوئے۔

-- اِنّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون --

المقام المحمود

یعنی

تفسیر مولانا عبید اللہ سندھی علیہ الرحمہ

مع

(ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ)

جسے ان کے تلمیذ مولانا عبداللہ لغاری ولی اللہی نے ۱۳۵۳ھ (مطابق ۱۹۳۳ء) میں
مکۃ معظمۃ میں قلمبند کیا

سُورَۃُ النَّبَاِ مَکِّیَۃٌ وَّھِیَ اَرْبَعُوْنَ اٰیَۃً وَّ فِیْھَا رُکُوْعَانِ

سورہ نبا مکہ میں نازل ہوئی اِس میں چالیس آیتیں اور دو رکوع ھیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع کرتا ھوں میں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ (۱) عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ (۲) الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ (۳)

کیا بات پوچھتے ھیں لوگ آپس میں پوچھتے ھیں اُس بڑی خبر سے جس میں وہ مختلف ھیں

کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ (۴) ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ (۵) اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِھٰدًا (۶)

ھرگز نہیں اب جان لینگے پھر بھی ھرگز نہیں اب جان لینگے کیا ھم نے نہیں بنایا زمین کو بچھونا

وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷) وَّ خَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا (۸) وَّ جَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا (۹)

اور پہاڑوں کو میخیں اور تم کو بنایا ھم نے جوڑے جوڑے اور بنایا نیند کو تمہاری تھکان دفع کرنیکے

وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا (۱۰) وَّ جَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا (۱۱) وَ بَنَیْنَا فَوْقَکُمْ

لیے اور بنایا رات کو اوڑھنا اور بنایا دن کمائی کرنے کو اور چُنی ھم نے تم سے اوپر سات

سَبْعًا شِدَادًا (۱۲) وَّ جَعَلْنَا سِرَاجًا وَّ ھَّاجًا (۱۳) وَّ اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ

چنائی مضبوط اور بنایا ایک چراغ چمکتا ھوا اور آتارا نچڑنے والی بدلیوں سے

مَآءً ثَجَّاجًا (۱۴) لِّنُخْرِجَ بِہٖ حَبًّا وَّ نَبَاتًا (۱۵) وَّ جَنّٰتٍ اَلْفَافًا (۱۶)

پانی کا ریلا تاکہ ھم نکالیں اُس سے اناج اور سبزہ اور باغ پتوں میں لپٹے ھوئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

سورۃ النبأ مکیۃ

کاشتکاروں کی ذہنیت کے مطابق قیامت کی حقیقت پر روشنی ڈالنے والی سورت ہے

آیت (۱) تا (۳) عم یتساءلون عن النبأ العظیم الذی ھم فیہ مختلفون ۔ انسانیت پر جو سب سے بڑا واقعہ آنے والا ہے وہ یہی ہے جس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ آیت (۴) تا (۵) کلا سیعلمون ۔ اس میں جھگڑنے کی بات ہی نہیں۔ یہ جلد ہی سمجھ لینگے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کو یہی مسئلہ اس صورت میں سمجھا دیتے ہیں ۔ آیت (۶) تا (۱۶) الم نجعل الارض مھاد الی قولہ تعالی و جنات الفافا۔ اس مقدمہ کو مد نظر رکھکر آگے بڑھیے۔ کہ ہم نے انسان کو زمین میں کاشت کیا ہے اور اس کے کاشت (بونے) کرنے کے لیے جس قدر سامان کی ضرورت تھی وہ ہم نے اسے بہم پہنچا دیا ہے۔ غرض ان آیات میں یعنی آیت (۱۶) تک انسان کی ضرورت کے واسطے تمام چیزیں بنائیں تاکہ انسان بڑھے پھلے پھولے۔ جب زمین پر انسان کی کاشت کر لی تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ان یوم الفصل الآیہ کہ ایک دن فصل کاٹنے کا دن آئیگا۔ تو آیت(۱۸) تا (۲۰) میں اس فصل یعنی غلہ اور بھوسا جدا کرنے کا تھوڑا سا خاکہ ہے اور آگے قیامت کا ذکر آجائیگا۔

آیت (۶) الم نجعل الارض مھاداً - ہم نے زمین کو وسیع بنایا تاکہ تم اس میں کھیتی باڑی کر سکو۔ اسی طرح انسان کو زمین میں کاشت کیا اور اس کے واسطے تمام سامان بہم پہنچا دئے۔ آیت (۷) والجبال اوتاداً - انسان کی زندگی پختہ قلعوں اور پختہ عمارتوں کی محتاج ہے۔ لڑنے بھڑنے میں انسان پہاڑوں سے سنگین عمارتیں بنا کر اپنے لیے محفوظ جگہ بنا لیتا ہے۔ یہی مطلب ہے پہاڑوں کے میخ بنانے کا۔ اگر خالی زمین ہی نرم نرم ہوتی تو یہ انسان کی ضرورتوں کے واسطے کافی نہ ہوتی۔ آیت (۸) و خلقناکم ازواجاً - یہ بیج بویا ہوا ہے۔ اور اس سے تم سے آگے نسل بڑھتی ہے۔

آیت (۹) وجعلنا نومکم سباتاً- نیند سے تکان دور ہو جاتی ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تم مسلسل کام کرتے رہو۔ اس واسطے تم کو تازہ دم کر کے وقفہ دیا تاکہ تم آگے پھر کام کر سکو۔

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ کَانَ مِیْقَاتًا (۱۷) یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا (۱۸)

بیشک دن فیصلے کا ہے ایک وقت ٹھہرا ہوا جس دن پھونکی جائے صور پھر تم چلے آؤ جٹ کے جٹ

وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَکَانَتْ اَبْوَابًا (۱۹) وَّ سُیِّرَتِ الْجِبَالُ فَکَانَتْ سَرَابًا (۲۰)

اور کھولا جائے آسمان تو ہوجائیں اس میں دروازے اور چلائے جائینگے پہاڑ تو ہوجائینگے چمکتا ریتا

اِنَّ جَهَنَّمَ کَانَتْ مِرْصَادًا (۲۱) لِّلطّٰغِیْنَ مَاٰبًا (۲۲) لّٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا (۲۳)

بیشک دوزخ ہے تاک میں شریروں کا ٹھکانا رہا کریں اس میں قرنوں

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۲۴) اِلَّا حَمِیْمًا وَّ غَسَّاقًا (۲۵) جَزَآءً

نہ چکھیں وہاں کچھ مزہ ٹھنڈک کا اور نہ پینا ملے کچھ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ بدلہ ہے

وِّ فَاقًا (۲۶) اِنَّهُمْ کَانُوْا لَا یَرْجُوْنَ حِسَابًا (۲۷) وَّ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کِذَّابًا (۲۸)

پورا ان کو توقع نہ تھی حساب کی اور جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو مکرا کر

وَ کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ کِتٰبًا (۲۹) فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِیْدَکُمْ اِلَّا عَذَابًا (۳۰) ع ۱

اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے لکھ کر اب چکھو کہ ہم نہ بڑھاتے جائینگے تم پر مگر عذاب

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ مَفَازًا (۳۱) حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًا (۳۲) وَّ کَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۳۳)

بیشک ڈر والوں کو انکی مراد ملنی ہے باغ ہیں اور انگور اور نوجوان عورتیں ایک عمر کی سب

وَّ کَاْسًا دِهَاقًا (۳۴) لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا وَّلَا کِذّٰبًا (۳۵) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّکَ

اور پیالے چھلکتے ہوئے نہ سنینگے وہاں بک بک اور نہ مکرانا بدلہ ہے تیرے رب کا

عَطَآءً حِسَابًا (۳۶) رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا یَمْلِکُوْنَ

دیا ہوا حساب سے جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ انکے بیچ میں ہے بڑی رحمت والا

آیت (۱۰) وجعلنا اللیل - انسان کی خاص ضرورتیں رات ہی کو پوری کی جاتی ہیں اور اس لیے اسے لوگوں سے علاحدگی ضروری ہے تا کہ ان سے ان کے کام ڈھکے رہیں.

آیت (۱۱) وجعلنا النهار: اور زندگی کا سامان جمع کرنے کیلیے دن کو۔

آیت (۱۲) وبنینا فوقکم۔ تمھارے اوپر سات سخت چیزیں بنائیں۔ یہ وہ سات آسمان ہیں جو اس زمین کے پہلے مرکز ہیں - پہلے وہاں چیزیں ہوتی ہیں اور پھر یہاں پر آتی ہیں۔ تو اصل مضبوط چیزیں وہاں (سات آسمان) ہی ہیں.

فلسفے کے سوچنے ہی کے دو مختلف طریقے ہیں (۱) ادنی سے شروع کرے۔ یہ ہے طبعی فلسفہ۔ طبعیات کے عالم اسی طرح سوچتے ہیں اور ان کی یہی ذہنیت ہے۔ (۲) اور دوسرا سوچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اوپر سے نیچے کی طرف سوچا جائے۔ سب سے اوپر جس چیز کو انسان سوچ سکتا ہے اس کا نام ہے "وجود"۔ اب اس ہستی میں جو سب سے پہلے غور کرنے بیٹھتے ہیں وہ الٰہیات کے عالم ہیں۔ وہ سب سے اوپر ایک قوی چیز مانتے ہیں - وجود سب سے قوی طاقت ہے۔ اس وجود کا مالک ایک ہے جسے "اللہ تعالیٰ" کہتے ہیں۔ پھر اس وجود سے نیچے اترنا شروع کرتے ہیں۔ وجود کا سب سے قوی حصہ روحانیات ہیں - اس سے دوم درجہ کی قوت کا مالک ہے عالم المثال جسے سمٰوات (آسمان) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرے درجہ کی چیز ہے اور تیسرے درجہ کی قوت کی چیز جسمانیات ہیں۔ پھر اسی طرح انسان سے بھی نیچے اترتے چلے جائیں اور اسی طرح سوچتے چلے جائیں۔ یہ الٰہیات کے حکماء کے سوچنے کا طریقہ ہے۔ الٰہیات کے طریقے میں خاص لوگوں کے سوائے عام لوگوں کو تجربہ اور مشاہدہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ عام لوگون کیلیے بھی کافی ہے کہ ان کا خیال درست کر دیا جائے۔ اس لیے اسے خیالی فلسفہ کہا جاتا ہے۔ مگر ابھی حکیم صرف وہی شخص کہلاتا ہے جو صاحب تجربہ اور صاحب مشاہدہ ہو۔ جس کا نمونہ مسلمانوں میں کامل صوفی ملتے ہیں۔ جب کسی انسان کو سوچنے کے یہ دو طریقے میسر آجائیں اور ان کی خیالات میں دونوں طرف سے مطابقت پائی جائے وہ انسان حقیقت میں حکیم کے لفظ کا صحیح مصداق ہے.

غرض اب واضح ہوگیا کہ دنیا میں دو قسم کے حکیم ہیں (۱) ایک حکیم طبعیات کے اور (۲) دوسرے الٰہیات کے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں - طبعیات کے حکیم ہر ایک چیز کو نیچے سے شروع کرتے ہیں اور اسے بتدریج ترقی دیتے ہوئے ایک حد کے بعد چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کے آگے قیاسات ہیں۔ جیسے زمین گردش کر رہی ہے وغیرہ۔ اس کے خلاف الٰہیات کے حکیم کی فلاسفی اوپر سے نیچے آتی ہے۔ وہ سب سے پہلے اس تمام کائنات عالم کو پیدا کرنے والی ایک ہستی مانتا

مِنْهُ خِطَابًا (٣٧) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ

قدرت نہیں کہ کوئی اس سے بات کرے جس دن کھڑی ہو روح اور فرشتے قطار باندھ کر کوئی نہیں بولتا مگر

اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا (٣٨) ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ

جس کو حکم دیا رحمٰن نے اور بولا بات ٹھیک وہ دن ہے برحق پھر جو کوئی چاہے بنا رکھے

اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (٣٩) اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ

اپنے رب کے پاس ٹھکانا ہم نے خبر سنادی تم کو ایک نزدیک آنیوالی کی جس دن دیکھ لیگا آدمی جو آگے بھیجا

يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِىْ كُنْتُ تُرٰبًا (٤٠) ع ٢

اسکے ہاتھوں نے اور کہیگا کافر کسی طرح میں مٹی ہوتا ۔

ہے۔ اس کے بعد اس کے متصل نورانی ہستی ماننا شروع کر دیتا ہے اور درجہ بدرجہ ماننا چلا آتا ہے حتیٰ کہ اس کثیف درجہ پر پہنچنے کے قابل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد نورانی جسم کی بحث شروع کرتے ہیں۔ پھر ظلماتی جسم کی اور یہاں آکر وہ طبعیات کے حکیم سے مل جاتا ہے۔ الٰہیات کے حکیم کی تعلیم انبیاء کی تعلیم کی طرف لے آتی ہے اور ان کے نصب العین (Ideal) کو اس قدر قریب کر دیتی ہے کہ انبیاء کی تعلیم بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ مگر طبعیات کا حکیم اپنی تعلیم کو انبیاء کی تعلیم کے نزدیک نہیں لا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک مادی قوت کو لیجیے۔ اس مادی قوت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس پر روحانی قوت سے نورانی اثر ڈالا جائے اور جو کام ایک عرصہ کے بعد ہوتا ہے اسے تھوڑے عرصے میں کر دیا جائے۔ مثلاً بچہ نو (۹) ماہ کے بعد ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ بچہ کی روح پر روحانی قوت سے اثر ڈالا جائے اور وہ قبل از وقت پوری نشو و نما حاصل کرے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ مادی چیز (بچہ) موجود ہو۔ خواہ ماں کے پیٹ کے اندر ہی موجود ہو۔ اسے روحانی قوت سے نشو و نما دی جا سکتی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا واقعہ ہے کہ آپ نے تھوڑے سے پانی سے بہت سے لوگوں کو سیراب کیا ہے اور پانی اپنی اصلی مقدار میں محفوظ رہا ہے۔

طبعیات کے حکیم تسلیم کرتے ہیں کہ سمندر سے پانی کے بخارات اٹھتے ہیں وہ ہوا میں موجود رہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت نے ہوا کی روح پر اثر کیا ہو اس واسطے پانی کے بخارات آپ کے ہاتھ کے ساتھ پانی میں شامل ہوتے رہے اور آپ نے اس طرح تھوڑے سے پانی کی مقدار سے لوگوں کو سیراب کیا۔ جب آپ نے پانی سے ہاتھ نکال لیا تو پانی کے بخارات کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس قدر عظیم الشان روحانی قوت تھی کہ آپ نور پر اپنا اثر ڈالتے اور پھر ہاتھ کو بغل میں ڈالتے آپکی روحانی قوت نور کو اپنے ہاتھ میں لے آتی اور وہ نور سے پُر دکھائی دیتی۔ اسی طرح عصائے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ آپ کی روحانی قوت عصاء کی روح پر اپنا اثر ڈالتی اور جب اس کے بعد اسے زمین پر مارتے وہ سانپ بن جاتا۔

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک آدمی ہے۔ اُس نے فطری طور پر دعا کی اُس کے دل میں فطری طور پر وہ قوت پیدا ہوتی ہے کہ اُس کی دعا سے بارش ہونے لگتی ہے۔ یہ دعا ہے۔ یہ دعا ہے انبیا کے نفوس قدسیہ کی۔ جب اُن کے قلب میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے تو اُنکی دعا سے وہ تاثیر پیدا ہونے لگتی ہے جو بعض دفعہ موسیقی کے مقتش کے گانے سے پیدا ہوتی تھی کہ بارش ہوگئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ لیجیے۔ اُن کا تمام کلام دیکھیے۔ آپ کو سب بھجن یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کے ترانے دکھلائی دینگے۔ ہمیں علم نہیں ہے کہ اُنہوں نے علم موسیقی کو سیکھا۔ ممکن ہے کہ اُنہوں نے سیکھا ہو اور جانتے ہوں۔ مگر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُنکے بھجن سے وہ حالت طاری ہو جاتی تھی جو اس فن کے مقتش سے پیدا ہوتی ہے۔

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ آپ ایک دفعہ اپنے دس بیس احباب کے ساتھ ترکستان سے جا رہے تھے۔ ایسا اتفاق ہوا کہ آپ کو ایک رات برفانی پہاڑ پر گزارنی پڑی۔ جہاں آگ کا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ اپنے احباب کے حلقے میں بیٹھے اور اپنی توجہ سے اسقدر گرمی پیدا کردی کہ تمام احباب گرمی کی تاثیر میں رہے اور صبح اٹھکر چلدیے۔

سبعاً شداداً :- کا مطلب ہے کہ وہ جسمانی طاقتوں سے زیادہ قوت کے مالک ہیں۔ طبعیات کے طریقہ پر سوچنے والا حکیم سماویات میں خیال کے سوائے کوئی اور چیز نہیں پاتا۔ مگر الٰہی حکیم اپنے تجربہ کی بنا پر اجسام کو ٹھوس چیز مانتے ہیں۔ اور اسکے مقابلہ میں یہ جسمانیات (جس میں ہم رہتے ہیں) ٹھوس جسم کی سطحیں ہیں۔

غرض آیت (۱۶) تک انسان کی ضرورت کے واسطے تمام چیزیں بتائیں۔ تاکہ انسان بڑھے، پھلے پھولے۔

آیت (۱۷) ان یوم الفصل کان :- اب جب زمین میں کاشت کریں تو اس کا لازمی نتیجہ ھے کہ ایک دن فصل کا آئیگا جس دن غلہ اور بھوسا جدا جدا کردیے جائینگے۔

آیت (۱۸ تا ۲۰) یوم ینفخ :- اس فصل کا تھوڑا سا خاکہ ہے اور آگے قیامت کا ذکر آجائیگا۔

آیت (۱۸) فتاتون افواجاً :- فصل کا دن شروع ہوگا اور انسان گروہ گروہ ہوکر وہاں آئینگے۔

آیت (۱۹) و فتحت السماء :- اور دروازے (آسمان کے) کھول دیے جائینگے اور ہر ایک آدمی اس میں سے گذر جائیگا۔

آیت (۲۰) و سیرت الجبال :- یہاں کی زندگی اب پوری ہوگئی تو اسکے بعد اس دنیا کے تمام سازوسامان درہم برہم ہوجائینگے۔

آیت (۲۱ تا ۳۰) ان جہنم کانت :- اب انسان کے دو حصہ کردیے جائینگے. ایک غلہ اور دوسرا بھوسا۔ بھوسے کی قسم کے لوگوں کا نام ہے طاغین یعنی حد سے گذرنے والے لوگ۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ یعنی ظالم لوگ۔

آیت (۳۱ تا ۳۵) ان للمتقین مفازا :- متقی لوگوں کا بیان ہے۔ یعنی عدالت اور احسان کرنے والے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے معنی إن الله یأمرکم بالعدل ہیں۔

آیت (۳۶) جزاءً من ربك :- یہ جزا جو دی گئی ہے یہ ایک حساب کے ماتحت ہے۔ غرض انکے کاموں کا جو بدلہ دیا جا رہا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔

آیت (۳۷) رب السموات والارض الایہ :- اللہ تعالیٰ کا ہر ایک حکم ماننا پڑیگا۔ غرض اعمال کے نتائج لازمی ہیں انمیں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اب یہ تو حکمت کی بات ہے کہ جو اعمال کا نتیجہ ہوگا اسمیں تبدیلی نہیں ہوگی مگر شرائع العلیہ میں بتلایا جاتا ہے کہ بعض لوگوں کی شفاعت ہوگی اور یہ اس قاعدہ سے ایک استثنا کی شکل میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اس سے فقہا اور حکماء میں خوب جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ شفاعت بھی انسان کے بعض اعمال کا نتیجہ ہوگی۔ ہر شخص کے لیے شفاعت نہیں ہے۔ اس لیے حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں۔ بعض اعمال کا حساب اول ہوتا ہے کیونکہ وہ اول دفتر میں ثبت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایسے اعمال ہیں جو خصوصی دفتر میں محفوظ ہیں۔ ان کا حساب بعد میں ہوتا ہے تو اس دوسرے حساب سے پہلے حساب پر اثر پڑتا ہے۔ لوگوں کو کم فہمی کی وجہ سے یہ اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف کی بنا ہی نہیں۔ اعمال کی سزا ایک قاعدہ کے مطابق لازمی ہے اور اسمیں کبھی تخفیف نہیں ہوتی یعنی سبب کے موجود

ہونے سے مسبب پیدا نہ ہو اور علت سے معلول متولد نہ ہو۔ یہ ہے تخفف تو یہاں تو شفاعت بھی ان کے دوسرے اعمال کا نتیجہ ہے وہ اگرچہ ابتدا میں ظاہر نہ ہو۔ دوسری جلد تفسیر میں مسئلۂ شفاعت کا بسط سے ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃالنمل میں دیکھو۔

آیت (۳۸) **یوم یقوم الروح** :- اب حکمت الٰہی میں جو قیامت کا سبب بتایا جاتا ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ انسانوں کی روحیں جس قدر بھی ہیں وہ ایک بڑی روح سے نکلی ہوئی ہیں۔ اور وہ بڑی روح ایک انسان کی شکل میں ہے۔ اس بڑی روح کی خدمت کرنے والوں کا نام ملائکہ ہے۔ آفتاب کی شعاع آفتاب سے نکل کر زمین کو روشن کرتی ہے اور اس کے بعد پھر آفتاب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اسی طرح تمام جزوی (شخصی) روحوں کے واپس جانے کی کیفیت ہے۔ یہ روحیں اس بڑی روح سے نکل کر دنیا میں آتی ہیں اور اپنا کام کرکے پھر اس بڑی روح میں مل جاتی ہیں۔ فلسفۂ الٰہیات کا یہ مرکزی نقطہ ہے کہ تمام انسانی روحیں اور ملائکہ ایک معین ہستی کا ایک جزو بن جاتی ہیں۔ اور اس بڑی ہستی (روح اعظم) کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس آئینہ میں وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہیں اور اسی پردہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کی بات سنائی دیتی ہے۔ قیامت کے واقعے سے درحقیقت مدعا یہ ہے کہ انسانی روحیں وہاں تک پہنچ جائیں اور اس کے واسطے قیامت کا واقعہ ایک درمیانی حادثہ ہے۔ روحانی قوتوں کا اس مرکز سے انتشار (پھیلنا) خاص قواعد کے ماتحت مدت سے جاری ہے۔ پھر یہ جو روحانی قوت اپنے کام سے فارغ ہوتی ہے اسے اپنے مرکز میں واپس جانا ہوتا ہے۔ ان کی واپسی کے بھی خاص قواعد ہیں جن کے ذریعہ وہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بنتی جاتی ہیں۔ پھر یہ تمام جماعتیں ایک ہوجائیں گی اور اس روح اعظم سے ان کا اتصال ہوجائیگا۔ یہ روحانیت کا ایک دورہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق ایک دن کھلنا چاہیے۔ اس تمام دورے میں اللہ تعالیٰ کا ایک خاص قسم کا جلال، جمال اور کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اس خصوصیت کے لحاظ سے اسے شان الٰہی کہا جاتا ہے۔ اور اس تمام زمانہ سے روحانیت کا پھیلاؤ شروع ہوا، اور جبتک کہ یہ تمام پھیلاؤ ظاہر نہ ہو جائے اسے شان الٰہی کے ایک دن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس جگہ ایک نازک مسئلہ ہے جس پر الٰہی حکماء ہمیشہ توجہ دلاتے چلے آتے ہیں۔ اس کی طرف اب توجہ دلانی منظور ہے۔ اس خاص دورے میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں وہ خواہ بڑی ہوں خواہ چھوٹی اگر اس دورے کے تمام احکام کا خیال رکھا جائے تو اس موقع پر وہ اس سے بڑھکر کوئی زیادہ اچھی چیز بن ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً اس دورے کے کروڑوں حصوں میں ایک چھوٹی سی جماعت انسانوں کی پیدا کی گئی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس چھوٹی سی جماعت سے بڑھکر کوئی اور بہتر جماعت اس موقع

پر پیدا ہو سکتی تھی ؟ حکماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ اس سے بہتر پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انہی لوگوں میں سے ہیں۔ غرض اسکا یہ مطلب ہے کہ اگر اس دورے کے تمام نظام کو مد نظر رکھ کر سوچا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ نہ تو اس سے بہتر انسان پیدا ہو سکتا تھا اور نہ اس سے کم درجہ کا انسان پیدا ہوسکتا تھا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس تمام دورے کے اثر سے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ علیحدہ علیحدہ کچھ چیز نہیں ہیں۔ اگر ان میں تبدیلی کی جائے تو اسکا اثر تمام نظام پر پڑتا ہے۔ اور تمام نظام کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور کوئی عقلمند انسان اسے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب یہ جملہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اس سے بڑھکر اور کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ تو علماء کا ایک ایسا طبقہ ہے جو کہ اس جملہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ اس سے بہتر چیز پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ اس سے بہتر چیز پیدا کر سکتا ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ان علماء کی نظر اس دور کے نظام میں مقید نہیں ہے (یعنی نظام الٰہی کے مطابق جو کام ہو رہا ہے کہ تمام دنیا ایک سلسلہ میں منسلک ہے اس کے متعلق سوچتے ہی نہیں بلکہ وہ اس شان الٰہی پر نظر رکھتے ہیں جس کا یہ تمام کرشمہ ہے۔ یعنی انسانی پیدائش وغیرہ)۔ اس لیے ان لوگوں کے فیصلہ میں تعارض نہیں ماننا چاہئیے۔ بلکہ ہر ایک کی بات علیحدہ علیحدہ نقطۂ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا احیاءالعلوم میں ایک مشہور فقرہ ہے:- لیس فی الامکان ابدع مما کان یعنی جو کچھ پیدا کیا گیا ہے اس سے بہتر پیدا کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ یہ تو اس دور کے احکام کو ملحوظ رکھ کر کہا جا سکتا ہے۔

دوسری جماعت نے امام غزالی کی تردید میں تشنیع تک نوبت پہنچا دی۔ انکا نقطۂ نظر اس خاص دور کے احکام نہیں بلکہ عموم قدرت الٰہیہ، جس کا کرشمہ یہ تمام دور ہے۔ تو ہر ایک جماعت کا نقطۂ نظر علیحدہ علیحدہ ہوا۔

اسی طرح یہ جھگڑا ختم کیا جا سکتا ہے۔ جس نے اہل نظر کو پریشان کر رکھا ہے۔

یوم یقوم الروح والملائکۃ صفاً:- وہ دن ہوگا جس دن بڑی روح اور اس کے خدمتگار ملائکہ ایک صف میں کھڑی ہوں گے۔ بعض روایتوں میں اس کی یہ تعبیر آئی ہے کہ اس کے بیحد سر اور منہ ہوتے ہیں۔ اب انسانی روحیں جب روح اعظم کے پاس جاتی ہیں تو یہ اپنی تھوڑی تھوڑی سی مختلف ذہنیت لیکر جاتی ہیں اور یہی وہ سر اور منہ ہیں جنکے متعلق کہا گیا ہے کہ اس بڑی روح کے بہت سے سر ہیں اور منہ ہیں۔

اسی طرح روحیں اس روح اعظم سے نکل کر اور اپنا کام پورا کر کے پھر واپس اُس سے جا ملتی ہیں۔

لا یتکلمون اِلّا من اذن له الرحمٰن و قال صواباً :- اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کشش ارادی نہیں ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے حرکت کر رہا ہے۔ وہ طبعی کشش ہے کہ وہ اپنی شاخوں کو مرکز سے لپیٹتا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں ہے۔ روحوں کا اس روح اعظم میں پہنچ جانا یہ ہے قیامت۔

ذالک الیوم الحق :- روحوں کا اس روح اعظم تک پہنچ جانا درحقیقت قیامت ہی کا دن ہے۔ اس کے بعد جو زندگی ہوگی اس کے متعلق یہاں حساب نہیں ہوتا۔ پھر اللہ کے ساتھ انسان کا تعلق ہوگا اور اس کی تفصیل یہاں نہیں بتلائی جا سکتی (آیت (۴۰) میں اسکی تفصیل دیکھو)

فمن شاء اتخذ الیٰ ربه مآباً :- جب روح اعظم تک کوئی روح انسانی پہنچ جائے تو پھر اس کو اپنے رب کا راستہ صاف نظر آئیگا۔ جس کا جی چاہے چلے۔ یعنی انسان کا جب روح اکبر سے اتصال ہو گیا تو اس کے بعد انسان اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ہوتا ہے۔ تو اب جس کا جی چاہے اس طرف آئے۔

انا انذرنا کم عذاباً قریباً :- عذاب نزدیک آنے والے سے تم کو ڈرایا۔ کیونکہ انسان کی موت کے بعد یہ دور شروع ہو جاتا ہے۔ اس واسطے اسے انسان کے نزدیک بتلایا گیا ہے۔

و یقول الکافر یا لیتنی کنت تراباً :- کافر کہتا ہے کہ کاش میں انسان ہی نہ ہوتا بلکہ مٹی ہوتا۔ اس جگہ اس کے سامنے تمام حقیقت آ رہی ہے اور کسی پر ذرہ ظلم نہیں ہوتا۔

دنیا میں انسانی نظام قائم کرنے کے لیے حکومت بنانا ضروری ہے اور ایک حقیقت جو مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے اس کے زبان اور ہوتی ہے اور وہی حقیقت اگر حکومت کی زبان سے سمجھائی جائے تو اس کے شکل بدل جاتی ہے۔ بعض انسانوں کو حکومت کی زبان سے بات سننا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ حکومت کا لہجہ سخت ہوتا ہے اُن کو یہ باتیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً جب کہا جائے دیکھو اگر تم نے چوری کی تو تمہارا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ تو حکومت کی زبان و لہجہ سے تو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ مگر جو کچھ کہا گیا ہے وہ حقیقت کا اظہار تھا۔ مدرسہ میں وہی بات پڑھی تھی اُس کو ناگوار معلوم نہ ہوئی اور حاکم سے سنی تو وہ ناگوار معلوم ہوئی۔ یعنی جب اُس نے چوری کی تو حاکم نے حکم دیا کہ اسکا ہاتھ کاٹ دو۔ تو اب اس کو ناگوار معلوم ہوا کہ یہ سخت لہجہ میں تھا۔ حالانکہ

حقیقت میں یہ اس کے عمل کی حقیقت کا اظہار ہورہا ہے۔ جیسے ایک شخص نے زہر کھا لیا اور اس کا لازمی نتیجہ ظاہر ہونے لگا تو اسکو اب نفرت آنے لگی ہے حالانکہ اب زہر کی حقیقت منکشف ہو رہی ہے۔ جب وہ اعمال مخالف انسانیت کے کرتا رہا ہے تو اس کو نا گوار معلوم نہ ہوا۔ اور جب اسکے نتیجہ کا وقت آیا اور حاکم نے کہا کہ اس کی یہ سزا ہے اسکو جیل خانہ میں لیجاؤ تو اسکو اب ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ نتیجہ لازمی تھا۔ اب فقط حقیقت کا اظہار حاکم کی زبان سے ہوا ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سِتٌّ وَّ اَرْبَعُوْنَ آيَةً وَّ فِيْهَا رُكُوْعَانِ

سورہ نازعات مکہ میں نازل ہوئی اس کی چھیالیس آیتیں ہیں اور دو رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا (۱) وَّ النّٰشِطٰتِ نَشْطًا (۲) وَّ السّٰبِحٰتِ سَبْحًا (۳) فَالسّٰبِقٰتِ

قسم ہے گھسیٹ لانیوالوں کی غوطہ لگا کر، اور بند چھڑا دینے والونکی کھولکر، اور پیرنے والونکی تیزی سے، پھر

سَبْقًا (۴) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۵) يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (۶) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ (۷)

آگے بڑھنے والونکی دوڑ کر، پھر کام بنانے والونکی حکم سے، جس دن کانپنے کانپنے والی اسکے پیچھے آئے دوسری

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ (۸) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۹) يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ

کتنے دل اس دن دھڑکتے ہیں، آنکی آنکھیں جھک رہی ہیں، لوگ کہتے ہیں کیا ہم پھر آئینگے

وقف لازم وقف لازم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ النازعات مکیۃ

پچھلی سورت کی آیت (۳۸) میں روح اعظم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس روح اعظم کے واسطہ سے قدرت الٰہی مختلف نظام پیدا کرتی ہے اور پھر ان کو اپنی طرف جذب کرتی ہے۔ اس قسم کے نظام میں چھوٹے بڑے واقعات تقسیم ہوتے ہیں اگر ایک چھوٹا سا واقعہ سمجھادیا جائے تو اس سے بڑے واقعہ کا سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ اب اس سورت میں قیامت کا مسئلہ اس طرح پر حل کیا جائے گا۔ اس لیے اسے آیت (۱۵) سے شروع کیا جاتا ہے۔

(آیات (۱ تا ۱۴) تک کو بعد آیات (۴۲) دیکھو)

آیت (۱۵) هل اتاك حديث موسىٰ الآیۃ:۔ مصر میں ایک بادشاہ ہے اور وہ اپنی رعیت پر ایک خاص طرح پر ظلم کرتا ہے۔ یہ ظلم طبیعی قواعد یعنی قانون کے اندر پیدا ہوتا ہے مادی استعداد ایسی پیدا ہوتی جاتی ہے کہ زمین پر ایک ظالمانہ نقشہ اور نمونہ بن جاتا ہے۔ اب رحمت الٰہی کی شان اس ظلم میں تبدیل کرکے اسے دوست کرنا چاہتی ہے تو اس میں ایک جذب کی قوت پیدا کی جائیگی۔ اگر یہ اس جذبہ میں ٹھیک چیز بن گئی تو دنیا میں رہ سکے گی ورنہ ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس واقعہ کا آیت (۱۵) سے لے کر آیت (۲۶) میں ذکر کیا گیا ہے

آیت (۱۸ و ۱۹) فقل هل لك الىٰ ان تزكىٰ: کیا تجھے شوق ہے کہ تو پاک ہوجائے یعنی تمہاری تمام بداخلاقیاں دور ہوجائیں اور تو ایک مقدس آدمی بن جائے تو میری طرف التفات کرے، تجھے اس بات کا علم دوں گا اور تو اس کو سمجھنے لگ جائے اور پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگ جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے لگ جائے۔

آیت (۲۲) ثم ادبر يسعىٰ: اس نے موسیٰ (عبداللہ) کے مخالف کوشش کرنی شروع کردی۔

آیت (۲۴) فقال انا ربكم الاعلىٰ:۔ سیدنا موسیٰ (عبداللہ) دعوت دیتے ہیں کہ تم ایک بڑے حاکم (اللہ عزاسمہ) کی اطاعت کرو اور اس کے احکام کی پیروی کرو مگر فرعون کہتا ہے کہ سیدنا موسیٰ (عبداللہ) جھوٹے ہیں تم کو میری اطاعت کرنی چاہیے کیونکہ میں تمہارا بڑا حاکم ہوں اور میرے سوا یہاں کوئی حاکم نہیں۔ میں نے

فِی الْحَافِرَةِ (۱۰) ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (۱۱) قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ

الٹے پاؤں، کیا جب ہم ہو چکیں ہڈیاں کھوکھری، بولے تو یہ پھر آنا ہے

خَاسِرَةٌ (۱۲) فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ (۱۳) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۱۴) هَلْ اَتٰكَ وقف لازم

ٹوٹے کا، سو وہ تو صرف ایک جھڑکی ہے، پھر کبھی وہ آرہیں میدان میں، کیا پہنچی ہے تجھکو

حَدِیْثُ مُوْسٰی (۱۵) اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی (۱۶) اِذْهَبْ اِلٰی وقف لازم

بات موسیٰ کی۔ جب پکارا اس کو اسکے رب نے میدان پاک میں جسکا نام طویٰ ہے، جا

فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی (۱۷) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰی اَنْ تَزَكّٰی (۱۸) وَ اَهْدِیَكَ اِلٰی

فرعون کے پاس اس نے سر اٹھایا ہے پھر کہہ، تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتلاؤں تجھکو تیرے

رَبِّكَ فَتَخْشٰی (۱۹) فَاَرٰىهُ الْاٰیَةَ الْكُبْرٰی (۲۰) فَكَذَّبَ وَ عَصٰی (۲۱) ثُمَّ

رب کی طرف پھر تجھکو ڈر ہو، پھر دکھلائی اسکو وہ بڑی نشانی، پھر جھٹلایا اس نے اور نہ مانا،

اَدْبَرَ یَسْعٰی (۲۲) فَحَشَرَ فَنَادٰی (۲۳) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (۲۴) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ

پھر چلا پیٹھ پھیر کر تلاش کرتا ہوا، پھر سبکو جمع کیا پھر پکارا تو کہا میں ہوں رب تمہارا سب سے اوپر پھر پکڑا

نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰی (۲۵) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی (۲۶) ءَ اَنْتُمْ ع ۵

اسکو اللہ نے سزا میں آخرت کی اور دنیا کی، بیشک اسمیں سوچنے کی جگہ ہے جسکے دل میں ڈر ہے۔ کیا تمہارا

اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا (۲۷) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا (۲۸) وَ اَغْطَشَ لَیْلَهَا

بنانا مشکل ہے یا آسمان کا اسنے اسکو بنالیا، اونچا کیا اسکا ابھار پھر اسکو برابر کیا اور اندھیری کی رات اسکی

وَ اَخْرَجَ ضُحٰهَا (۲۹) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (۳۰) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا

اور کھول نکالی اسکی دھوپ اور زمین کو اسکے پیچھے صاف بچھا دیا، باہر نکالا زمین سے اسکا پانی

جو سلطنت کے احکام بنائے ہیں اسکی تابعداری کرنی تم پر واجب ہے ۔ یہاں نفی حکومت کی کررہا ہے یعنی دوسرے کی حکومت نہیں ہے ۔

آیت (۲۵) فاخذہ اللہ نکال الاخرۃ والاولیٰ :۔ دونوں گناہوں کے عوض اللہ تعالیٰ نے اسکو خوب پکڑا ۔ ایک گناہ وہ تھے جو اس نے موسی علیہ السلام کے آنے سے قبل کیے تھے اور ایک گناہ وہ تھے جو موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد کیے تھے ۔ ان کی سزا میں فرعون کو پکڑا اور اس کے نظام کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ۔

آیت (۲۶) ان فی ذالک لعبرۃ لمن یخشیٰ :۔ جو عواقب سے ڈرتے ہیں ان کے لیے عبرت اور یاد دھانی ہے اور کافی نصیحت ہے ۔ جو لوگ عالم ہیں انہیں ان واقعات کے نتائج سے ڈر معلوم ہوتا ہے ۔ ان کے لیے ان آیات میں بہت سے عبرت آمیز واقعات ہیں ۔ وہ اس طرح قیاس کر سکتے ہیں کہ اس طرح کا ظلم دنیا میں کبھی چھپایا نہیں جا سکتا ۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے اسے اصلاح کرنے کا حکم دیا جائےگا ۔ نظام کی نوعیت ایک یہی ہے کہ جیسے فرعون کو غرق کردیا گیا اسی طرح وہ دنیا کو غرق کر سکتا ہے ۔

آیت (۲۷ تا ۳۳) ءانتم اشد خلقا ام السماء بناھا :۔ انسانیت اور اس عالم کو جو آپس میں ربط ہے ان آیات میں اسکا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو آسمان بنایا اور اسے بلند کیا ۔ دن اور رات بنائے اور چراگاہ وغیرہ بنائے ۔

آیت (۳۳) متاعا لکم ولانعام :۔ یہ تمام سامان تمہارے اور تمہارے چوپایوں کی روزی کا ذریعہ ہیں ۔ یہ چیزیں اسی طریقہ سے بنائے گئے ہیں کہ تم ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہو ۔

آیت (۳۴) فاذا جاءت الطامۃ الکبریٰ :۔ کوئی چیز دنیا میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے جبتک یہ نظام قائم ہے اسکو فنا نہیں کرتا ۔ محض صورت کی تبدیلی ہوتی ہے ۔ مثلاً ایک شخص مالدار تھا اور اس کے بیٹے جو نالائق تھے انہوں نے تمام جائداد تباہ کرڈالی ۔ تو وہ تمام دولت فنا نہیں ہوئی مگر وہ قوم میں تقسیم ہوگئی ۔ جو چیز ایک شخص کے ھاتھ میں تھی وہ تقسیم ہوکر قوم کے حصہ رسدی میں آگئی ہے اسی طرح جب کہاجاتا ہے کہ فلاں قوم تباہ برباد ہوگئی اور اسکی قوت زائل ہوگئی تو اسکے معنی بھی وہی ہوتے ہیں ۔ یعنی جو قوت اور طاقت اور ذہنیت اور لیاقت ان کے اعلیٰ طبقہ میں تھی ۔ ان سے نکل کر ادنی طبقہ میں آگئی ۔ یعنی اعلیٰ اور اوسط طبقہ جس قوت کا مالک تھا ان کی نالائقی کے باعث ان سے نکل کر وہ ادنی طبقہ میں آجاتی ہے ۔ پہلے وہ قوت اور طاقت اعلیٰ طبقہ میں تھی جو بہت نمایاں تھی ۔ اب نچلے طبقہ میں جاکر بیٹھ گئی ہے یعنی تہ نشین ہوگئی ہے ۔ اس لیے وہ قوت اور

وَ مَرۡعٰهَا (۳۱) وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰهَا (۳۲) مَتَاعًا لَّكُمۡ وَ لِاَنۡعَامِكُمۡ (۳۳) فَاِذَا جَآءَتِ

اور چارہ اور پہاڑوں کو قائم کردیا کام چلانے کو تمہارے اور چوپایوں کے، پھر جب آئے وہ

الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى (۳۴) يَوۡمَ يَتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ مَا سَعٰى (۳۵) وَ بُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ

ہنگامہ بڑا جس دن کہ یاد کرے گا آدمی جو اس نے کمایا اور نکال ظاہر کردیں دوزخ کو

لِمَنۡ يَّرٰى (۳۶) فَاَمَّا مَنۡ طَغٰى (۳۷) وَ اٰثَرَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا (۳۸) فَاِنَّ الۡجَحِيۡمَ

جو چاہے دیکھے سو جس نے کی ہو شرارت اور بہتر سمجھا دنیا کا جینا سو دوزخ ہی ہے

هِيَ الۡمَاۡوٰى (۳۹) وَ اَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى (۴۰)

اسکا ٹھکانا اور جو کوئی ڈرا ہو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے اور روکا ہو اسنے جی کو خواہش سے

فَاِنَّ الۡجَنَّةَ هِيَ الۡمَاۡوٰى (۴۱) يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰهَا (۴۲) فِيۡمَ

سو بہشت ہی ہے اس کا ٹھکانا تجھ سے پوچھتے ہیں وہ گھڑی کب ہوگا قیام اس کا تجھکو

اَنۡتَ مِنۡ ذِكۡرٰٮهَا (۴۳) اِلٰى رَبِّكَ مُنۡتَهٰٮهَا (۴۴) اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ يَّخۡشٰٮهَا (۴۵)

کیا کام اس کے ذکر سے تیرے رب کی طرف ہے پہنچ اس کی تو تو ڈر سنانے کے واسطے ہے اسکو جو اس سے ڈرتا ہے

كَاَنَّهُمۡ يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحٰٮهَا (۴۶) ع ۲

ایسا لگے گا جسدن دیکھیں گے اسکو کہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں مگر ایک شام یا صبح اسکی

طاقت نظر نہیں آتی مگر موجود ویسی ہی ہے - اس کی حقیقت وہ لوگ جانتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مردہ اقوام کے زندہ کرنے کو پیدا کرتا ہے - ان کو آج کل کی اصطلاح میں انقلابی جماعت کہتے ہیں - وہ کایا پلٹ دیتے ہیں - اور اعلیٰ ذہنیت اور قوم اور طاقت جو ادنی طبقہ میں جاکر تہ نشیں ہوگئی تھی اسکو منصۂ شہود پر لاتے ہیں

اور انبیاء علیہم السلام سب کے سب انقلابی ہوتے ہیں ۔ ان کا مطمح نظر ادنی طبقہ ہوتا ہے ۔ بعد از آن اوسط طبقہ ۔ مگر جو اعلیٰ طبقہ یعنی سرمایہ دار ہے اس طبقہ سے یہ قوت زائل ہو کر رہ گئی ۔ انبیاء کا روئے سخن ان کی طرف نہیں ہوتا ۔ ان کے لیے فقط انداز ہوتا ہے ادنی طبقہ میں اعلیٰ ذہنیت اور قوت موجود ہوتی ہے کیونکہ ان کو سوچنے کی عادت ہوتی ہے ۔ اور سوچنے کے باعث ان میں ذہنیت اچھی پیدا ہوجاتی ہے ۔ تو اب ایک نبی کا یہی کام ہوتا ہے کہ اس طاقت کو جو نیچے طبقے میں آکر تہ نشین ہوچکی ہے اس کو ظاہر کردے ۔ اور اس میں اسکو بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور بڑا زور لگانا پڑتا ہے ۔ اس کے بعد جتنی رکاوٹیں پیش آئیں ان کو دور کردے ۔ اسکے بعد جس طرح سمندر میں تیرا کرتے ہیں وہ طبقہ اسی طرح ترقی کے میدان میں تیرنا شروع کردیتا ہے اور اسی باعث وہ سب سے آگے بڑھ جاتا ہے اور سبقت لے جاتا ہے ۔ اور اسی سبب وہ مالک تدبیرات ہوجاتا ہے ۔ مثلاً قریش کا اعلیٰ طبقہ کہ اس سے طاقت ، قوت اور اعلیٰ ذہنیت نکل کر ادنیٰ طبقہ میں آگئی تھی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اس ادنی طبقہ کو کھینچ کر اوپر لانا چاہتے ہیں ۔ اعلیٰ طبقہ قریش کا جو مکہ میں اقتدار رکھتا تھا وہ کہتا ہے کہ ہم آپ کو ایسا کرنے نہیں دیتے ۔ یہ ہمارا ملک ہے اس میں ہماری تدبیرات چلتی رہیں گی ۔ دوسری تعلیم و تربیت ہم نہیں دینے دیتے ۔ تو یہ خدائی دعویٰ ہے جیسے فرعون نے خدائی دعویٰ کیا تھا ۔ تو اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ تم کو فرعون کے غرق ہونے سے عبرت حاصل کرنی چاہیے ۔ اور یہ کہ تم آسمان اور زمین سے زیادہ سخت چیز نہیں ہو ۔ آسمان اور زمین بھی ہماری مرضی اور تدبیر سے چل رہے ہیں ۔ ان میں روزانہ انقلاب آتا ہے ۔ اس سے عبرت لو ۔ اسی طرح قیامت آنے سے قبل بھی انسان اور حیوان کی استعدادات ختم ہو جائیں گی ۔ تو اس وقت بھی وہ استعدادات مکنون ہوجائیں گی اس لیے انقلاب کیا جائے گا ۔ پھر تمام مخفیہ ظاہر ہونے لگ جائیں گے تو دنیاوی انقلاب سے استدلال ہے قیامت کے انقلاب پر کہ یہ انقلاب جو تمہارے شہر مکہ میں ہو رہا ہے اس پر غور کرو تو نقشۂ قیامت تمہارے پیش آجائے گا ۔ انقلاب میں ایک قیامت برپا ہوتی ہے بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں ۔ اور تمام قوم پر (جب قوم میں انقلاب ہو) بربادی ، افلاس اور دہشت چھا جاتی ہے ۔ جب انقلاب درجۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو پھر تعمیر شروع ہوتی ہے ۔ اور ہر طرح کی آسودگی ادنی طبقہ کو حاصل ہوتی ہے ۔ مظلوم طبقہ جو امیروں کے ظلم کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا وہ پھر برسرِ اقتدار آجاتا ہے ۔ اور وہی مالکِ تدبیرات و سلطنت ہو جاتا ہے ۔

(اب آیات کا ترجمہ شروع کرتے ہیں)

آیت (۱) **و النازعات غرقاً** : وہ جماعت گواہ ہے جو استعدادِ کا منہ کو جو

تہ نشین ہوگئی تھی اور ادنیٰ طبقہ میں بیٹھ گئی تھی غوطہ لگا کر اس کو کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔

آیت (۲) و النّاشطات نشطاً: راہ ترقی میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو وہ جماعت دور کرتی ہے یعنی جو آدمی کی ترقی کے لیے سدراہ ہیں ان کو بھی راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ (یہ دو درجے انقلاب میں تخریب کے ہیں)

آیت (۳) و السابحات سبحاً: تو پھر وہ جماعت آسانی سے چلنا شروع کردیتی ہے اور ترقی کے سمندر پر تیرنا شروع کردیتی ہے۔

آیت (۴) و السابقات سبقاً: پھر تو یہ جماعت سب سے آگے بڑھ جاتی ہے۔

فالمدبرات أمراً:۔ پھر تو یہ جماعت مدبرات امر بن جاتی ہے اور امر و حکم کی تدبیر کرنے والی یہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے امر کے مطابق کام کرتی ہے۔

یہ تین درجے تعمیر کے بنے ۔ عام مفسرین جو انبیاء کی حقیقت کو نہیں جانتے ان کو ایسی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ حالانکہ انبیاء انقلابی ہوتے ہیں اور اس انقلاب سے لوگوں کو ڈراتے ہیں۔

یہ سب جماعتیں گواہ ہیں کہ بڑا انقلاب قیامت والا ہونے والا ہے اور جواب قسم ہے یوم ترجف الرجفہ" یعنی ضرور قیامت ہونے والی ہے۔ یہ محذوف ہے۔

اِن فی ذالک لعبرۃ لمن یخشیٰ:۔ یعنی وہ لوگ جن کو اپنے کام کی بربادی کا ڈر لگا رہتا ہے وہ ان سے نصیحت لیتے ہیں۔ فرعون جیسا مستبد حاکم انقلاب کو نہ روک سکا تو پھر قریش کی کیا طاقت ہے کہ انقلاب کو روکے۔

یوم ترجف الراجفة:۔ یعنی ایک جھٹکے سے زیر و زبر ہو جائیں گے اور تباہی پھیل جائے گی۔

ءَاَنتم اَشد خلقاً:۔ اس میں روزانہ انقلاب ہو رہے ہیں جس سے یہ لوگ اور ان کے چار پایہ مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ عبرت پذیر نہیں ہوتے۔ یہ زمین و آسمان انقلاب ہی انقلاب ہے۔ تو ایک فرعون کی مثال اور دوسری زمین و آسمان کی مثال دے کر ان کو سمجھایا گیا کہ جو اصلح للبقاء ہے وہ قائم رہتی ہے اور دوسری چیزیں انقلاب کے وقت تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ اور پھر نئے سرے سے اور طرح کی تعمیر کی جاتی ہے۔ جس سے مظلوم طبقہ مستفید ہو سکے۔ اور انقلاب کا بڑا سبب ظلم ہوتا ہے جس سے مخفی قوت ظاہر ہو جاتی ہے اور ظالم لوگ عوام کی طاقت کو دباتے ہیں ہیں۔ اور وہ طاقت دبتے دبتے جب ایک جگہ اکٹھی ہو جاتی ہے تو ایک دم اوپر کو پھٹ کر نکل پڑتی ہے۔ جیسے پانی اور گھاس جو زمین سے باہر نکل پڑتے ہیں۔ اب چونکہ اس مخفی قوت کو تربیت دینے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے

ہیں اس لیے وہ قوت ظاہر ہو کر رہی۔ اس انقلاب سے تم کو بھی فائدہ ہوگا اور تمھارے خدام جو جانوروں کی طرح تھے ان کو بھی فائدہ ہوگا۔ فقط ظالم طبقہ برباد ہو جائے گا جو سرمایہ داری کے باعث نعرہ انا ربکم الاعلیٰ، فرعون کی طرح مار رہا ہے۔

یہ سورت مضمون قیامت سمجھانے کے لیے اتری ہے تا کہ الٰہی حکماء اس سے قیامت کے مضمون کو سمجھ جائیں۔ یہ بات الٰہی حکماء کے یہاں ثابت ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دو نام یعنی صفات یہ بھی ہیں کہ وہ الباطن بھی ہے اور الظاہر بھی۔ الٰہی حکماء اس کو باطن الوجود اور ظاہرالوجود سے تعبیر کرتے ہیں۔ جتنی روحانی صورتیں ہیں وہ باطن الوجود ہیں۔ اور جتنی مادی اشیاء ہیں وہ ظاہر الوجود کے ٹکڑے ہیں۔ روحیں اور صورتیں باطن الوجود کے ٹکڑے ہیں۔ تو جب مادے میں استعداد پیدا ہوجاتی ہے تب اس کے موافق باطن الوجود سے ایک ٹکڑا نازل ہوجاتا ہے اور ان کو آپس میں ربط دینے والی صفت کا نام اگر وہ جبروتی رکھتے ہیں تو مادہ چونکہ ظاہرالوجود سے آیا تھا اور ظاہر الوجود بھی صفات قدیمہ سے ہے اور باطن الوجود سے روحیں اور صورتوں کے ٹکڑے آتے رہتے ہیں۔ اس لیے وہ بھی قدیم ہے۔ اس سے اوپر وجود ہے۔ چنانچہ یہ تو دونوں جب قدیم ہوئے تو فنا نہیں ہوتے۔ مادہ ایک مدت تک کام کرتا رہتا ہے پھر اسکی استعداد نیچے چلی جاتی ہے۔ جیسے زمین پر آبادی ہوتے ہوتے زمین کی قوت نیچے ہو جاتی ہے اور ہل جوتنے اس کو اوپر لایا جاتا ہے پس دونوں جب قدیم ہوئے تو فنا کے قابل نہیں رہے۔ حدوث کا مطلب فقط اتنا ہے کہ جب ایک ٹکڑا ظاہر الوجود کا ہمیں نظر آنے لگا۔ اور اسکی استعداد کے موافق باطن الوجود سے ایک ٹکڑا اس سے مل گیا تب ایک نئی چیز ظاہر ہوئی۔ بہت مدت تک مستعمل ہوتے ہوتے مادے کی استعداد نیچے کی جانب ہوجاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین کی قوت آبادی بڑھنے کی وجہ سے نیچے دب جاتی ہے اور اس کو باہر لانے کے لیے انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مادے کی طاقتیں جب نیچے کی جانب منتقل ہوجاتی ہیں تو ان کو دوبارہ اوپر لانے کے لیے (والنازعات غرقا) بڑی طاقت سے غوطہ لگا کر باہر کھینچ کر لانے والی جماعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ طاقتیں جن سے استعداد نیچے چلی جاتی ہے ان کو دور کردیا جاتا ہے۔ (و الناشطات نشطا) ان کی تمام گرہیں کھول دی جائیں گی اور تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے گا۔ تو (و السابحات سبحا) وہ تیرنے لگ جائیں گی اور وہ آگے ترقی کرنے اور سب سے آگے جاکر کام کرنے والی طاقتیں ہوں گی۔ (فالمدبرات امر) حکم الٰہی سے تدبیر کرنے والی ہوں گی۔ حکم اور امر کے مطابق تدبیر کرتے ہیں۔

جواب قسم ہے یوم ترجف الراجفۃ:۔ تو قیامت میں بھی واقعہ ہوگا کہ

استعدادات جو نیچے چلی گئی تھیں ان کو اوپر لانے کے لئے جھٹکے آئیں گے اور بہت جھٹکے آئیں گے تب جا کر وہ استعداد ظاہر ہوگی۔ تو جب تمام قوت اور استعداد اور ہر چیز کامنہ ان جھٹکوں سے باہر نکل آئے گی تب اس سے قلوب یومئذ واجفہ اس وقت تمام چیزیں نظر آنے لگ جائیں گی۔

الٰہی حکیم اس بات کو مانتا ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی۔ اور نہ ضایع ہوتی ہے۔ تو جب استعداد مخفی ہو جائیں گی ان کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔

باطن الوجود کو ظاہر الوجود سے ربط دینے کا نام ہے ربط الحادث بالقدیم اور یہ مشکل مسئلہ ہے اس کے حل کرنے والے فقط حکمائے الٰہی ہیں۔ اس کو شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب "عبقات" میں وحدت وجود کے اثبات سے ثابت کیا ہے اور مولانا مولوی محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے جو ہندوستان کے ایک مجدد اعظم ہیں اس مسئلہ کو اپنی کتاب "تقریر دلپذیر" میں واضح کیا ہے۔ تو قیامت کا واقعہ فقط اس استعداد کو ظاہر کرتا ہے جو تہ نشین ہو گئی تھی۔ اور وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے.

اللہ تعالیٰ کے چار اوصاف بالترتیب مانے جاتے ہیں. ۱۔ ابداع ۲۔ خلق ۳۔ تدبیر ۴۔ تدلی یعنی تجلی۔ بغیر مادہ کے عالم امر سے یعنی حکم سے ایک چیز پیدا ہوگئی جس کو صوفیاء کرام شخص اکبر کہتے ہیں اور چونکہ ابداع کے تجلی کے خدام اور روحانیات کو اس شخص اکبر کی ترقی کے لیے اور اسکو ظاہر کرنے کے لیے بہت بڑی مشقت کرنی پڑے گی اس لیے اسکو والنازعات غرقاً کہا گیا۔ ابداع والی تجلی کے رموز و نکات اور قوائے کا منہ کو حالت بروز میں لانے والے ملائکہ اور روحانیت کو والنازعات غرقاً (اور جب ان کے قوائے کامنہ بارز ہوگئے) تو صفت خلق پیدا ہوگئی. ایک چیز سے دوسری چیز ہونے کا نام خلق ہے اور خلق کی صفت کے خدام کو والناشطات نشطاً یعنی قوائے کامنہ, شخص اکبر کے جب بارز ہو گئے تو آگے سرحد خلق آجاتی ہے۔ وہاں اس سے کم مشقت ہوتی ہے تو ان ملائکہ کو والناشطات سے تعبیر کیا ہے اور بحر خلق اپنی موجوں سے نمودار ہو گیا اور یہ وہ صفت ہے جس کو ماء سے تعبیر کیا ہے (و کان عرشہ علی الماء) تو وہ خدام اس صفت مذکور میں تیرنے اور شناوری کرنے لگے یعنی اِس بات کو انواع اور اقسام کی صورت دینے والے فرشتوں اور خدام سے اور روحانیات کو والسابحات سبحاً سے تعبیر کیا گیا تاکہ اس دنیا میں تیریں اور صدفِ انواع پیدا ہوں جیسے آسمان اور زمین اور اقسام عنصریات اور روحانیات اور عالم مثال پیدا ہو جائے۔ پھر جب عالم کے انواع, علویات اور سفلیات کے انواع بن گئے اور اس میں مشقت کم ہے تو اس درجہ کو والسابحات سے تعبیر

کیا جاتا ہے۔ اور جب یہ مدارج نمودار ہو گئے تو آگے ان کو درجہٗ تکمیل تک پہنچانا نہایت آسان ہے۔ یہ جماعت نہایت تیزی سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے دوڑتی ہے۔ تاکہ اس کے جو کام سپرد ہے وہ جلد سر انجام ہو جائے تو اس درجہ کو کہا گیا ہے والسابقات سبقاً۔ پھر جب ہر ایک چیز اور انواع اور ان کے افراد اپنے تقاضے کے موافق بڑھنا شروع ہو گئے تو مزاحمت ایک دوسرے سے ہو جائے گی. مثلاً ایک درخت اتنے تخم دے گا کہ ساری زمین اس سے بھر جائے اور دوسرے قسم کے درخت کے لیے جگہ نہ رہے تو اب اس مزاحمت اور مخاصمت کو دور کرنے کے لیے مدبرات امر پیدا فرمائے تاکہ اصلح للبقا کو قائم رکھیں۔ اسی طرح تنازع للبقا میں تدبیر کی صفت کو آگے بڑھایا۔ جب تدبیر مکمل ہو گئی تو تدلّی یعنی تجلّی کا دور آئے گا اور اس کی بڑے اعلیٰ درجہ کی مثال یوم القیامۃ ہے۔

آیت ۳۴۔ فاذا جاءت الطآمۃ الکبریٰ۔ جب ایسا وقت آجائے کہ تم کو ان (آیت ۲۷ تا ۳۲) کے سامان سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش باقی نہ رہے مثلاً تمہارے یہاں ایک ظالمانہ نظام غالب آجائے تو تمہیں اس پہلے قاعدہ کے مطابق ہلاک کر دینا چاہیے۔ (آیت ۲۶)۔ تم اس قدر بڑی ہستی نہیں ہو کہ تمہیں ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح تم نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق ہوتے دیکھا اسی طرح جب اس سامان سے تمہارے نفع حاصل کرنے کا طریقہ ختم ہو جائے گا تو اس نظام کو بھی یونہی (موجودہ صورت میں) نہیں رکھا جائے گا بلکہ اسے توڑ پھوڑ کر اور طریقہ سے چلایا جائے گا۔ جب یہ تمام نظام توڑ دیا جائے گا (اسے طامۃ الکبریٰ کہا گیا ہے دیکھو آیت ۱، ۲ فقرہ ۴۔ آیت ۲۷ میں کہا گیا تھا کہ تم کو برباد نہیں کیا جا سکتا یا آسمان برباد نہیں کیا جا سکتا؟) تو دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ تمہاری بربادی تمہارے ظلم کے باعث ہوگی۔ جب زمین پر انسان اور حیوان نہ رہے تو اس نظام کو ایسے طریقہ پر چلایا جائے گا کہ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے. اس لیے کہ یہ نظام انسان اور حیوان کے واسطے بنایا گیا تھا۔ اب جب دونوں نہ رہے تو اب اس نظام کو بدلنا ضروری ہے تاکہ اسے اس طرح سے چلایا جا سکے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے.

یہ طے شدہ بات ہے کہ کوئی چیز فنا نہیں ہوتی بلکہ اس کی فقط صورت تبدیل ہوتی ہے.

آیت ۳۵۔ یوم یتذکر الانسان۔ اب جب یہ نظام بدل جائے گا تو انسان کی کیا کیفیت ہو گی؟

روح اعظم کی ایک ایسی شان ظاہر ہو گی جس سے انسان کی تمام کوششیں

اس کے سامنے آجائیں گی اس لیے کہ روح اعظم میں انسان کی تمام کوششیں محفوظ ہوتی چلی آئی ھیں۔

آیت (۳۶) و برزت الجحیم: ان کوششوں کے نتیجے کے دو راستے ھیں۔ دوزخ اور بہشت (آرام کی جگہ) یہ دونوں سامنے آجائیں گے۔ (اس جگہ صرف جیل خانے کا ذکر ھے سمجھنا چاھیے کہ یہ راستہ بھی سامنے آجائے گا یعنی جیل خانے کو دیکھنے والوں کے لیے یعنی اسکی سیر کرنے والوں کے لیے جھنم ظاھر ھو جائے گا اور وہ اس میں چلے جائیں گے)۔

آیت (۳۷ و ۳۸) و من طغیٰ و آثر الحیاۃ الدنیا: وہ آدمی جو اس قریب کی زندگی میں مستغرق ھو گیا۔ اور انجام سے بیخبر ھو گیا۔ اس کا ٹھکانا جھنم ھے۔ آیت(۱۷) میں فرعون پر جرم تھا کہ وہ طاغی ھو گیا اس واسطے اسے سزا دی گئی۔ اور اسے برباد کیا گیا۔ بعینہ اب اس جگہ بھی یہی کیفیت بیان کی جا رھی ھے کہ جو (آیت ۳۷) اسی طرح (فرعون کے مانند) طاغی ھوگیا اسکے لیے بھی بربادی کی سزا ھے۔

آیت (۴۰) و اما من خاف مقام ربہ: اب جو شخص انجام کو سامنے رکھتا ھے۔ اور خواھشوں کے پیچھے نہیں رھتا بلکہ اپنی عقل سے کام لیتا ھے (آیت ۴۱ فان الجنۃ ھی الماویٰ) اس کے واسطے جنت ھے۔

(۱) قاعدہ یہ ھے کہ جو شخص اپنی عقل کے مطابق جتنا صحیح راستہ سمجھ سکا اور اس پر چلتا بھي ھے تو اس کا ٹھکانا جنت ھے اور جو عقلی تقاضے کو چھوڑ کر شہوتوں کے پیچھے پڑگیا وہ جھنم میں جائے گا۔ انبیاء کی تعلیم عقلمندوں کے واسطے ایسی ھے جیسے وہ کاشتکار جو کنویں سے کھیت کو سیراب کررھا ھے۔ اور اس پر بارش ھو جائے تو وہ اس کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھے گا۔ غرض جس طرح کسان کے واسطے بارش ایک زائد رحمت ھے اسی طرح انسان پر بھی انبیاء کی تعلیم زائد رحمت ھے۔

(۲) انبیاء کی تابعداری کا دعویٰ کرنے والوں (جاھل علماء) کی ایک جماعت نے عقلمندوں سے لڑائی خرید رکھی ھے اور عقلمندوں کا چھوٹا طبقہ ان کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے ان دونوں کا جھگڑا ختم ھی نہیں ھوتا۔ وہ اس قسم کے لوگوں کو سامنے رکھ کر کبھی قرآن مجید کی آیات کو حل نہیں کرنا چاھتے۔ غرض مطلب یہ ھے کہ صحیح عقل اور انبیاء کے طریقے میں کبھی معاوضہ نہیں ھو سکتا اور انبیاء کے طریقہ کو صحیح سمجھنے والا کبھی عقلمندوں سے نہیں لڑتا۔

(۳) عربی زبان میں ھویٰ کا لفظ اس چیز (جذبہ) کے لیے بولا جاتا ھے جو چیز (جذبہ) انسان کی طبیعت میں پیدا ھو اور عقل کے خلاف ھو۔ اس آیت میں صاف طور

پر عقل کی تابعداری کا ذکر نہیں آیا۔ مگر عربی جاننے والا آدمی اس کا بھی مطلب سمجھ سکتا ہے کہ صحیح فطرف عقل کے تابع ہونا چاہتی ہے۔ عقل اور انبیاء کے طریقہ کو آپس میں لڑا دینا، یہ بے عقلوں کے طریقہ کا کام ہے۔ یعنی انبیاء کا طریقہ ہمیشہ صحیح فطری اور عقل پر ہوتا ہے۔

(۴) عقلمندوں میں بعض ایسی جماعتیں پیدا ہوگئیں کہ وہ خود تو عقل نہیں رکھتیں مگر عقلمندوں کی باتیں ان کو یاد ہیں۔ اور خود ان میں عقل نہیں ہے۔ یہ عقل مند کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ عقلمند وہ ہے جسکو فطرۃً عقل ملی ہو اور وہ فطرت کو سمجھے اور اس پر چلے۔ ایسے عقلمند جن میں خود تو عقل نہیں مگر انبیاء کے طریقے کی جھوٹی سچی تابعداری کا دعویٰ رکھتے ہیں تو یہ بھی عقلمند نہیں ہیں۔ فطری عقل تھوڑی یا زیادہ جو اپنے اندازے پر رہے اِس جگہ وہ مراد ہے (اور یہ ایک زائد مسئلہ ہے عقل اور شرع کا مقابلہ جو ضمناً آ گیا ہے).

(۵) اصل مسئلہ ہے قیامت کا۔ اسکا خلاصہ یہ نکلا کہ اگر تمام انسانوں میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ انسانیت میں وہ استعداد نہ رہے اور تمام انسانوں میں قابل تبدیل حالت پیدا ہو جائے تو اس نظام میں بھی تبدیلی ضروری ہوگی اور اسی تبدیلی کا نام قیامت ہے۔ انسان کی تبدیلی کی وجہ سے یہ موجودہ نظام (زمین و آسمان کا) بدلنا پڑے گا۔ اس کو وہ باریک بین حکیم بہت جلد مان سکتا ہے جو انسانی پیدائش کو ان علتوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ کوئی علت اپنے معلول سے علحدہ ہوکر اپنی شان قائم نہیں رکھ سکتی۔ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو زمین روشن ہو جاتی ہے اب اگر فرض کر لیا جائے کہ زمین پر تاریکی چھاگئی ہے تو ماننا پڑے گا کہ آفتاب ضرور غروب ہو چکا ہے۔ اس نظام قدرت سے انسان اور حیوان وغیرہ پیدا ہوئے تھے اور اِس نظام سے یہ رونق (انسان و حیوان کی پیدائش) پیدا ہوگئی۔ مگر جب ہم یہ دیکھیں کہ یہ روشنی گم ہوگئی یعنی انسان و حیوان نہیں رہے تو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ وہ نظام قدرت بدل چکا ہے۔ اور نظام قدرت کی اِس تبدیلی کو طامۃ الکبریٰ کہا گیا ہے۔

آیت (۴۲) یسئلونك عن الساعة: جب اس مسئلہ پر زیادہ توجہ کریں اور اس کو ذہن نشین کرنے کے لیے عقل پر زیادہ زور دیں تب اصل مسئلہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور جب اس کی طرف کم توجہ دیں تو اس مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ چونکہ اِس مسئلہ کی حقیقت سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے اور بے عقلی کی وجہ سے بھاگتے ہیں اور عقل پر زور نہیں دیتے اس واسطے اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ فضول سوال کرتے ہیں جیسے کہ قیامت کب آئے گی یعنی

اس کا وقت بتاؤ۔

آیت (۴۳ و ۴۴) فیما انت من ذکریٰ ھا: اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھلا آس کا وقت بتانے سے تجھے کیا تعلق؟ وقت کا تعین صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اسے فرشتے بھی نہیں جان سکتے۔

آیت (۴۵) انما انت منذر: جو لوگ اس سلسلے کی علت اور معلول کو سمجھنے والے ھیں۔ تو آن کو فقط تنبیہ کرنے والا ہے۔

آیت (۴۶) کانھم یوم یرونھا: یہ لوگ تو کہتے ھیں کہ وہ وقت جلد معلوم ہو جائے۔ مگر جب وہ وقت سر پر آجائے گا تو کہیں گے کہ ھم کو کام کرنے کی بہت کم مہلت ملی کہ آدھے دن کے قریب رہے۔ تو یہ آن کی بے عقلی کی بات ہے کہ وہ ابھی اس موقع سے فائدہ نہ آٹھائیں اور اپنا کام نہ کریں۔ یہ مہلت اس واسطے دی گئی ہے تاکہ یہ سوچیں اور اس سے فائدہ آٹھا کر کام کریں۔

(اب شروع سورت سے ترجمہ کرتے ھیں):

روح اعظم اور اس دنیا کا تعلق قائم کرنے کے لیے فرشتے کام کرتے ھیں جیسے کہ انسانی حواس اور عصبات (یعنی انسان کی رگیں اور پٹھے)۔ جس طرح یہ حواس اور پٹھے کام کرتے ھیں اسی طرح روحِ اعظم اور اس عالم کے اندر فرشتے کام کرتے ھیں ان فرشتوں کی یہاں مختلف طریقے پر شہادت پیش کی گئی ہے۔ یہ سورت آن لوگوں کے واسطے ہے جو روحانی اسباب کو جانتے ھیں یعنی یہ مضمون آن لوگوں کے لیے ہے جو ان مضامین عالیہ کو جانتے ھیں اور روحِ اعظم اور فرشتوں کے حالات کا ان کو علم ہے۔

ھمارے مفسرین نے ایک غلطی کر رکھی ہے کہ قرآن مجید کی تمام آیات کو عام بدویت کی ذھنیت پر حل کرنے کی کوشش کرتے ھیں۔ مگر حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید چونکہ دنیا کی تمام قوموں کو دعوت دیتا ہے اس واسطے ھر طبقہ کی سمجھ کے لیے اس کی ذھنیت کے مطابق سمجھا دیتا ہے۔ ھم نے قیامت کے متعلق بعض سورتوں کو کاشتکاروں کے احوال کے مطابق پایا ایسی ھی بعض سورتوں کو الٰہی حکماء کی ذھنیت کے مطابق پاتے ھیں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ایک ہے۔ جو لوگ فرشتوں کا واسطہ روح اعظم میں اور اس انسانی جسم میں جانتے ھیں آن کے لیے یہ سورت، مسئلہ قیامت کو سمجھنے کا آسان طریقہ ہے۔

آیت (۱) والنازعات غرقاً۔ وہ اس نظام میں ڈبکی (غوطہ) لگاتے ھیں یعنی وہ کسی نظام کی تہہ تک پہنچ جاتے ھیں۔

آیت (۵) فالمدبرات امراً: تدبیر کر کے کام کرنے والے جن کے ذریعے روح اعظم کا تمام فیض زمین پر آ رہا ہے۔

آیت (۱ تا ۴) یہ اس کام کے حصے ہیں اور اس کام کے درمیانی درجے ہیں اور اس کا آخری حصہ ہے کہ وہ مدبرات (آیت ۵) یعنی تدبیر کے مکمل کرنے والے ہیں۔ یعنی جو جماعت تدبیر سے کام کرتی ہے یہ آخری جماعت ہے۔ پہلی جماعتیں ابتدائی کام کر رہی ہیں۔ یہ آخری جماعت ہے جو اپنی تدبیر سے کام کرتی ہے.

آیت (۶) یوم ترجف الراجفۃ: جس دن بڑا زبردست جھٹکا آئے گا۔ اور روح اعظم کھینچ کر عام دنیا کو ہلادے گی۔

آیت (۷) تتبعہا الرادفہ۔ اس کے بعد دوسرا جھٹکا آئے گا۔ یہ جھٹکے جاری رہیں گے یہانتک کہ تمام نظام بدل کر رکھ دیں گے۔

آیت (۸ و ۹) قلوب یومئذ واجفۃ: اس دن وہ دل میں ڈر رہے ہوں گے اور آنکھیں جھکی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح اعظم سامنے دکھائی دے رہی ہو گی اور یہ تمام سمجھ رہے ہوں گے کہ اب حساب ہونے والا ہے۔ غرض فرشتوں کی جماعتیں گواہ ہیں کہ ایسا واقعہ ضرور ہونے والا ہے.

آیت (۱۰) ءانا لمردودون فی الحافرۃ: جس طرح ہمیں پہلی دنیا میں بدن ملا کہ ہم پیدا ہوئے۔ بچپن۔ جوانی اور بڑھاپا دیکھا, کیا اب بھی اسی طرح ہو گا!

آیت (۱۱) کیا ہم فنا ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے؟ یعنی یہ لوگ تسلسل حیات کے قائل نہیں ہیں کہ مرکر دوبارہ اٹھیں گے۔ مگر جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو وہ حیران ہو کر کہتے ہیں کہ کیا ہم پھر دوبارہ پیدا ہوں گے؟ جب ان کو سمجھایا جاتا ہے کہ تم فنا نہیں ہوتے بلکہ یہ حالت کی تبدیلی ہے تو کہتے ہیں (آیت ۱۲۔ تلک اذاً کرۃ خاسرہ) چونکہ ہم نے دنیا میں بڑے بڑے ظلم کیے ہیں۔ اس واسطے ہم کو اس جگہ بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

آیت (۱۳) فانما ھی زجرۃ واحدۃ فاذا الآیۃ۔ جو قوتیں اس عالم کو روح اعظم سے وابستہ رکھتی ہیں ان میں شدت آجائے گی اور اس شدت کی وجہ سے تمام کے تمام ننگے ہو جائیں گے۔ اس جذب (کشش) اور نتیجہ کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے بتائی گئی ہے کہ اسی جذب کا نتیجہ تھا (آیت ۱۵).

سُورَۃ عبس مَکیّۃ وھی اثنتان و اربعون آیۃ و فیھا

رُکُوع واحد و کذا اَلخ

سورہ عبس مکہ میں نازل ہوئی اِس کی بیالیس آیتیں ہیں اور ایک رکوع اور اسی طرح آخر تک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع کرتا ہوں میں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے

عَبَسَ وَ تَوَلّٰیۤ (۱) اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی (۲) وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی (۳)

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ آیا اُس کے پاس اندھا اور تجھ کو کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنورتا

اَوۡ یَذَّکَّرُ فَتَنۡفَعَہُ الذِّکۡرٰی (۴) اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی (۵) فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی (۶)

یا سوچتا تو کام آتا اُس کے سمجھانا وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اُس کی فکر میں ہے

وَ مَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی (۷) وَ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی (۸) وَ ہُوَ یَخۡشٰی (۹)

اور تجھ پر کچھ الزام نہیں کہ وہ نہیں درست ہوتا اور وہ جو آیا تیرے پاس دوڑتا اور وہ ڈرتا ہے

فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی (۱۰) کَلَّاۤ اِنَّہَا تَذۡکِرَۃٌ (۱۱) فَمَنۡ شَآءَ ذَکَرَہٗ (۱۲) فِیۡ

وقف لازم

سو تو اس سے تغافل کرتا ہے یوں نہیں یہ تو نصیحت ہے پھر جو کوئی چاہے اُس کو پڑھے

صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ (۱۳) مَّرۡفُوۡعَۃٍ مُّطَہَّرَۃٍۭ (۱۴) بِاَیۡدِیۡ سَفَرَۃٍ (۱۵) کِرَامٍۭ بَرَرَۃٍ (۱۶)

لکھا ہے عزت کے ورقوں میں اونچے رکھے ہوئے نہایت ستھرے ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو بڑے درجہ والے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

سورۃ عبس مکیۃ

سورۃ والنازعات میں ہے الطامۃ الکبریٰ یعنی اینٹ سے اینٹ بجا دینے والی چیز یعنی نظام عالم کو برباد کرنے والی۔ عالم کے نظام پر جو بربادی آئے گی اُس سے اس کا تعلق ہے۔

اب سورۃ عبس کا مطلب ہے کہ انسانی جماعت کے نظام پر جو اس کا اثر آئے گا۔ یعنی نظام کی تبدیلی کے وقت اس جماعت پر جو اثر آئے گا اُس کے اثر سے ہر ایک آدمی اپنی نجات کے واسطے چیخ رہا ہوگا۔ آیت (۱ تا ۲۳) دیکھو آیت (۴۲) کے بعد۔

آیت (۲۴ تا ۳۲) فلینظر الانسان الی طعامہ۔ ہم نے کس طرح نظام قدرت سے انسان کو کھانا دیا۔ آسمان و زمین کی قوتیں کام کرتی ہیں تو اس کے نتیجے سے انسان اور حیوان فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ آیت (۳۲) متاعاً۔ یہ سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لیے سامان ہیں۔

آیت (۳۳ تا ۳۷) فاذا جاءت الصاخۃ۔ یہ تبدیلی لازمی ہے اور جب تبدیلی ہوگی تو ایک طرف تو زمین و آسمان کا نظام بدل جائے گا اور دوسری طرف انسان تبدیل ہو جائے گا۔ وہ دن ایسا ہے کہ انسان اپنے تمام عزیز و اقارب سے بھاگے گا۔ ہر انسان اپنے اپنے کام میں مستغرق ہو گا اور کسی کو ایک دوسرے کی خبر بھی نہیں ہوگی۔

آیت (۳۸ تا ۳۹) وجوہ یومئذ مسفرۃ: اُس وقت بعض صورتیں خوش ہوں گی یعنی یہ تو اچھے لوگ ہیں۔

آیت (۴۰ تا ۴۲) وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ۔ الآیہ اور بعض صورتیں ایسی ہوں گی کہ اُن کے منہ پہلے تو غبار آلود ہوں گے اور بعد میں اُن کی سیاہی بڑھتی چلی جائے گی، یہ جہنمی ہیں۔ غرض انسانیت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔

(اب اول سورۃ سے ترجمہ شروع کرتے ہیں)

آیت (۱ تا ۱۰) عبس و تولی ان جاءہ الاعمیٰ۔ یہ جو دو قسم کے انسان ہیں ان کا نمونہ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہاں اس دنیا میں بھی انسانوں کی حالت ایسی ہی ہے کہ ایک تو بڑے خوبصورت مہذب اور با تمیز آدمی ہیں۔ اُن کی اپنی زندگی کا ایک خاص نظام قائم ہے مگر اُن میں گھر کی سوچ اور سمجھ کچھ بھی نہیں، ایک تو یہ

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ (۱۷) مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۱۸) مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ

نیک کار ہیں، مارا جائیو آدمی کیسا ناشکر ہے کس چیز سے بنایا اس کو ایک بوند سے، بنایا اس کو

فَقَدَّرَهٗ (۱۹) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (۲۰) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ (۲۱) ثُمَّ اِذَا شَآءَ

پھر اندازہ پر رکھا اسکو، پھر راہ آسان کردی اسکو پھر اسکو مردہ کیا، پھر قبر میں رکھوا دیا اسکو پھر جب چاہا

اَنْشَرَهٗ (۲۲) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ (۲۳) فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲۴)

اٹھا نکالا اس کو، ہرگز نہیں پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا اب دیکھ لے آدمی اپنے کھانے کو

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا (۲۵) ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (۲۶) فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا (۲۷)

کہ ہم نے ڈالا پانی اوپر سے گرتا ہوا پھر چیرا زمین کو پھاڑ کر پھر اگایا اس میں اناج

وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا (۲۸) وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا (۲۹) وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا (۳۰) وَّ فَاكِهَةً

اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغ اور میوہ

وَّ اَبًّا (۳۱) مَّتَاعًا لَّكُمْ وَ لِاَنْعَامِكُمْ (۳۲) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (۳۳) يَوْمَ

اور گھاس، کام چلانے کو تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے پھر جب آئے وہ کان پھوڑنے والی جس دن

يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ (۳۴) وَ اُمِّهٖ وَ اَبِيْهِ (۳۵) وَ صَاحِبَتِهٖ وَ بَنِيْهِ (۳۶)

کہ بھاگے مرد اپنے بھائی سے اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی ساتھ والی سے اور اپنے بیٹوں سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (۳۷) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۳۸) ضَاحِكَةٌ

ہر مرد کو ان میں سے ایک فکر لگا ہوا ہے جو اس کے لیے کافی ہے کتنے منہ اس دن روشن ہیں ہنستے

مُّسْتَبْشِرَةٌ (۳۹) وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ (۴۰) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۴۱) اُولٰٓئِكَ

خوشیاں کرتے اور کتنے منہ اس دن ان پر گرد پڑی ہے چڑھی آتی ہے ان پر سیاہی یہ لوگ

هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (۴۲)

وہی ہیں جو منکر ہیں ڈھیٹھ۔

لوگ ہیں۔ اور دوسرے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں آرام کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ بلکہ بعض اوقات وہ معمولی سی ظاہری خوبصورتی سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ جیسے اندھے۔ مگر اس کے باوجود وہ خوب سوچنے والے آدمی ہیں اور مسئلہ کو آخر تک سوچنے والے انسان ہیں۔

قرآن مجید, ان سوچنے والے (اگرچہ بدصورت ہی ہوں) لوگوں کو سب سے پہلی صف میں جگہ دیتا ہے۔ اور بے تمیز خوبصورت لوگوں کو پیچھے رکھتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک واقعہ اتفاقیہ طور سے آ گیا کہ آپ قریش مکہ کی محفل میں اسلام کے احکام سمجھا رہے تھے کہ ایک نابینا (ابن ام مکتوم) مسلمان اس مجلس میں آ گیا۔ وہ اسلام کے متعلق آپ سے دریافت کرتا تھا اور آپ دوسری طرف منہ موڑ رہے تھے۔ اس سے ایک شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اس قسم کے سرمایہ دار اور بے سمجھ لوگوں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم میں ایک امتیازی درجہ ہے۔ اس واسطے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کر دی گئی کہ آپ نے ایک دفعہ تو ایسا کیا مگر آئندہ کبھی ایسا نہ کریں۔ غرض آیت (۱ تا ۱۰) میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔

آیت (۳) و ما یدریك لعله یزكی :- پاکیزہ اخلاق کا مالک ہو جائے۔

آیت (۴) او یذكر :- یا وہ اچھی بات یاد کر لے اور اس سے بتدریج فائدہ حاصل کر لے۔ جب اس نے بات کو یاد کر لیا تو اب وہ اس میں غلطی نہیں کرے گا بلکہ فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ جو لوگ اعلیٰ دماغی قوتوں کے مالک ہیں ان کو ایک علمی اشارہ (جھلک) آخر نتیجہ تک پہنچنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور دوسرے درجہ کے آدمی وہ ہوتے ہیں کہ انہیں ایک بات سمجھا دی جائے اور وہ اسے سمجھ کر خوب یاد کر لیتے ہیں اور پھر اس پر غور کرتے رہتے ہیں تو وہ آہستہ آہستہ آخری نتائج پر پہنچ جاتے ہیں۔

آیت (۵) و اما من استغنیٰ :- جو بے پرواہ ہے اسے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت نہیں۔ سرمایہ دار بے پروا ہیں ان کو کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ نہ علمی ترقی کا ان کو خیال ہے اور نہ پاکیزہ اخلاق کی ان کو خواہش ہے۔ اور جس کو ضرورت ہوتی ہے وہ ہر بات میں سوچ بچار کرتا ہے۔ اس واسطے کہا گیا ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" یہ حکیمانہ قول ہے۔ اور مسکین آدمی کو ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سوچ بچار میں ہوتا ہے تو اس میں سوچ کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے بڑے بڑے راز دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب غرباء اہل عقل سے وجود میں آئے ہیں۔

آیت (۶) و ما علیك :- تو اسے کیوں سمجھا رہا ہے؟ وہ تو سمجھے گا ہی نہیں۔ ان بے وقوفوں کے پڑھانے کی تم پر ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔ جس میں لیاقت ہو

اُن کو پڑھاؤ- جب وہ تعلیم کی پروا نہیں کرتے تو سمجھانا بالکل عبث ہے.

آیت (۷) **و اما من جاءك** :- یعنی ہم نے تجھے ایسے بے وقوفوں کی تعلیم کے لیے نہیں روانہ کیا بلکہ اُن لوگوں کی تعلیم کے واسطے روانہ کیا ہے جو سمجھتے ہیں یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی بات کو سوچ سمجھکر کرتے ہیں- تو ایسے لوگوں کو سمجھانا اور سکھلانا آپکے ذمہ ہے نہ کہ اُن لوگوں کو جو سوچتے سمجھتے ہی نہیں.

آیت (۸ تا ۱۰) **یسعیٰ** (۸) جو کوشش کرتا ہے، دوڑتا ہوا تیرے پاس آتا ہے- (۹) علمی ذوق رکھتا ہے کہ علت معلول اور سبب مسبب کو سمجھتا ہے- (۱۰) اُس کو سمجھانا تم پر فرض ہے اور تم کو اس سے غفلت نہ ہو- غرض ان آیات میں اس خاص واقعہ کے متعلق ایک تنبیہ کر دی گئی ہے اور اس کے بعد آپ نے ایسا کبھی نہیں کیا اور یہ تمام اُستادوں کا فرض ہے.

آیت (۱۱) **کلا انها تذکرة** :- یہ تعلیم ایک قسم کی یاد دھانی ہے، جس کے اندر استعداد ہے اُس کو بھولی ہوئی بات یاد آجاتی ہے.

آیت (۱۲) **فمن شاء ذکرہ** :- جو اسے سمجھے اور سوچ سکتا ہے اس کے واسطے یاددھانی ہے- یعنی استعداد رکھنے والے لوگوں کے لیے اس تعلیم کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے- جو لوگ اس تعلیم کو حاصل کرنے کا شوق رکھتے ہیں وہی اسے حاصل کر سکتے ہیں.

آیت (۱۳ تا ۱۶) **فی صحف مکرمة** : قرآن مجید کی اشاعت کے طریقہ کی طرف اشارہ ہے.

آیت (۱۳) **فی صحف مکرمة** :- قرآن شریف عزت والے کاغذوں میں لکھا جائے گا ایک ایک سورت ایک صحیفہ میں لکھی جائے گی.

آیت (۱۴) **مرفوعة** :- یہ تعلیم اونچی جماعت کے واسطے ہے جو انٹر نیشنلزم **قائم** کرنا چاھتی ہے- **مطہرة** :- پاکیزہ یعنی اس میں خدا پرستی، علم اور اخلاق اعلیٰ ہے.

آیت (۱۵ و ۱۶) **بایدی سفرة** :- سفیروں کے ھاتھ میں ہے جو دنیا میں پھل رہے ہیں- **کرام** :- بڑے اعلیٰ اخلاق کے مالک ، **بررة** نیک طبیعتیں- مطلب یہ ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کو ایسے شاگرد تیار کرنے چاھییں جو قرآن مجید کو دنیا میں خدائی سفیر بن کر پھیلائیں اور وہ نیک طبیعت ہوں اور دنیا میں ایک اعلیٰ اخلاق کی جماعت بنانے والے ہوں - ایسی جماعت کو دنیا دار لوگوں کے آگے خوشامد کر کے تبلیغ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ سرمایہ دار جماعت چاھتی ہے کہ کوئی ہماری خوشامد کرتا رہے.

آیت (۱۷) قتل الانسان ما اکفرہ:۔ جو لوگ بے تمیز ہیں وہ توقع رکھتے ہیں کہ انبیاء اور انکے شاگرد ہماری خوشامد کرتے رہیں تب ہم ان کی بات سنیں گے، کیا یہ اُن کے لیے جائز ہے؟ یہ اس واسطے کہا گیا کہ جو چیز انسان کو بلندی پر پہنچانے والی ہے وہ اسے ذلیل سمجھتا ہے۔ یہ نعمت کی قدر جاننے والا نہیں.

آیت (۱۸ تا ۲۲) من ای شیء خلقہ:۔ یہ اپنی پیدائش کے مسئلے پر شروع سے لے کر مرنے تک غور کرے اور سمجھے کہ ہم نے اسے کس قدر نعمتیں پہنچائی ہیں۔ اس کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے کہ یہ کس کام کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس میں خود ہی خواہش ہونی چاہیے کہ یہ اپنا فرض ادا کرے۔ قرآن مجید اُس کو فرض ادا کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس واسطے اسے خود ہی قرآن مجید کی تعلیم کی طرف کوشش کرکے جانا چاہیے.

آیت (۲۳) کلا لما یقض ما امرہ:۔ مگر یہ ایسا نہیں کرتا۔ اس کا جو فرض ہے اسے پورے کرنے کا یہ نام ہی نہیں لیتا.

آیت (۲۴ تا ۳۲) فلینظر الانسان الیٰ طعامہ:۔ اگر یہ اس طرف توجہ کرتا تو اس کے لیے فقط ایک ہی چیز کافی تھی کہ یہ اپنے کھانے کی طرف دیکھتا کہ یہ کس طرح پیدا ہو رہا ہے تو اس میں یہ اپنے فرائض کو سمجھ سکتا۔ یہ چیزیں تمام انسانوں کے لیے قدرتی طور پر مساوی پیدا کی جاتی ہیں اور انسان ان کو اپنی تنہا کوشش سے پیدا نہیں کرسکتا۔ مگر قدرت اُن کو پیدا کرتی ہے تو انسان اور حیوان دونوں ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب یہ ظلم ہے کہ مساکین کو اس سے محروم کردیا جائے اور اُن تمام نعمتوں کو صرف اپنے واسطے ہی مخصوص کرلیا جائے.

آیت (۳۳ تا ۳۷) یوم یفر المرء من اخیہ:۔ جن عزیزوں، رشتہ داروں کے واسطے یہ لوگوں پر ظلم کرتا رہا۔ اُس وقت یہ اُن تمام سے بھاگے گا جب کہ یہ واقعہ وقوع میں آئے گا.

آیت (۳۸ و ۳۹) وجوہ یومئذ مسفرہ ضاحکۃ:۔ جن لوگوں نے انصاف کا خیال رکھا ہوگا وہ اس دن آرام سے رہیں گے.

آیت (۴۰ تا ۴۲) وجوہ یومئذ علیہا غبرۃ:۔ جن لوگوں نے ظلم کیے ہوں گے وہ نقصان میں رہیں گے.

اس سورت میں زیادہ تر دو چیزوں پر زور دیا گیا ہے۔ ایک تو کھانے پینے کی چیزیں اور دوسرے اولاد کی تربیت۔ تو یہ ابتدائی چیزیں ہیں۔ اس کے بعد کتاب اللہ پڑھے گا تو اسے زیادہ توفیق ہوتی جائے گی.

سُوْرَةُ التَّكْوِيْر مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعٌ وَعِشْرُوْنَ آيَةً

سورہ تکویر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آنیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (۱) وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (۲) وَ اِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۳)

جب سورج کی دھوپ تہہ ہو جائے اور جب تارے میلے ہو جائیں اور جب پہاڑ چلائے جائیں

وَ اِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (۴) وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۵) وَ اِذَا الْبِحَارُ

اور جب بیائی اونٹنیاں چھٹی پھریں اور جب جنگل کے جانوروں میں رول پڑ جائے اور جب دریا

سُجِّرَتْ (۶) وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۷) وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ (۸) بِاَيِّ

جھونکے جائیں اور جب جیوں کے جوڑے باندھے جائیں اور جب بیٹی جیتی گاڑدی گئی کو پوچھیں کہ کس

ذَنْبٍ قُتِلَتْ (۹) وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (۱۰) وَ اِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ (۱۱)

گناہ پر وہ ماری گئی اور جب اعمال نامے کھولے جائیں اور جب آسمان کا پوست اتار لیں

وَ اِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (۱۲) وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ (۱۳) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ

اور جب دوزخ دہکائی جائے اور جب بہشت پاس لائی جائے، جان لے گا ہر ایک جی جو

اَحْضَرَتْ (۱۴) فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۱۵) الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (۱۶) وَ الَّيْلِ اِذَا

لے کر آیا سو قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جانے والوں سیدھے چلنے والوں دبک جانے والوں کی اور رات کی جب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورۃ التکویر مکیۃ

یہ ایک خاص نقطۂ نظر سے قیامت کو واضح کرنے والی سورت ہے۔ آیت ۱ تا ۱۴ کی تشریح آیت ۲۶ کے بعد دیکھیں۔

آیت (۱۵ و ۱۶) **فلا اقسم بالخنس** الآیہ۔ ان میں روشن ستاروں کی گواہی ہے اور اوپر کی طرف غور کرنے کا اشارہ ہے کہ کتاب الٰہی جیسی روشن ہے ویسے ہی اس کے لانے والے عمل کرنے والے معزز اور صاحب قوت وغیرہ ہوں گے۔

ان پانچ سیاروں (خمسہ متحیرہ) کو بطور شہادت پیش کیا جاتا ہے جن کی حرکتیں ایک طرح کی نہیں ہوتیں۔ یہ چلتے چلتے کبھی تو پیچھے آجاتے ہیں اور کبھی چلتے چلتے ٹھہر جاتے ہیں اور کبھی سیدھے نکل جاتے ہیں۔ تو ان کی صفات کا ذکر کرکے کہا کہ ان کو بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ سوائے سورج چاند کے باقی سبعہ سیارہ کو خمسۂ متحیرہ کہتے ہیں۔

آیت (۱۷ و ۱۸) **والیل اذا عسعس والصبح اذا تنفس**:- یہ دونوں گواہ ہیں۔

آیت (۱۹) **انہ لقول رسول کریم**:- یہ تمام آیت (۱۵ و ۱۶) اس بات کے گواہ ہیں کہ قران مجید ایک معزز پیغامبر (جبریل) کا قول ہے۔ خفی اشارہ اس کی طرف ہے کہ حاملین قرآن ایسے اوصاف والے ہوں گے۔ ع "آنچہ استاد ازل گفت ھمان می گویم"۔

آیت (۲۰ و ۲۱) **ذی قوۃ الایہ**:- یہ تمام اس پیغامبر (فرشتے) کے متعلق اوصاف ہیں جس کی زبان سے یہ قرآن مجید نازل کیا جارہا ہے۔

آیت (۲۲) **وما صاحبکم بمجنون**:- صاحب کے معنی ہیں کامریڈ:- رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف اشارہ ہے جس طرح سورۃ نون میں گذر چکا ہے۔ اس آیت میں آپ کی تعریف کا بیان ہے کہ آپ خلق عظیم کے مالک ہیں۔

آیت (۲۳) **ولقد راٰہ**:- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو آسمان پر دیکھا۔ **افق المبین** سے مراد حظیرۃ القدس ہے جس میں ملاء اعلیٰ کی جماعت ہے۔ وھاں تجلی الٰہی برس رہی ہے۔

آیت (۲۴) **وماھو علی الغیب بضنین**:- اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیب پر بخیل نہیں ہیں۔ انہیں جب غیب کی بات معلوم ہوتی ہے تو اس میں بخل نہیں کرتے اور آپ صرف اپنے لیے مخصوص نہیں کرتے۔

عَسْعَسَ (۱۷) وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ (۱۸) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۱۹) ذِیْ

پھیل جائے اور صبح کی جب دم بھرے مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا

قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ (۲۰) مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (۲۱) وَمَا صَاحِبُكُمْ

قوت والا عرش کے مالک کے پاس درجہ پانے والا سب کا مانا ہوا وہاں کا معتبر ہے اور یہ تمہارا رفیق کچھ

بِمَجْنُوْنٍ (۲۲) وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (۲۳) وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ (۲۴)

دیوانہ نہیں اور اس نے دیکھا ہے اس فرشتہ کو آسمان کے کھلے کنارہ کے پاس اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (۲۵) فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (۲۶) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ

اور یہ کہا ہوا نہیں کسی شیطان مردود کا، پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو، یہ تو ایک نصیحت ہے

لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۷) لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ (۲۸) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ

جہان بھر کے واسطے جو کوئی چاہے تم میں سے کہ سیدھا چلے اور تم جبھی چاہو کہ

يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۹)

چاہے اللہ سارے جہان کا مالک۔

آیت (۲۵) **وماھو بقول شیطان الرجیم**:- یہ شیطان کی بات نہیں ہے۔

آیت (۲۶) **فاین تذھبون**:- تو تم کیا سوچتے ہو اور کدھر جاتے ہو؟ شیطانوں کے کلام میں شر اور فساد برپا کرنا اور بے انتظامی ہوتی ہے یعنی ان کا قول فساد عالم کی طرف رہبری کرتا ہے اور کلام الٰہی اور آنحضرت صلی اللہ علی و سلم تو احسن اخلاق اور اعلیٰ نظام پیدا کرنا چاہتے ہیں، کیا تم نہیں سمجھتے؟ (۱) آسمان پر دو نظام ہیں ایک چاند کا اور دوسرا سورج کا۔ و الدلیل **اذا عسعس و الصبح اذا تنفس**۔ دن اور رات ایک قاعدہ کے اندر گھٹتے اور بڑھتے ہیں اور ان کی تمام حرکتیں معلوم ہیں۔ اور دوسرا حصہ یعنی بقیہ پانچ (آیت ۱۵ و ۱۶) سیّارے بے قاعدہ

ہیں۔ ان کی حرکت باقاعدہ نہیں ہے۔ یہ کبھی ٹھہرجاتے ہیں اور چل پڑتے ہیں اور کبھی واپس ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ستاروں کا نظام ہے۔ یہ نظام آخری نہیں ہے بلکہ اس کے اوپر ایک اور اعلیٰ نظام ہونا چاہیے۔ جس کے ماتحت یہ بے قاعدہ رفتار بھی باقاعدہ بن جاتی ہو۔ اعلیٰ نظام کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے اس واسطے اس کے اوپر ایک اعلیٰ نظام ہونا چاہیے۔ (اس اعلیٰ نظام کا نام حظیرۃ القدس ہم نے رکھا ہے)۔ یہ قرآن مجید اسی اعلیٰ نظام کی طرف سے ہے اور اسے ایک معزز فرشتہ لارہا ہے۔ رسول کریم کا اس فرشتہ کے ساتھ اتصال ہے۔ اور آپ سوچ سمجھ کر پھر اس سے قرآن مجید اخذ کرتے ہیں۔ یہ اعلیٰ نظام اس وقت ہماری نظروں سے غائب ہے مگر جس دن یہ ظاہر ہوجائے گا اور وہ روشن عالم (اعلیٰ نظام) نمایاں ہوجائے گا تو اس آسمان کا سورج میں اندھیرا ہوجائے گا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔

آیت (۱ تا ۱۳) **اذا الشمس کورت**:- اس اعلیٰ نظام کے ماتحت جو حظیرۃالقدس میں ہے۔ وہ حظیرۃالقدس جس دن ظاہر ہوگا اس دن یہ تمام واقعات ظہور میں آجائیں گے اس وقت اس نظام کی (موجودہ نظام جو زمین و آسمان پر ہے) ضرورت نہیں رہے گی اور یہ موجودہ نظام ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔

آیت (۸ و ۹) **اذالموءدۃ سئلت**:- چھوٹی بچّی پر جو ظلم ہوا تھا کہ اسے زندہ دفن کردیا گیا تھا، اب حکومت اس کے متعلق بازپرس کر رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ قتل کے مقدمات میں سرکار بذات خود دعویدار بنتی ہے۔ **واذا الصحف نشرت**:- جب کہ نامۂ اعمال ہر ایک کا اس کے آگے آجائے گا۔

آیت (۱۱) **واذاالسماء کشطت**:- موجودہ صورت میں آسمان موجودہ ایک قسم کا پردہ ہے۔ اس کے اٹھ جانے کے بعد اس کے پرے جو اعلیٰ صفتیں ہیں وہ نمایاں ہوجائیں گی۔ یعني حظیرہ‌القدس کا نظام ظاہر ہوجائے گا اور یہ موجودہ نظام انسانیت ٹوٹ جائے گا۔

آیت (۱۲) **واذاالجحیم سعرت**:- اس کے کام کا وقت قریب آگیا۔ یعنی سزا دینے کا وقت آگیا۔ اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے متفرقات واقعات ہیں۔ کچھ زمین میں اور کچھ آسمان پر ہیں۔ چنانچہ یہ واقعات جب ظہور میں آجائیں گے تو انسان اس وقت (آیت ۱۴- **علمت نفس ما احضرت**:- جس وقت یہ تمام ظہور میں آجائیں گے اس وقت وہ حقیقت ظاہر ہوگی) جان لے گا کہ اس نے دنیا میں کیا اعمال کیے تھے۔ یعنی قیامت کا جو حادثہ ہونے والا ہے اس اعلیٰ نورانی طاقت (حظیرہ‌القدس) کے ظہور سے ہونے والا ہے۔ جیسے رات کے بعد دن آتا ہے۔ اسی طرح تجلی الٰہی کا اس قدر بڑا سورج نکلے گا کہ یہ موجودہ سورج اس کے سامنے تاریک ہو جائے گا۔

آیت (۱۵ و ۱۸) اب آگے سوچنے او سمجھنے کا موقع دیا گیا ہے۔

آیت (۱۵ و ۱٦) فلا اقسم بالخنس الجوار الکنس :۔ جیسے انسان، آسمان پر خمسہ متحیرہ ستارون کی حرکت کو باقاعدہ دیکھتا ہے تو اسے اسی پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے آگے ترقی کرنی چاہیے اور اس نظام کے اوپر جو باقاعدہ نظام ہے اس کے متعلق غور کرنا چاہیے ۔ جس طرح سورج اور چاند کا نظام باقاعدہ نظر آرہا ہے اور خمسۂ متحیرہ سیارون کی چال بے قاعدہ نظر آرہی ہے تو انسان سمجھ جاتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی اعلیٰ نظام ہونا چاہیے جس کے ماتحت یہ بے قاعدگیِ ظاہری باقاعدہ ہوجائے اسی طرح اعلیٰ نظام ؛ تجلی اعظم کے ماتحت کام کر رہا ہے ۔

آیت (۱۹ تا ۲٦) انہ لقول رسول :۔ قیامت کا واقعہ ہونے والا ہے اس میں تو چارہ ہی نہیں ہے یعنی واقعہ ضرور ہوکر رہے گا ۔ اور اب یہ جو قرآن مجید نازل کیا جا رہا ہے ، اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ (قرآن مجید) اس واقعہ کے واسطے لوگون کو تیار کردے اور یہ دنیا کے لیے بڑی کار آمد چیز ہے کہ وہ اس بڑے واقعہ کے بچاؤ کی تدبیرین بتا رہا ہے اور دنیا کو بھی رحمت دے رہا ہے ۔

آیت (۲۷) ان ہو الا ذکر للعالمین :۔ یہ تمام اقوام کے لیے ایک نصیحت ہے۔ اس سے پہلے بھی رسول آئے۔ اِس کا اور ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ تمام اقوام عالم کے لیے ایک تذکرہ ہے۔ اس پاسپورٹ سے آگے بڑھنا اور چلنا ہوگا۔ جس کے پاس یہ تذکرہ نہ ہوگا اُن کو اقوام عالم میں بڑھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

آیت (۲۸) لمن شاء منکم :۔ اس بین الاقوامی تحریک کے لیے جس کا جی چاہے سیدھا کر لے ۔

آیت (۲۹) وما تشاؤن الا یشاء اللہ رب العالمین :۔ یہ کام وہی کرین گے جن میں اللہ تعالیٰ نے اس کام کرنے کی پہلے ہی سے استعداد رکھی ہے اور وہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اب ان دو واقعات کو جمع کر دیا گیا (۱) پہلے قیامت کا ذکر ہے اور آخر میں قرآن مجید کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد اور انسانیت کی اس قدر ترقی ہونے کے بعد اُس عالم بالا سے ترقی کی کوئی اور چیز نازل نہیں ہوگی۔ یہ قرآن مجید بین الاقوامی ترقی کی چیز ہے۔ اس کے بعد جو چیز آنے والی ہے وہ فقط قیامت ہے۔ گویا قرآن مجید نازل ہونے کے بعد قیامت اس کے ساتھ ہی متصل ہے اور قرآن مجید اور قیامت کے درمیان اب کوئی اور حجاب نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اوصاف سب قدیم ہیں مگر ارادہ اور کلام خاص استعداد و مستعدات کو چاہتا ہے

اس سورۃ میں قرآن مجید کو جبریل کا کلام کہا گیا ہے ۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف سب قدیم ہیں۔ ان میں سے ارادہ اور کلام حسب استعداد

قابل کے نزول ہوتا ہے۔ جب مادہ میں استعداد موجود ہوتی ہے تو وہ ارادۂ ازلی یا کلام ازلی بذریعہ تجلی، حظیرة القدس میں بلا کیف نازل ہوتا ہے۔ وہ معانی، معاني ہوتے ہیں اور حظیرة القدس میں ان کی صورت منطبع ہوتي ہے۔ اور جب کوئی کامل مکمل زمین پر موجود ہوتا ہے اور ارادۂ الٰہی اس سے کلام کرنے کا ہے تو وہ معانی مصورہ بصورت خاص و الفاظ خاص، زبان خاص میں حظیرة القدس میں منطبع ہو جاتے ہیں اور جبریل کے دل پر وہ نقش خاص منقش ہوتا ہے اور بذریعہ جبریل اس کامل کے دل پر وہ معانی بالفاظ خاص وارد ہوتے ہیں جو تجلي الٰہی کے ذریعہ حظیرة القدس میں نازل ہوئے ہے تو ایک گونہ جبریل کا کلام ہے اور ایک طرح خدائی کلام ہے۔

سُورَةُ الانفطار مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ تِسْعَ عَشَرَةَ آيَةً

سورہ انفطار مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ (۱) وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ (۲) وَ اِذَا الْبِحَارُ

جب آسماں پھٹ جائے اور جب تارے جھڑ پڑیں اور جب دریا

فُجِّرَتْ (۳) وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۴) عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ (۵)

ابل پڑیں اور جب قبریں زیر وزبر کردی جائیں جان لے ہر ایک جی جو کچھ کہ آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا

يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (۶) الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ

اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر جس نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو ٹھیک کیا

فَعَدَلَكَ (۷) فِيْ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (۸) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (۹)

پھر تجھ کو برابر کیا جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا ہرگز نہیں پر تم جھوٹ جانتے ہو انصاف کا ہونا

وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ (۱۰) كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (۱۱) يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ (۱۲)

اور تم پر نگہبان مقرر ہیں عزت والے عمل لکھنے والے جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ (۱۳) وَّ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ (۱۴) يَّصْلَوْنَهَا

بیشک نیک لوگ بہشت میں ہیں اور بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں، ڈالے جائیں گے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورۃ الانفطار مکیۃ

سورۃ مدثر میں ہے کہ کنا نکذب بیوم الدین ، تو قیامت کے دن کو یوم الدین بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح اور سورتوں میں قیامت کا نام یوم الدین رکھا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قیامت کے دن کو یوم الدین کا نام کیوں دیا گیا ہے۔ اس کی تفسیر کے لیے سورۃ انفطار ہے۔

آیت (۱ تا ۵) اذالسماء انفطرت الآیات :- قرآن مجید میں جس طرح واقعہ قیامت پر تنبیہ کرنے کا عام طریقہ ہے ان آیات میں بھی وہی طریقہ بتلایا گیا ہے کہ یہ تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ ان آیات میں عربی ذہنیت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ تمام آن پڑھ قوموں کی ذہنیت کا یہی مشترکہ درجہ ہے۔ آن پڑھ قومیں عموماً کسی تعجب انگیز بات کو سن کر زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔ اس کے برخلاف کسی معمولی بات کو سن کر وہ متوجہ ہی نہیں ہوتیں۔ مگر جب کوئی عجیب بات آن تک پہنچتی ہے تو وہ تمام کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ جو دماغ، علت و معلول کے سلسلہ کو سمجھ کر بات کو سمجھنے والے ہوں ان کے نزدیک کوئی بات عجیب نہیں رہتی۔ اور وہ بالکل نہیں ڈرتے۔ اب وہ سوچتے ہیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ مگر جو لوگ اُمّی ہیں اور علت و ملول کے سلسلے کو قائم نہیں کر سکتے آن کے لیے اگر کوئی ایسی بات آجائے تو وہ جھٹ گھبرا کر اس طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ اس طرف پوری طرح توجہ دیتے ہیں تب وہ بات کو اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں۔

دنیا کے تمام انقلابات میں قیامت کا واقعہ سب سے بڑا واقعہ ہے۔ جب سے انسانی پیدائش اس کرّۂ ارض پر پیدا ہوئی ہے، اس وقت سے لے کر اس قدر بڑا انقلاب نہیں آیا جتنا کہ قیامت کا انقلاب ہوگا۔ قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد فرض کرو کہ پچاس ہزار سال کے بعد قیامت آئےگی تو اس تمام زمانے میں انسانیت کے لیے قرآن مجید کے سوائے کوئی اور پروگرام نہیں۔ فقط اسی (قرآن) کی حکومت ہو گی۔ لا دینی انٹر نیشنلزم در حقیقت انٹر نیشنلزم کا ایک ٹکڑا ہے۔ پورا انٹرنیشنلزم تب ہو گا

يَوْمَ الدِّيْنِ (۱۵) وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ (۱۶) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۷)

اس میں انصاف کے دن اور نہ ہوں گے اس سے جدا ہونے والے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا

ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (۱۸) يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ

پھر بھی تجھ کو کیا خبر ہے کیسا ہے دن انصاف کا جس دن کہ بھلا نہ کرسکے کوئی جی کسی جی کا کچھ بھی

يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (۱۹)

اور حکم اس دن اللہ ہی کا ہے

جب اس میں انسانی عقائد اور انسانی اخلاق کا پورا لحاظ رکھا جائے گا اور ہر طبقہ اپنی ذہنیت کے مطابق اس کی حقانیت کا قائل ہوگا۔ اور شوق سے اس انٹرنیشنلزم طاقت میں شامل ہوگا۔ یہ انٹرنیشنلزم کا نصب العین ہے۔ انسان کو جہاں تک ممکن ہو اس طرف آہستہ آہستہ پہنچنا چاہیے۔ اور یہی قرآن مجید کا مقصد ہے۔ چونکہ قرآن مجید کے پروگرام کو قیامت کے ساتھ خصوصی تعلق ہے اِسی واسطے قرآن مجید میں قیامت کے واقعہ کا واضح طور پر سمجھانا ضروری ہے۔ اور اس کی روح فقط یہی ہے کہ دنیا کا فقط اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی بادشاہ نہیں ہے اور انٹرنیشنلزم کی یہی روح ہے۔ اب عربی ذہنیت کو اس سے متاثر کرنے کے لیے اس کا جو عجیب تر حصہ ہے وہ پہلے کہا جاتا ہے. عقلی نظریہ سے اس حصہ کی تکمیل کر دی جاتی ہے۔

آیت (۵) **علمت نفس ما قدمت و اخرت**:۔ انسان کو جو آگے آنے والے واقعات ہیں یا اس واقعہ (قیامت) کے وقوع میں آنے سے پہلے جو واقعات اِس دنیا میں انسان پر گزر چکے ہیں. وہ تمام واقعات اس کے روبرو آجائیں گے۔ غرض قیامت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تمام واقعات کو ظاہر کر دے گی۔

آیت (۷ و ۸) **یا ایھا الانسان ما غرک بربک الکریم**:۔ جب یہ واقعہ ہو جائے گا تو روح اعظم جو ایک پردہ کا کام دے رہی ہے اب اس کے بجائے انسان کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے دل میں تنبہ پیدا ہوگا کہ میں نے دوسری چیزوں میں رہ کر اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا۔ اصل

کام کی چیز یہی تھی کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک بڑے کام کرنے والی طبیعت ہے مگر وہ نہیں سمجھ سکتی کہ میری طبیعت اس پروگرام کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس واسطے ایسا شخص ایک سرپرست کی ہمیشہ ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح جو آدمی اپنے طور پر کام کرنا چاہتا ہے وہ ایسے آدمی کی ہمیشہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ اُس سے تعلق پیدا کرکے اُسے سرپرست بنائے اور اس کے ساتھ ہی کام کرے۔ اس واسطے وہ کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے تعلق پیدا کرتا ہے۔ اور اسی طرح پریشان رہتا ہے۔ اس پریشانی میں وہ سوچتا ہے کہ وہ ایک شہزادہ تھا جو حقیقت میں اپنے ملک سے دور ہوگیا ہے اور اُس کا باپ اب تک اپنے ملک میں حکمران ہے۔ اب چونکہ وہ اپنے سرپرستوں سے تنگ آیا ہوا تھا اس واسطے وہ اُن سے چھٹکارا حاصل کرکے اپنے باپ کے پاس جلدی پہنچتا ہے۔ جب باپ اور بیٹے ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں تو بیٹے کے دل میں ندامت پیدا ہوتی ہے کہ میں نے خواہ مخواہ ایک سرپرست کی تلاش میں وقت ضایع کیا، میرا سرپرست تو میرا باپ تھا اور مجھے اسی کی طرف آنا چاہیے تھا۔ اس کیفیت سے اس کی طبیعت بھر جاتی ہے۔ اس وقت بادشاہ (باپ) بیٹے سے کہتا ہے کہ بیٹا تو اتنی مدت ہم سے کیسے غافل رہا؟ تو اس کیفیت سے جو بیٹے کے دل میں پیدا ہوئی تھی اس کے (بیٹے) دل پر بہت اثر پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہر ایک بات کو پھوٹ پھوٹ کر کہے گا اور باپ کے سامنے رو پڑے گا۔ اس کے بعد اس کی طبیعت بالکل صاف ہوجائے گی۔

آیت (۶) ما غرك بربك الكريم :۔ کام کرنے والے انسان کو ایک سرپرست کی ازحد ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے ایسے لوگ غیر اللہ کی عبادت میں پھنس جاتے ہیں۔ انہیں جن جن سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اُن کی مدد کریں گے تو اُن کی انتہائی غلامی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو خود سوچ کر کام کرتا ہے اُس کو ایسی جگہ مایوسی نظر آتی ہے۔ وہ جس آدمی یا جس طاقت (غیر اللہ) پر اعتماد کرتے ہیں وہ آخر نکمی ثابت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو اپنے اللہ تعالیٰ سے تعارف ہوجائے اور یہ قیامت میں ہر شخص کو بلا واسطہ ہوگا۔ اس وقت اس سے کہا جائے کہ اے انسان! تجھے اپنے رب کی طرف سے کس نے دھوکے میں ڈال دیا کہ تو اپنے رب سے اتنا عرصہ بے پروا رہا۔

آیت (۷) خلقک فسوٰک :۔ جس نے تجھے بنایا اور تیری ایک ٹھیک فطرت بنائی، جو فطرت تیری خودی کو بخشی گئی، اس کی تمام ضروریات مہیا کردیں یہ ہے سوی کا ترجمہ۔ یعنی فطرت کی جس قدر اندرونی ضرورتیں تھیں وہ تمام اندر ہی اندر

پورے طور پر پوری ہو گئیں۔ مثلاً ایک انسانی خودی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود سوچ سمجھ کر کام کرے، ورنہ انسانی خودی قائم نہیں رہتی۔ انسانی خودی کے لیے خود کام کرنا ضروری ہے۔ اگر آسے خود کام کرنا نہیں آتا تو سمجھ لو کہ اس کی خودی نامکمل ہے۔ اب ایک سمجھدار دماغ ہے اور ماں باپ اس کی پوری سرپرستی کرتے ہیں مگر وہ خود کو ان کے لیے ایک بوجھ سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اپنے والدین کے سر پر کیوں پڑا رہوں؟ میں خود کام کیوں نہ کروں؟ اس واسطے اس کے خود کے کام کے لیے اس کو خودی کا تمام حصہ اور تمام کام دے دیے گئے، یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔

فعدلک:۔ ہر ایک عضو کی طاقت عدالت پر رکھی گئی۔ پانو کو اپنی طاقت دی گئی ہے اور آنکھ وغیرہ کو اپنی، اور پوری پوری عدالت سے طاقتوں کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اب اس کے بعد انسان تمام قدرتی اسباب کا محتاج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسے احاطہ (میدان) میں رکھتا ہے کہ اسے ہر ایک چیز اپنے مطلب کی ملتی ہے یہ ہے **فعدلک** کا ترجمہ یعنی اعتدال پیدا کر دیا۔ بیرونی طاقتوں میں اس قدر لچک رکھی ہے کہ انسان ان سے جس قدر فائدہ اٹھانا چاہے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یعنی یہ ناممکن ہے کہ یہ تمام چیزیں خود بخود ہی اس کے پاس آ جائیں بلکہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے انسان کو خود سوچ سمجھ کر کام کرنا پڑے گا۔ اور پھر تمام بیرونی چیزیں خود بخود ہی اس کے ماتحت (تسخیر) ہو جائیں گی۔

آیت (۸) **فی ای صورت ماشاء:۔** مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایک خاص انسانیت کی شکل دی گئی ہے۔ اور تمام نظام انسانیت میں انسان کا کام اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ اسے ایسی خاص صورت دی گئی ہے کہ جو کام یہ صورت (خاص شخص مثلاً زید) خود کرے گی اس کے بغیر ساری انسانیت کا نظام نامکمل رہے گا اور اتنے کام کے حصہ کو انسان کے سوائے کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ بڑی جماعتوں میں کام کی تعداد سے قیمت نہیں لگائی جاتی ہے بلکہ اس کی نسبت دی جاتی ہے۔ تو مجموعی انسانی کام میں تمام انسانوں کی ایک ہی نسبت ہے۔ مثلاً ایک آدمی لاکھ روپے کا کام کرتا ہے اور دوسرا آدمی ایک پائی کا۔* دونوں کے مجموعی

---

* یعنی اگر ایک پائی کا کام کرنے والا نہ ہوتا تو لاکھ کے کام کرنے والا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جیسے کھیتی باڑی کرنے والا غریب اگر کھیتی نہ کرتا تو بڑی بڑی سلطنتیں اور سرمایہ دار تباہ ہو جاتے۔ اب مجموعی نظام عالم میں ایک بادشاہ اور ایک صفائی والے کی ایک نسبت ہے، جس نے اس نسبت پر غور نہ کیا تو اس نے کچھ نہ سوچا۔

کام کی نسبت یکساں ہے۔ جیسی لاکھ روپے والے کام کی تھی ویسی ہی پائی والے کی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان جب اپنی فطرت کا مطالعہ کرے تو وہ اپنے اوپر کسی آدمی کو حاکم نہیں مانے گا، سوائے اُس رب کے جس نے اسے یہ فطرت عنایت کی ہے۔ بادشاہ تمدن کی حالت میں صفائی والے کا ایسا محتاج ہے جیسے حلال خور پیسہ کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر حلال خور اپنی خودی کی طرف نگاہ کرے تو سوائے اللہ تعالیٰ کے اپنے اوپر کوئی بادشاہ و حاکم نہ مانے گا۔ اپنا سرپرست فقط اللہ تعالیٰ کو مانے گا اور بادشاہ کو اپنے مساوی سمجھے گا۔ یہ تعلیم کتاب الٰہی کا خاصہ ہے۔

آیت (۹) کلا بل تکذبون با الدین :۔ اس حقیقت سے انسان کیوں غفلت برتتا ہے اس کے متعلق آیت (۶) میں بحث ہے کہ اے انسان! تو اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھتا؟ اور تجھے کس چیز نے غفلت میں رکھا؟ اِس کا سبب یہ ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ تمام عمر اس کی اسی طرح گزر سکتی ہے۔ وہ اپنی زندگی میں کسی ایسے دن کی توقع نہیں رکھتا جس دن تمام حکومتیں ختم ہو جائیں گی سوائے رب کی حکومت کے۔ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ ایسا دن آنے والا ہے تو پھر بھولے سے بھی وہ کسی کی حکومت کو تسلیم نہیں کرے گا۔ مگر وہ اُس دن سے غفلت برتتا ہے اور اگر اُسکے متعلق سمجھایا جائے تو وہ اُس کے انکار پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تو اِسی طرح حقیقی سرپرست سے غفلت برت کر دوسرے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔

آیت (۱۰ تا ۱۲) ان علیکم لحافظین :۔ یہ غفلت اس واسطے ہے کہ تم اس یوم الدین کا انکار کر رہے ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فطرتِ اِنسانی ایسی بنائی ہے کہ اُس کے ہر کام کے ساتھ محافظ طاقتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اُس کے کسی کام کو ضایع نہیں ہونے دیتیں۔

آیت (۱۳ تا ۱۶) ان الابرار لفی نعیم :۔ محافظ قوتیں اِنسانی کام کو ضایع نہیں ہونے دیتیں۔ اب اُنہوں نے جو اِنسانی کام کو محفوظ رکھا ہے، اُن کا بھی کسی دن نتیجہ نکلنا چاہیے۔ قیامت کے دن نئی زندگی پیدا ہوگی اور اُس زندگی کا خلاصہ اب بتلایا جاتا ہے کہ نیک لوگ آرام کی زندگی بسر کریں گے اور بُرے لوگ بُری زندگی بسر کریں گے۔ ابرار وہ جماعت ہے جس کی روح اعمال پر نگاہ ہوتی ہے۔ اعمال کی ایک صورت ہوتی ہے، جیسے صلواۃ کی ایک ھیئتَ ہے، دوسری اُس کی روح ہوتی ہے۔ صلواۃ کی روح کَاَنَّکَ تَرَاہُ۔

آیت (۱۵) لیصلونہا یوم الدین :۔ یہ فیصلہ قیامت کے دن ہوگا کہ اُن کو یہ بدلہ دیا جائے گا (جنت اور جہنم)۔ اور یہ اُن کاموں کو محفوظ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے جو محافظ قوت نے محفوظ رکھا تھا۔

آیت (۱۶) وما هم عنها :۔ اس محافظ قوت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ کبھی غائب نہیں ہو سکتے بلکہ اُن کو حاضر کر دیا جائے گا۔

آیت (۱۷ تا ۱۹) وما ادراک ما یوم الدین :۔ اب یوم الدین پر بحث ہے۔ اُس دن یہ بات ظاہر ہوئے گی کہ کوئی اِنسان کسی کا کام نہیں کر سکتا۔ والامر یو مئذ لله :۔ اور انسان کا تمام کام فقط الله تعالیٰ ہی کرتا ہے۔ انسانی فطرت سے جو زائد کام کرنا پڑتا ہے وہ الله تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے اور کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں۔ غرض یہ بات اُس دن ظاہر ہوجائے گی۔ اور انسان میں جو سرپرستی کی خواہش ہے، اگر انسان اپنی حقیقت پر غور کر لے تو وہ الله تعالیٰ کے سوائے کسی کو اپنا سر پرست نہیں پائے گا۔ اور جب وہ نظام قدرت کا مطالعہ کر لے گا تب بھی وہ الله تعالیٰ کے سوائے کسی کو اپنا سر پرست نہیں پائے گا۔ اِس بات کو سمجھانے کے لیے کہ انسان کی سرپرستی الله تعالیٰ کے سوائے کوئی نہیں کر سکتا سورۂ فاتحہ میں مالک یوم الدین کی صفت کا اظہار کیا گیا ہے جو ہر متدین آدمی کو ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہیے اِس واسطے سورة فاتحہ میں یہ دفعہ بڑھا دی گئی ہے۔

سُورَةُ التَّطفِیفِ مَکِیَّة وَّهِیَ سِتٌّ ثَلٰثُوْنَ اٰیَةً

سورہ تطفیف مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی چھتیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع الله کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ (۱) الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ (۲) وَ اِذَا

خرابی ہے گھٹانے والوں کی وہ لوگ جب ماپ کرلیں لوگوں سے تو پورا بھرلیں اور جب

کَالُوْ هُمْ اَوْ وَّزَنُوْ هُمْ یُخْسِرُوْنَ (۳) اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (۴)

ماپ کر دیں اُن کو یا تول کر تو گھٹا کر دیں کیا خیال نہیں رکھتے وہ لوگ کہ اُن کو اُٹھنا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ التطفیف مکیۃ

یہ سورۃ قیامت کے مضمون کو تاجرانہ ذہنیت سے سمجھاتی ہے اور انسانی اعمال کی جو محافظ قوت ہے (کہ وہ انسانی اعمال کو ضایع نہیں ہونے دیتی) اس کی توضیح ہے۔ یہ سورت قیامت کے اس رخ کو واضح کرتی ہے جو انسانی اعمال کی معافظت سے تعلق رکھتی ہے۔ تاجرانہ سیاست یہ ہے کہ دوسرے کو کم منافع دیا جاتا ہے اور خود زیادہ منافع اٹھایا جائے۔ جو شخص اس کام میں ماہر ہو کہ خود زیادہ منافع اٹھائے اور حساب کتاب میں مشاق ہو اور ناپ تول میں بھی صرف اپنا ہی فائدہ ملحوظ رکھے اور اپنی اس بات کو (ناپ تول کی کمی وغیرہ) ظاہر نہ ہونے دے وہ اصل معنیٰ میں تاجر ہے۔ اسے عربی میں تطفیف کہتے ہیں۔ تو گویا تاجرانہ کمائی کا نام تطفیف ہے۔

آیت (١) ویل للمطففین :۔ اُن کے لیے افسوس ہے۔

آیت (٢ و ٣) الذین اذا کتالوا علی الناس یستوفون :۔ مطففین کی یہ تفسیر ہے کہ وہ صرف اپنا ہی فائدہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ تاجروں کی جو زندگی اور تاریخ ہے اس میں بے انتہا تجربے موجود ہیں کہ جس تاجر نے اس طرح مال جمع کیا وہ غارت ہوگیا۔ بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ وہ بہت سا مال محتاجوں کو دیتا رہے تو وہ اس بدمعاشی کے نتائج سے بچتا رہتا ہے۔

آیت (٤ یا ٥) الا یظن اولٰئک :۔ اگر ان سے یہاں حساب نہ لیا گیا اور یہ اس جگہ کسی طرح سے بچ گئے تو کیا ان کو خیال نہیں ہے کہ ان سے ایک نہ ایک دن حساب لیا جائے گا؟

آیت (٦) یوم یقوم الناس لرب العالمین :۔ یہ حاضری کا دن ہے۔

آیت (٧) کلا :۔ لوگ اس مسئلہ سے غفلت برتتے ہیں مگر یہ ضرور ہوکر رہے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی کام ضایع نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں محفوظ رہتا ہے۔ تو ایک قوت جو انسان سے نکلی ہے (روح) اور وہ فنا نہیں ہوتی۔ فطری طور پر اس کا انسانیت میں واپس آنا لازمی ہے یعنی انسان ہوکر

U-10911B

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (٥) يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (٦) كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ

اُس بڑے دن کیواسطے جس دن کھڑے رہیں لوگ سامنے جہان کے مالک کے ہر گز نہیں بیشک اعمالنامہ گنہگاروں

لَفِيْ سِجِّيْنٍ (٧) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ (٨) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (٩) وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

کا سجین میں ہے اور تجھ کو کیا خبر ہے کیا ہے سجین ایک دفتر ہے لکھا ہوا خرابی ہے اُس دن

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (١٠) الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (١١) وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ

جھٹلانے والوں کی جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کے دن کو اور اُس کو جھٹلاتا ہے وہی جو

مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (١٢) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (١٣) كَلَّا

بڑھ نکلنے والا گنہگار ہے جب سنائے اُس کو ہماری آیتیں کہے نقلیں ہیں پہلوں کی کوئی نہیں

بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (١٤) كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ

پر زنگ پکڑ گیا ہے اُن کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے کوئی نہیں وہ اپنے رب سے

يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (١٥) ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (١٦) ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ

اُس دن روک دیے جائیں گے پھر مقرر وہ گرنے والے ہیں دوزخ میں پھر کہا جائے گا یہ وہی ہے

كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (١٧) كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ (١٨) وَمَآ

جس کو تم جھوٹ جانتے تھے ہر گز نہیں بے شک اعمال نامہ نیکوں کا علیین میں ہے اور تجھ کو

اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ (١٩) كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ (٢٠) يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ (٢١) اِنَّ الْاَبْرَارَ

کیا خبر ہے کیا ہے علیین ایک دفتر ہے لکھا ہوا، اُس کو دیکھتے ہیں نزدیک والے یعنی فرشتے، بیشک نیک لوگ

لَفِيْ نَعِيْمٍ (٢٢) عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ (٢٣) تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ

ہیں آرام میں تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے پہچان لے تو اُن کے مُنہ پر تازگی

قیامت میں آئے گا - دوسری شکل* بدل کر وہ پھر انسان پر آکر سوار ہو جائے گی تو اس حقیقت کو عام زبان میں سمجھایا گیا ہے - **ان کتاب الفجار** :- فجار وہ ہیں کہ ایک قانون کو مان کر پھر اس کو توڑتے ہیں - مع ھذا ان کو یقین ہے کہ یہ قانون سچا ہے - بدمعاشوں کا دفتر سجین میں ہے .

آیت (۸ و ۹) **کتاب مرقوم** :- وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے - یعنی محافظ قوت نے انسان کے اعمال کو محفوظ کردیا ہے .

آیت (۱۰) **ویل یومئذ** :- جن کا سجین میں دفتر ہے ، ان کا بہت برا حال ہوگا - اور ان کو وہاں حاضر رہنا ہوگا اور سجین کے عذاب کا مزا چکھنا ہوگا .

آیت (۱۱) **الذین یکذبون** :- سجین مین دفتر ان لوگوں کا ہے جو یوم الدین سے انکار کرتے ہیں .

آیت (۱۲) **وما یکذب الا کل معتد** :- جو شخص انسانی فطرت کو بگاڑ چکا ہے اور دوسرے کا مال غصب کر چکا ہے اب اسے فکر ہے کہ آئے اس کے سزا ملے گی - اس واسطے یہ اس دن سے انکار کر دیتا ہے - اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہے کہ قیامت ہے بھی نہیں .

آیت (۱۳) **اذا تتلی علیہ** :- انسان کو اعمال کی سزا ضرور ملتی ہے - اور اس انسانی اعمال کے سزا کی دلیل میں جب اسے تاریخی واقعات بتلائے جاتے ہیں تو وہ اس کو خرافات کہتا ہے -

آیت (۱۴) **کلا بل ران** :- ان کی یہ حالت اس واسطے ہوئی کہ یہ جب آہستہ آہستہ بدمعاشی کرتے رہے تو ان میں قوت ضمیری نہ رہی - اسے زنگ (گناہ) نے کھالیا - اب ان میں کانشنس نہیں رہا -

آیت (۱۵) **کلا انھم عن ربھم** :- اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ یہ اس دن اپنے رب سے دور ہوں گے - دوسرے لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پردہ کے پیچھے دیکھیں گے - مگر انہوں نے چونکہ اپنی فطرت کو بگاڑلیا ہے اس واسطے یہ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکیں گے اور اس کی رحمت اور انعام سے دور رہیں گے -

---

* دوسری بار دوسری شکل انسانی جس میں آگے سے زیادہ تیز حواس ہوں ظاہر ہوگی جس چیز کو دوربینیوں سے نہیں دیکھ سکتا تھا آج اپنے حواس سے دیکھ رہا ہے اور جس چیز کو تنکے برابر سمجھتا تھا وہ بڑے پہاڑ کی شکل میں نمودار ہے اور وہ شکل حسب اعمال دی جائے گی یعنی بدصورت خوب صورت اور خوب صورت بد صورت .

النَّعِیْم (۲۴) یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ (۲۵) خِتٰمُهٗ مِسْکٌ ط وَ فِیْ ذٰلِکَ

آرام کی، اُن کو پلائی جاتی ہے شراب خالص مہر لگی ہوئی جس کی مہر جمتی ہے مشک پر اور اس پر چاہیے

فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۲۶) وَ مِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ (۲۷) عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا

کہ ڈھکیں ڈھکنے والے اور اُس کی ملونی ہے تسنیم سے وہ ایک چشمہ ہے جس سے پیتے ہیں

الْمُقَرَّبُوْنَ (۲۸) اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۲۹) وَ

اللہ کے مقرب، وہ لوگ جو گنہگار ہیں تھے ایمان والوں سے ہنسا کرتے اور

اِذَا مَرُّوْا بِهِمْ یَتَغَامَزُوْنَ (۳۰) وَ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓی اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَکِهِیْنَ (۳۱)

جب ہو کر نکلتے اُن کے پاس کو تو آپس میں آنکھ مارتے اور جب پھر کر جاتے اپنے گھر پھر جاتے باتیں بناتے

وَ اِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ (۳۲) وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَیْهِمْ

اور جب اُن کو دیکھتے کہتے بے شک یہ لوگ بہک رہے ہیں اور اُن کو بھیجا نہیں اُن پر

حٰفِظِیْنَ (۳۳) فَالْیَوْمَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْکُفَّارِ یَضْحَکُوْنَ (۳۴) عَلَی الْاَرَآئِکِ

نگہبان بنا کر سو آج ایمان والے منکروں سے ہنستے ہیں تختوں پر بیٹھے

یَنْظُرُوْنَ (۳۵) هَلْ ثُوِّبَ الْکُفَّارُ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (۳۶) ۱ ع ۸

دیکھتے ہیں اب بدلہ پایا ہے منکروں نے جیسا کچھ کرتے تھے

آیت (۱۶ و ۱۷) ثم انہم لصالوا الجحیم :۔ ان کی سزا دوزخ ہے، جس سے یہ انکار کرتے ہیں۔ حکمت کے طور پر اِس طرح سمجھایا گیا ہے کہ زنگ کو دور کرنے کے لیے لوہے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ اس طرح اُن کے زنگ کو دور کرنے کے لیے انہیں آگ میں ڈالا جائے گا۔

آیت (۱۸ تا ۲۰) کلا ان کتاب الابرار لفی علیین :۔ نیک لوگوں کا دفتر

علیین میں ہوگا وہ حظیرۃ القدس میں ہے جہاں ملاء الاعلیٰ ہیں۔

آیت (۲۱) **کتاب مرقوم یشھدہ المقربون**:۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا انہی لوگوں کا وہاں دفتر ہوگا اور مقرب جماعت ملاء اعلیٰ وہاں ہر وقت حاضر ہیں۔

آیت (۲۲ تا ۲۶) **ان الابرار من رحیق مختوم**:۔ ان کو نعمتیں دی جائیں گی۔ ان کی تھوڑی سی تفصیل ان آیات میں بتلائی جاتی ہے۔ تاجر روپیہ پیسہ جمع کرکے اس دنیا میں ترقی کرتے ہیں، وہ عیش کی مجلس منعقد کرتے ہیں اور کرسیوں پر بیٹھ کر شراب پیتے ہیں۔ اگلی دنیا میں بھی کیفیت ان نیک سوداگروں کی ہوگی جنہوں نے اِس دنیا میں خیانت نہیں برتی۔ وہ ان تمام نعمتوں کے اگلی دنیا میں مالک ہوں گے۔

آیت (۲۵) **و فی ذلک فلیتنافس المتنافسون**:۔ ایسی مقدس چیز جس سے انسان کو سرور حاصل ہو اور خوشبو بھی۔ اس کے حاصل کرنے کے لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی طرف رغبت کریں رغبت کرنے والے۔

آیت (۲۷) دیکھو آیت (۲۸) کے بعد۔

آیت (۲۸) **عیناً یشرب بھا المقربون**:۔ جو اول درجہ کے نیک لوگ ہیں ان کے لیے تسنیم ہے، وہ ایک چشمہ ہے۔ مقرب لوگ سارا پیالہ تسنیم کا پییں گے۔

آیت (۲۷) **و مزاجہ من تسنیم**:۔ اور جو دوسرے درجہ کے نیک لوگ ہیں ان کے لیے تسنیم میں سے کچھ لے کر پیالہ میں ملادیا جائے گا بیت:۔

ازیں افیوں کہ ساقی در مے افگند * حریفان را نہ سرمایہ نہ دستار

یعنی مقرب لوگ تو تسنیم ہی پییں گے اور ابرار لوگوں کو اس کا ذرا سا ملا دیں گے۔ یہی معنیٰ ہے **مزاجہ من تسنیم** کے۔ مقرب لوگ تو اس سے سیر بھی نہ ہوں گے۔ شعر:۔

شربت الخمر کاساً بعد کاس * فما نفدت شراب ولا رویت

آیت (۲۹) **ان الذین اجرموا**:۔ مجرم لوگ دنیا میں مومنین کا مذاق اڑاتے تھے۔

آیت (۳۳ تا ۳۵) اس سورت کے آخر میں آیت (۳۶ و ۳۲) کے بعد دیکھو۔

آیت (۳۲ و ۳۶) **فالیوم الذین آمنوا**:۔ مگر آج کے دن مومن کافروں کی ہنسی اڑائیں گے جس طرح کافر دنیا میں مساکین کی ہنسی اڑاتے تھے، اسی طرح آج کے دن مومن کفار کی ہنسی اڑائیں گے۔ جس طرح انہوں نے مساکین کو تکلیف دی اسی طرح آج یہ بھی تکلیف میں مبتلا ہیں۔

علی الارائک ینظرون :۔ مومن لوگ تختوں پر بیٹھ کر سیر کے طور پر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوں گے آپس میں خوش و خرم ہوں گے اور باتیں کرتے ہوں گے۔ ھل ثوب الکفار ما کانو یفعلون :۔ اور آپس میں ہنسی کے طور پر کہیں گے بھائی بتاؤ تو سہی کیا کافروں، سرمایہ‌داروں کو پوری پوری سزا ملی؟

(اب سرمایہ‌دار مجرموں کا نقشہ آتا ہے)

آیت (۳۰ تا ۳۲) کانو من الذین آمنو یضحکون :۔ کافر ری اک شنری (Reactionary) لوگ اُن مساکین کا مذاق اُڑاتے تھے کہ دیکھو یہ مساکین کس قدر غلطی میں مبتلا ہیں کہ یہ ہماری طرح روپیہ پیسہ نہیں لوٹتے بلکہ انصاف کا ڈنکا بجا رہے ہیں اور بھوکے مر رہے ہیں۔

واذا انقلبو الی اھلھم:۔ بھوکے لوگوں کا اُن کے دلوں میں خیال تک نہیں آتا۔ انواع انواع کے لذیذ طعام اور میوے گھر میں کھاتے اور گھروں میں نہایت عیش و عشرت میں مزے کر رہے ہیں اور مساکین پر آنکھوں سے اشارہ کرتے ہیں کہ دیکھو یہ لوگ دنیا میں انصاف قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔

واذا راوھم قالوا ان:۔ یوں کہتے ہیں کہ یہ کیسے گمراہ لوگ ہیں کہ روپیہ پیسہ کمانے کا موقع کھو رہے ہیں اور مساکین کی خدمت کرتے ہیں۔ انسان کو چاہیے اپنے فائدہ کا خیال رکھے۔ یہ ایسا نہیں کرتے، یہ گمراہ ہیں۔ دیکھو تو سہی یہ لوگ مساوات مساوات اور حقوق الناس کہتے پھرتے ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے دنیا جہاں میں تو اپنا کماؤ اور کھاؤ۔ بس۔

وما آرسلو علیھم حافظین :۔ اِن سرمایہ‌دار کفار کو لوگوں پر فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں دیا گیا اور نہ یہ کفار اُن کے نگران کار تھے۔ اور ہم نے ان کفار کو انسپکٹر تھوڑا ہی بنایا ہے کہ تفتیش کرتے پھریں۔ حالانکہ مومنین کی یہ جماعت بین الاقوامی کام کرتی ہے۔ اُن کی یہ نادان ہنسی اُڑاتے ہیں اور اُن کو گمراہ کہتے ہیں۔

سورۃ الانشقاق مکیۃ وھی خمس و عشرون آیۃ

سورہ انشقاق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچیس آیتیں ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان ، نہایت رحم والا ہے

اذا السماء انشقت (۱) و اذنت لربھا و حقت (۲) و اذا الارض مدت (۳)

جب آسمان پھٹ جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ آسمان اسی لائق ہے اور جب زمین پھیلا دی جائے

و القت ما فیھا و تخلت (۴) و اذنت لربھا و حقت (۵) یایھا الانسان

اور نکال ڈالے جو کچھ اس میں ہے اور خالی ہو جائے اور سن لے حکم اپنے رب کا اور وہ زمین اسی لائق ہے اے آدمی

انک کادح الی ربک کدحا فملقیہ (۶) فاما من اوتی کتبہ بیمینہ (۷)

تجھ کو تکلیف اٹھانی ہے اپنے رب تک پہنچنے میں سہہ سہہ کر پھر اس سے ملنا ہے سو جس کو ملا اعمال نامہ اس

فسوف یحاسب حسابا یسیرا (۸) و ینقلب الی اھلہ مسرورا (۹) و

کا داہنے ہاتھ میں تو اس سے حساب لیں گے آسان حساب اور پھر کر آئے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش ہو کر اور

اما من اوتی کتبہ وراء ظھرہ (۱۰) فسوف یدعوا ثبورا (۱۱) و یصلی

جس کو ملا اس کا اعمال نامہ پیٹھ کے پیچھے سے سو وہ پکارے گا موت موت اور پڑے گا

سعیرا (۱۲) انہ کان فی اھلہ مسرورا (۱۳) انہ ظن ان لن یحور (۱۴)

آگ میں وہ رہا تھا اپنے گھر میں بے غم اس نے خیال کیا تھا کہ پھر کر نہ جائے گا

بَلٰٓى اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا (۱۵) فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۱۶) وَالَّيْلِ وَمَا

کیوں نہیں اُس کا رب اُس کو دیکھتا تھا سو قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی اور رات کی اور جو چیزیں

وَسَقَ (۱۷) وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ (۱۸) لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۱۹) فَمَا لَهُمْ

اُس میں سمٹ آتی ہیں اور چاند کی جب پورا بھر جائے کہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی پھر کیا ہوا ہے ان کو

السجدة

لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲۰) وَ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (۲۱) بَلِ الَّذِيْنَ

جو یقین نہیں لاتے اور جب پڑھے اُن کے پاس قرآن وہ سجدہ نہیں کرتے اوپر سے اور یہ کہ

كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ (۲۲) وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ (۲۳) فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۲۴)

منکر جھٹلاتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے جو اندر بھر رکھتے ہیں سو خوشی سنا دے اُن کو عذاب دردناک کی

ع ۱

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (۲۵)

مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کام کیے بھلے اُن کے لیے ثواب ہے بے انتہا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

سورۃ الانشقاق مکیۃ

اس سورت میں قیامت پر بحث ہے اور انسانیت کی فطری ترقی کے نقطہ نظریہ کی گئی ہے۔ اگر تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جائے اور انسانی ترقی نقط اپنی فطرتی ترقی، کرتی جائے تو انسان کی فطری ترقی قیامت کی طرف ایک قدم آجائے گی *

آیت (۱۹) لترکبن طبقاً عن طبق :۔ تم چڑھتے جاؤ گے طبقہ بعد طبقہ۔ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ انسانیت کا کہیں خاتمہ نہیں ہے۔ اب انسانیت ایک طبقہ کو ختم کرکے دوسرے طبقہ میں ترقی کرے گی۔ ایک کو ختم کرکے پھر دوسرے طبقہ میں جائے گی۔ غرض اس طرح درجہ بدرجہ ترقی کرتی جائے گی۔ اور جب زمین کے طبقہ میں انسانی ترقی مکمل ہو جائے گی تو آسے چھوڑ کر یعنی اس دنیا کو چھوڑ کر آسے اوپر جانا ہوگا۔ اسی کا نام قیامت ہے۔

انسان کے مرنے کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ ایک کی انسانیت فنا ہو جاتی ہے بلکہ اس کی انسانیت ویسی ہی قائم رہتی ہے اور اس کے تمام اعمال اپنے حس مشترک میں محفوظ رہتے ہیں اور اسی طرح عقائد اور علوم۔ گویا اس کی موت کا معنیٰ یہ ہے کہ جسم کی ضروریات سے فارغ ہوکر وہ ان اعمال کے مطالعہ میں مشغول ہوتا ہے اس کی تشریح ہم قدرے تفصیل سے کرتے ہیں۔ **فاستمع لایتلی علیک**۔

اگر انسانی طاقتوں کی تحلیل کی جائے تو اس کے دو حصے نکلتے ہیں۔ ایک حصہ کا نام ہے بہیمیت یعنی حیوانیت جو جسمانی حیات کی مالک ہے کہ اس سے جسم زندہ رہتا ہے۔ اور دوسرے حصے کا نام ہے ملکیت یعنی نورانیت۔ اس دوسرے حصے کے واسطے سے انسان کا تعلق مقدس لوگوں، فرشتوں اور بعد میں اللہ تعالیٰ سے بالواسطہ پیدا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی میں جو چیز موت تک غالب (ظاہر) ہے

* یہ بھی طبی مسئلہ ہے کہ جس انسان میں غور کی عادت ہے تو جتنا بوڑھا ہوتا جائے گا اس کی دماغی ترقی بڑھتی جائے گی۔ اور اگر اس میں غور کی عادت نہیں تو جتنا بوڑھا ہوتا جائے گا اتنا کم عقل ہوتا جائے گا۔ یہ اس زمانہ کے ڈاکٹروں کا تجربہ ہے۔

اس میں پھیلاؤ جزوِ بہیمیت کا ہے یعنی حیوانیت کا جزو غالب (ظاہر) رہتا ہے۔ اور دوسرا جزو (ملکیت) اس کے اندر چھپ کر کام کرتا ہے - مثال کے طور پر ٹھنڈے پانی کو اس قدر گرم کریں کہ وہ کھولنے لگ جائے تا کہ وہ ایک ٹکڑا آگ کا معلوم ہونے لگے - مگر اس حالت میں بھی پانی اپنی طبعی ٹھنڈک کو نہیں چھوڑتا - اسی حالت میں اگر یہ کھولتا ہوا پانی آگ پر ڈال دیا جائے تو اس موقع پر وہ اپنا طبعی جذبہ زور سے ظاہر کرے گا اور آگ کو بجھادے گا - تو اس مثال میں یہ سمجھنا چاہیے کہ پانی اور اس کی طبعی ٹھنڈک ظاہر اور غالب ہے اور اس میں جو ۹۹ درجہ کی گرمی ہے وہ مغلوب ہے اور چھپی ہوئی ہے - یعنی بظاہر گرمی محسوس ہو رہی ہے اور ٹھنڈک چھپی ہوئی ہے ۔

موت کے بعد حالت بدل جائے گی اور حالت برعکس ہوجائے گی - اور دوسرا جزو (ملکیت) ظاہر (غالب) ہو جائے گا - اور پہلا جزو (بہیمیت) اس کے اندر چھپ جائے گا - بعض حکماء کا خیال ہے کہ پہلا جزء (بہیمیت) بالکل غائب ہو جائے گا اس کو شاہ صاحب کے فلسفہ میں بالکل قبول نہیں کیا جاسکتا - بلکہ اس راستہ کو بالکل غلط مانا جاتا ہے - جس دن پہلا جزو (بہیمیت) بالکل غائب ہوگیا تو اس دن انسانیت بالکل غائب ہو جائے گی - ایک کسر اعشاریہ کا بہت ادنیٰ درجہ یعنی پہلے جزو (بہیمیت) کا دوسرے جزو (ملکیت) کے ساتھ رہنا ضروری ہے - مثلاً اس پہلے جزو کا اتنا حصہ رہ گیا تو بھی انسانیت صحیح ہے - ان دونوں جزؤں کا آپس سے علیحدہ ہوجانا ہمارے فلسفہ میں ناممکن مانا گیا ہے - جب تک انسانیت ہے دونوں جزء (بہیمیت اور ملکیت) ساتھ رہیں گے - یہ جو پہلا جزء (بہیمیت) ہے اس کا مددگار دنیا میں یہ جسم خاکی تھا - جتنا حصہ پہلے حصہ (بہیمیت) میں سے کم ہو جاتا ہے (جیسے متعارض قوتوں سے) تو اس کا بدلہ (اس کے بجائے) یہ حصہ (جسم خاکی) ہمیشہ تیار کر کے بھیجتا رہتا ہے ۔

موت کے بعد جب اِس بدن (جسم خاکی) سے انسانی روح کا تعلق ٹوٹ گیا تو جو مدد اس پہلے حصہ (بہیمیت) کو یہ بدن پہنچاتا تھا وہ ختم ہوگئی - اور ملکیت کے آہستہ آہستہ غالب ہونے کی وجہ سے اسکے اجزاء میں کمی ہونی شروع ہوگئی - جیسے گرم پانی آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونا شروع ہوجاتا ہے - تو یہ کبھی یک لخت نہیں ہوگا - ایک زمانہ تک روح کی حالت ایسی رہے گی کہ وہ سمجھے گا کہ میرے دونوں جزء (بہیمیت اور ملکیت) جیسے دنیا کی زندگی میں تھے ویسے ہی اب بھی قائم ہیں اور حیوانیت کا جزء غالب ہوگا - اس کے دل میں یوں خیال ہوگا کہ میرے دونوں جزء دنیاوی زندگی کے مانند بدستور قائم ہیں - اب صرف اس قدر فرق ہے کہ

بدن (جسم خاکی) کے نہ ہونے سے میں کام نہیں کر سکتا اور باقی میں ویسے کا ویسا ہوں جیسا دنیاوی زندگی میں تھا۔ جب تک یہ خیال قائم رہے گا اُس زمانے کو عالم قبر کہا جاتا ہے۔ یہ خیال آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوگا۔ جب یہ خیال نصف سے زیادہ کم ہوگیا اور ملکیت غالب ہونے لگی تو اب اِس طرح کا خیال پیدا ہونے لگے گا کہ مجھے مَلکی قوتوں (مَلکیت کی قوتیں) سے اتصال پیدا کرنا چاہیے اور پرانے طریقہ کو اب بھولنے لگے گا۔ جب اس دور کو پورا کرلے کہ اپنے درجہ کے مناسب ایک ایسی جماعت میں جہاں مَلکیت ظاہر ہے شامل ہو سکے تو قبر کا زمانہ یہاں پر ختم ہو جائے گا۔

اب اس کے بعد ملکیت کی اجتماعی زندگی پر انانیت کا مدار ہو گا۔ جب یہ اپنے آپ کو "میں" تصور کرے گا تو اُس کے سامنے وہ گروپ آجائے گا جس کا یہ جزء ہے (یعنی مثلاً ملائکہ) اور اس جماعت کی ہستی کے اندر اپنے آپ کو مضمحل پائے گا یعنی اُس سے جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر آگے جو زندگی ہے وہ اس طرح اجتماعی طور پر بڑھتی چلی جائے گی۔ محشر میں ایک درجہ طے کرے گا۔ جنت میں یا جہنم میں جدھر جائے گا اُس کو جماعت کا ایک حصہ ہوکر رہنا پڑے گا۔ جس وقت تک وہ اپنا سرمایہ ملکیت کا جتنا اُسکے پاس ہے اُس کو سنبھال لے اور سمجھ جائے اور اس میں زیادتی سے قریب قریب مایوس ہوجائے اور وہ سمجھے کہ بس جو کچھ ہے یہی ہے۔ تو سمجھو کہ محشر کا دن قریب قریب ختم ہوگیا۔

اب یہاں سے نئی زندگی شروع ہوگی جس کا مدار ملکیت ہوگی اور حیوانیت کا ایسا ہی تھوڑا سا تعلق رہے گا مگر اُس کا سیدھا کوئی نام نہ ہوگا۔ اس نئی زندگی کی طبعی ترقی کا میدان جنت ہے۔ اس میں ترقی کے لیے جنت کا ایک ایک درجہ آئے گا اور جس طرح سیڑھی پر ایک ایک زینہ طے کرنا پڑتا ہے اسی طرح مدتوں تک جنت کا ایک طریقہ (درجہ) طے کرنا پڑے گا۔ اور یہ ترقی جس کے زمانہ کا اندازہ انسان اِس دنیا میں سمجھ نہیں سکتا، جاری رہے گی۔ بہت بڑے حکیم اس ترقی کے درجہ، انداز کو سمجھ لیں گے۔ مگر عام لوگوں کو بتلانا اور سمجھانا اُن کے واسطے ناممکن ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہے کہ اُن کے قریب درجہ والے جو لوگ ہیں (عارف الکامل و راسخ فی العلم) وہ اُن کو اشارۃً یا کنایتہً کچھ سمجھا سکیں۔ جن لوگوں کی طبیعت میں اتنا نصاب نہیں ہے کہ جس سے جنت کا دروازہ کھلتا ہے یعنی وہ اتنے نمبر حاصل نہیں کرتے کہ وہ پاس ہوجائیں اور اتنی ترقی آگے جاری رکھ سکیں، اُن کو ایک عرصہ تک اعراف میں رکھا جائے گا یعنی جو قابل غور ہیں کہ اُن کو موقع ملنا چاہیے کہ وہ جلدی سنبھل جائیں اور درست ہوجائیں۔ اور جو اس سے نیچے

ھیں وہ سب جہنم میں داخل ھو جائیں گے۔ وھاں اُن کے آپریشن ھوں گے۔ اُن کو داغ دیا جائے گا۔ وہ بہت تکلیف اُٹھائیں گے۔ تب کہیں اُن کے دماغ میں سمجھ کی بات پیدا ھوگی اور اِسی طرح وہ جہنم میں ترقی کرتے رھیں گے۔ یعنی وہ آھستہ آھستہ صحت کی طرف آتے جائیں گے۔

جنت کے داخلے کے لیے جو درجہ ھے اُس کو جو جماعت پورا کر لے گی وہ دوزخ سے نکال دی جائے گی۔ اِسی طرح ھوتے ھوتے ایک ایسا زمانہ آجائے گا کہ دوزخ میں ایک آدمی بھی نہیں رھے گا۔ اب دوزخ بالکل ختم کر دی جائے گی۔ اس لیے دوزخ کا وجود صرف اس لیے تھا کہ انسانیت کے نقائص یعنی جو بیماریاں ھیں اُن کی صحت اور تندرستی کے لیے یہ ایک موقعہ تھا مگر دنیاوی حساب سے (یعنی اس دنیا کے سالوں کے حساب سے) یہ وقت (جس میں کہ جنہم میں صحت اور تندرستی ھوسکے) کتنے سالوں میں ھوگا کہ جہنم آخر ختم ھو جائے، اس کا صحیح اندازہ لگانا آسان کام نہیں ھے۔ اس کے لیے بہت بڑا زمانہ ھے۔ سرسری طور پر کہا جا سکتا ھے کہ جب سے زمین و آسمان بنے اور پھر اُن کا نظام قیامت کے دن ٹوٹے تو جتنا زمانہ زمین و آسمان کا ھے اُتنا ھی زمانہ جہنم کی عمر کے لیے ضروری ھے۔ اس میں کسی قدر کمی بیشی ھو جائے تو وہ وقتی ضرورتوں کے مطابق ھوگی۔ تو اب شرائع الٰہیہ میں کسی انسان کو رحمتِ الٰہی سے مایوس نہیں کیا جاتا اگرچہ وہ جہنمی ھی ھو۔ مگر یہ بھی مقصود نہیں ھے کہ اُس کی مدت کو ھلکا دکھایا جائے۔ اور اِس طرح دنیا میں انسان کو اُس کی ترقی سے پیچھے ڈال دیا جائے۔ جہنم کی تکلیف کو جس قدر کم دکھایا جائے گا اُتنا ھی ادنیٰ طبیعت کے لوگ کم ترقی کریں گے اور یہ اُن پر ظلم ھوگا۔ اُن کو جہنم میں جو تکالیف پیش آئیں گی اُن کے متعلق صحیح علم دینا چاھیے تاکہ وہ اُن تکالیف سے بچنے کے لیے اِسی دنیا میں سامان مہیا کریں۔

جہنم کی تکلیفیں اس قسم کی ھیں جس طرح انسان کو دنیا میں پیش آتی ھیں:- جیسے مرض ھے، دشمن کا غلبہ ھے، ضرورت کے وقت سامان کا نہ ملنا ھے۔ غرض جس طرح اِس دنیا میں ضروریات ھیں وھاں بھی اس طرح ضرورتیں ھوں گی۔ فرق اتنا ھے کہ یہاں جس قدر تکالیف ھیں یہ تھوڑی محنت سے زائل ھوسکتی ھیں اور وھاں کی تکلیف زائل کرنے کے لیے بہت محنت اور لمبا زمانہ چاھیے۔ یہاں کی تکالیف عموماً حیوانیت سے تعلق رکھتی ھیں اور وھاں کی تکالیف عموماً ملکیت سے تعلق رکھتی ھیں۔

مثال کی طور پر لیجیے کہ ایک مٹی (پتھر) کا بت کس قدر زمانۂ دراز کے بعد ٹوٹتا ھے اور پھر وہ دریا میں گرتا ھے اور بذاتِ خود پانی میں تبدیل ھو جاتا ھے۔ پھر پانی بننے کے بعد وہ ھوا بنتا ھے۔ اور ھوا بننے کے بعد اس میں گیس وغیرہ کا

کوئی حصہ باقی رہ جاتا ہے جس میں نورانیت کی زیادہ قابلیت ہوتی ہے۔ پھر وہ آفتاب کے نور کی طرح بنتا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ آفتاب کے نور کو ملکیت کے نور تک پہنچنے کے لیے ایک لاکھ برس کی ضرورت ہے تو اس پتھر کو اس ملکیت تک پہنچنے کے لیے کتنا لمبا زمانہ درکار ہوگا۔ اسی طرح دوزخ کے زمانے کو کم کرکے دکھانا جرم کے مترادف ہوگا۔ البتہ جو لوگ اسے سمجھ ہی نہیں سکتے ان کو صرف اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ فقط دنیاوی مصیبتوں سے نجات حاصل کریں۔ اس واسطے ان کو دوزخ کا معاملہ بتلایا ہی نہیں جاتا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں آخرت کا بہت تھوڑا ذکر ہے اور جو کچھ ہے وہ دنیاوی مصیبتوں سے نجات حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں آخرت کا ذکر نسبتاً زیادہ ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی تعلیم میں سب سے زیادہ ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو بہت سے کام ایک تھوڑے سے وقت میں پورے کرنے تھے اس واسطے کام کرنے والی (کارکن) جماعت میں زیادہ قوت پیدا کرنے کا یہی ذریعہ تھا کہ اس جماعت کو تمام علم دے دیا جائے اور وہ انتہائی قوت سے کام کرنے لگ جائیں۔

قرآن مجید کی ایک صفت فصاحت اور بلاغت ہے۔ لوگوں نے عام طور پر اسے عربی زبان کی فصاحت اور بلاغت پر ڈھال لیا ہے۔ اور اس سے یہ دعویٰ ہونے لگا ہے کہ عربی زبان درحقیقت تمام زبانوں کی ماں ہے۔ اور دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر دوسری زبان سے اس کا مقابلہ کیا جائے جیسے سنسکرت یا عبرانی تو یہ دعویٰ اتنا روشن نہیں رہتا جتنا خالی عربی پڑھنے والوں کے دماغ میں قائم ہے۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عبرانی یا سنسکرت کا قطعاً مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو علم ہو جاتا کہ یہ زبانیں بھی کم نہیں ہیں) اس لیے ہم وضاحت اور بلاغت کا یہ مطلب نہیں لیتے۔

آخرت کے امور کو دنیاوی زبان میں بیان کرنا آسان بات نہیں۔ قرآن مجید نے اس میں اس قدر فصاحت استعمال کی ہے کہ جو بھی مطلب ہے وہ ٹھیک سمجھا دیتا ہے۔ اور انسانیت کے تمام طبقوں کے دماغ تک صحیح بات پہنچا دیتا ہے۔ طبقوں سے مراد ہیں اعلیٰ طبقہ، اوسط طبقہ، ادنیٰ طبقہ۔ اور یہ طبقے فقط محنت کے اعتبار سے پیدا ہوتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کو ذرا کم محنت کرنی پڑتی ہے۔ متوسط کو ان سے زیادہ اور ادنیٰ طبقے کو سب سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس محنت سے قطع نظر کرکے دیکھیں تو بات یکساں ہی نظر آئے گی اور یہ بلاغت کا صحیح درجہ ہے۔ قرآن مجید کی عربی

زبان بھی نہایت فصیح ہے یعنی دنیا کے باقی لٹریچر سے ممتاز ہے اور عربی زبان کی کوئی کتاب (نثر یا نظم) اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی - تو زبان دانی کے لحاظ سے ہم اس کو عربی لٹریچر میں اعلیٰ درجہ دیتے ہیں - اور آخرت کو دنیا بھر کی زبانیں (جیسے سنسکرت وغیرہ) اس قدر آسانی سے نہیں سمجھا سکتیں جس قدر آسانی سے قرآن مجید سمجھا دیتا ہے - اس میں قرآن مجید کا درجہ نہایت اعلیٰ ہے - ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب اس قدر فصاحت و بلاغت کے ساتھ لوگوں تک مسائل کو نہیں پنہچا سکتی -

ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ مسیحی دنیا نے کفارہ کا مسئلہ ایجاد کر دیا اور آخرت کے ذکر سے جو فوائد حاصل ہو سکتے تھے اس کی قوت کو کم کر دیا - اسی طرح مسلمانوں نے بھی شفاعت کے مسئلے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے قرآن کے ان بیانات سے جو افادہ حاصل ہو سکتا تھا اسے بہت کمزور کر دیا -

عام مسلمانوں میں قرآن مجید کی بنسبت علم حدیث کی زیادہ محبت ہے - وہ قرآن مجید میں تھوڑی سی توجہ عربی لٹریچر کے ذریعہ قائم کر سکے یعنی قران مجید کو تمام دنیا میں اعلیٰ درجہ کی ادبی کتاب ثابت کرنے میں مسلمان لگے رہے - اور اس سے جو مدعا اور مطلب و مقصد حاصل کرنا تھا ، اس کی طرف توجہ کم کردی - مسلمانوں میں ایک جملہ مشہور ہے کہ مسلمانوں کی آخری زمانہ کی مصیبتیں اس علاج سے دور ہوں گی جس سے پہلے زمانہ میں مسلمانوں نے ترقی کی تھی - اس کا درحقیقت مطلب تھا قرآن مجید کی طرف توجہ کرنا - مگر لوگوں نے اس کا مطلب بھی حدیث کی طرف توجہ کرنا لے لیا ہے -

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضہ کی خلافت شروع ہوئی - ابتدا میں عرب کی بغاوت عام کا مقابلہ کرنا پڑا - اس سے فارغ ہو کر روم اور ایران کی مہمیں شروع ہوگئیں اور ابو بکر رضہ کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی - حضرت عمرالفاروق رضہ نے سات برس خلافت کی اور ملک میں نہایت امن امان رہا - لیکن وہ دیدہ و دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے - علامہ ذہبی رحہ نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضہ اس خوف سے کہ حدیث بیان کرنے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط روایت منسوب نہ کردے صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے کہ حدیثیں کم بیان کریں - حضرت ابو ہریرہ رضہ سے ابو سلمہ صحابی نے پوچھا کہ آپ حضرت عمر رضہ کے زمانہ میں بھی اس طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے؟ بولے کہ نہیں ، اگر کرتا تو عمر رضہ "درے" مارتے - ایک دفعہ گروہ انصار کو کوفہ بھیجا اور چلتے وقت کہا کہ تم لوگ کوفہ جا رہے ہو ، وہاں ایک قوم سے ملوگے جو بڑی رقت سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ تمہارے

آنے کا حال سنکر شوق سے تمہیں ملنے آئیں گے اور حدیثیں سننی چاہیں گے تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا۔ اسی طرح جو جماعت عراق کو جانے والی تھی، اُن کی مشایعت کرکے فرمایا کہ میں نے کیوں تمہاری مشایعت کی؟ تو انہوں نے فرمایا تکرمۃ علینا (عزت افزائی کے لیے)۔ کہا ہاں لیکن مقصد اور بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جہاں تم جا رہے ہو وہاں لوگ اکثر قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو اُن کو حدیثوں میں نہ پھنسانا۔ چنانچہ وہ جماعت جب عراق کو گئی تو لوگ حدیثیں سننے آئے لیکن اُنہیں جماعت نے اس بنا پر انکار کردیا کہ عمرؓ نے منع کیا ہے۔

اُمور آخرت کے سمجھنے کے لیے قوی فلسفی دماغ چاہیے۔ معلوم نہیں، کیوں مسلمانوں کے عام دماغ کسی منظم عملی نظریہ کی طرف کم توجہ ہوتے ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ مخالف لوگوں کے پروپیگنڈے نے مسلمانوں پر بہت برا اثر کیا۔ اُنہوں نے مسلمانوں کو بےوقوف بنانا شروع کیا، اور یہ بےوقوف بن گئے۔ اِس کے علاوہ اس خیال نے بھی مسلمانوں کو بےوقوف بنا دیا ہے کہ صوفی منش لوگوں کے ایک طبقہ نے یہ زور سے کہنا شروع کردیا ہے کہ دنیا اور آخرت کو اکٹھا حاصل نہیں کیا جا سکتا یعنی اگر مسلمان آخرت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ دنیا چھوڑ دیں۔ اس فکر کے غلبہ نے مسلمانوں کو عقلی منظم کاموں میں دخل دینے سے پیچھے ڈال دیا۔ حالانکہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین جس قدر زاہد منش لوگ تھے (اُن کے حالات کتب تاریخ میں ظاہر ہیں) وہ دنیا کے کاموں میں بھی سب سے آگے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک صوفی منش آدمی تھے مگر اپنی بڑی تجارت رکھتے تھے اور اُس سے محدثین اور فقراء و مساکین کی خدمت کیا کرتے تھے (اس کی اگر تفصیل دیکھنی ہے تو کتاب سیرۃ النعمان مصنفہ علامہ شبلی دیکھ لو).

شاہ ولی اللہ کا فلسفہ پڑھنے سے ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ یہ دونوں پروپیگنڈے غلط ہیں یعنی (۱) مخالف لوگوں کا پروپیگنڈا اور (۲) صوفی منش لوگوں کا یہ کہنا کہ دنیا اور آخرت کو اکٹھا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسلام میں حکمت جاننے والے لوگوں کا مقابلہ دنیا کی دوسری قومیں آسانی سے نہیں کر سکتیں۔ اس لیے مسلمان حکیم کا پہلا فرض یہ ہے کہ قرآن میں آخرت کے متعلق جس قدر باتیں بیان کی گئی ہیں اُن کو منظم کر لے. اس سے اُس کا دماغ اتنا اونچا ہو جاتا ہے کہ دوسری قومیں آسانی سے وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں.

آیت (۱ تا ۵) اذالسماء انشقت و اذنت لربها و حقت الایات :- قیامت کے واقعہ کو ایک عجیب صورت میں پیش کیا گیا ہے :- (۱) آسمان چیرجائے گا (۲) اب چیر جانے کے بعد یعنی آسمان کی موجودہ صورت ٹوٹ پھوٹ جانے کے بعد اسے کون سی

دوسری صورت دی جائے گی؟ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا منتظر ہوگا (۳) زمین اس کے متعلق ایک قسم کا بڑا تختہ بن جائے گی (۴) زمین کے اندر انسان اور حیوان جو بھی موجود ہیں زمین ان تمام کو باہر نکال دے گی اور خالی ہو جائے گی (۵) اور جب اس میں تبدیلی آجائے گی تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی منتظر ہوگی کہ آیے (زمین) کو اب کونسی صورت و شکل دی جائے گی۔

آیت (۶) یایها الانسان انك كادح الایه :- جب زمین و آسمان پر یہ حالت طاری ہوگی تو اس وقت انسان کا کیا حشر ہوگا؟ اس واسطے انسان کو کہا گیا کہ ای انسان! تو ٹھوکریں کھائے کھائے اللہ سے ضرور ملے گا۔ اور اس سے تجھ کو کوئی چیز نہیں روک سکے گی۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے رب تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بیچ میں خواہ لاکھوں ٹھوکریں کھائے، اس کا مضائقہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی ہستی میں ایک نورانی جوہر ہے۔ وہ اسے حظیرۃ القدس کی طرف اس طرح کھینچ کر لے جاتا ہے جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف جاتا ہے۔ انسان کو حظیرۃ القدس میں الٰہی تجلی کے روبرو پہنچنا ضروری ہے۔ وہاں پہنچنا تو اس کی کشش کا نتیجہ ہے اور یہ وہاں جبراً ہوگا۔ اب اگر انسان اپنی فطرت کو اس طرف جانے کے لیے تیار کر لے تو یہ کسی قسم کی ٹھوکریں نہیں کھائے گا، اور آرام سے اپنے راستے پر چلتا چلتا پہنچ جائے گا۔ اور اگر اس طرف چلنے سے اپنی فطرت کو الٹا کر لے اور منہ پھیر لے تو اس صورت میں بھی اسے حظیرۃ القدس کی طرف جانا پڑے گا۔ مگر مشکل یہ ہوگی کہ چونکہ یہ الٹے پانو جا رہا ہے اس واسطے اس طرف راستے میں جہاں کہیں گڑھا آئے گا، یہ دھڑام سے گر پڑے گا۔

آیت (۷ تا ۹) فاما من كتابه بيمينه :- جس کسی نے اپنی طبیعت کو حظیرۃ القدس کی طرف جانے کے لیے آمادہ کرلیا اور اپنی طبیعت کو تجلی الٰہی کے روبرو ہونے کے لیے مشتاق بنالیا * اس کے حساب کا کاغذ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا (آیت ۸) اس کا حساب آسان ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سیدھے راستہ پر جا رہا ہے اس واسطے اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی (آیت ۹) اور وہ اپنے گھر میں مسرت سے پہنچ جائے گا۔ غرض اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ نیک لوگ تب ہی اپنی نیکی سے فائدہ اٹھائیں گے جب وہ اپنی سوسائٹی کو درست کر رکھیں۔ یہ دونوں (یہ اور اس کے خاندان کے لوگ)

---

* یعنی نوع انسان کے اکثر افراد اگر مذہبی ہوتے تو انکو اللہ تعالیٰ کے ملنے کی خواہش ہوتی اور وہ اس کے لیے تکالیف برداشت کرتے۔ ان کی یہ کوشش ضرور کامیاب ہوگی۔

اپنی نیکی سے اس راستہ پر آسانی سے پہنچ جائیں گے ۔ کیوں کہ انسان اپنی سوسائٹی کا اثر بہت جلد قبول کرلیتا ھے ۔

آیت (١٠) **واما من اوتی کتابه وراء ظهره** :- اب دوسری جماعت کا ذکر ھے جن کا نامۂ اعمال پیٹھ کے پیچھے سے دیا گیا ھے ۔ اس جماعت کا نامۂ اعمال اسے جس طرف کو کھینچتا ھے اس نے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار نہیں کیا (یعنی حظیرة القدس کی طرف) یہ اُلٹے پاؤں جہنم کو پہنچ رہا ھے ۔

نامۂ اعمال کے لکھے جانے اور ان کے تولے جانے کے متعلق دو مختلف رائیں ھیں (١) متکلمین کا مذھب یہ ھے کہ فی الواقع نامۂ اعمال تو لے جائیں گے اور اس سے غرض یہ ھوگی کہ قیامت میں تمام حاضرین پر یہ آشکارا ھو جائے کہ فلاں شخص کے اعمال اچھے ھیں اور فلاں شخص کے برے (٢) حکماء اسلام کی رائے یہ ھے کہ انسان جب کوئی اچھا کام کرتا ھے یا برا کام کرتا ھے تو اس کے دل پر ایک خاص اثر پیدا ھوتا ھے اور جس قدر یہ افعال مکرر سرزد ھوتے ھیں اس اثر کا نقش گہرا ھوتا جاتا ھے ۔ یہاں تک کہ دل میں نیکی یا برائی کا ایک ملکۂ راسخ پیدا ھو جاتا ھے ۔ اسی کا نام کتابت اعمال ھے ۔ اور چونکہ ھر فعل کچھ نہ کچھ اثر پیدا کرتا ھے اس لیے ھر فعل گویا ایک نقش اور تحریر ھے ۔ عمل اور وزن تب ھوگا جب نیت اور ارادہ سے ھو ۔

آیت (١١) **فسوف یدعو** :- تو وہ اس طرح کے جانے کی نسبت موت کو ترجیح دے گا ۔

آیت (١٢) **ویصلیٰ سعیراً** :- اور آگ کے گڑھے میں گر پڑے گا ۔

آیت (١٣) **انه کان فی اهله مسروراً** :- اس آدمی نے غلط راستہ پر چل کر دنیا میں عارضی مسرت حاصل کرلی تھی ۔ اس نے اپنے بال بچوں کو بھی اسی غلط رستہ پر چلایا ۔

آیت (١٤ و ١٥) **انه ظن ان لن یحور** :- یہ سرمایہ پرست آدمی ھے ۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اس طرح ترقی کرتا جائے گا مگر اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ھے اور اسے علم نہیں ھے کہ ظلم کی بنیاد پر جو ترقی ھوگی وہ کبھی نہیں پھولے پھلے گی

(اب اگلی حرکت کا نقشہ دیا جاتا ھے)

آیت (١٦) **فلا اقسم بالشفق** :- دن کی روشنی کا بقیہ ھے جسے شفق کہا گیا ھے ۔ موت کے بعد پہلا طبقہ ایسا ھے جس میں اس دنیا کی زندگی کا بقیہ ابھی ساتھ ھی چلا جارھا ھے ۔ انسان اس دنیا کے اثرات کو یک لخت نہیں چھوڑ سکتا ، بلکہ درجہ بدرجہ چھوڑتا چلا جائے گا ۔ اس حصہ کو اصطلاح میں عالم قبر کہا جاتا ھے ۔

واللیل و ما وسق :- ایک طبقہ ایسا ھے کہ اُس سے دنیا کے اثرات دور ھوگئے جیسے شفق کے بعد رات آتی ھے اس کو اصطلاح میں عالم محشر کہا جاتا ھے۔

والقمر اذا اتسق :- اندھیری رات کے بعد چاند کی روشنی درجہ وار شروع ھوتی ھے (القمر کہتے ھیں اول دس تاریخ تک) یعنی آج ماہ (چاند) ھلال ھے۔ کل اس سے زیادہ بڑھے گا حتیٰ کہ یہ چودھویں کا چاند ھو جائے گا۔ غرض اسی طرح درجہ وار بڑھتا ھے۔ تو اس واسطے تجلی اعظم کا آنا ھے۔

آیت (۱۹) **لتر کبن طبقاً عن طبق** :- یہ تینوں چیزیں (آیت ۱۶ تا ۱۸) گواہ ھیں کہ انسان بھی اس طرح درجہ وار ترقی کرے گا یہاں تک کہ انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے گا۔ بس یہی ھے انسانی فطرت۔

آیت (۲۰) **فمالھم لا یومنون** :- یہ لوگ اپنی فطرت پر زور دے کر ان باتوں کو کیوں نہیں مان لیتے۔

آیت (۲۱) **و اذا قرء علیھم القرآن** :- اگر انسان کی فطرت اُن کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ھے تو جب اُن پر قرآن شریف پڑھا جاتا ھے تو یہ اُس کی کیوں نہیں اطاعت کرتے؟ اگر یہ قرآن مجید کو سمجھنے لگیں گے تو اُن کو تمام بات سمجھ میں آجائے گی۔

آیت (۲۲) **بل الذین کفروا** :- غرض اس طرح انسانیت دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ ایسا ھے کہ وہ نہ تو اپنی فطرت پر غور کرتا ھے اور نہ قرآن مجید سنتا ھے بلکہ وہ اس کی تکذیب کرتا ھے۔ یہ طبقہ ری ایکشنری (Reactionary) ھے۔

آیت (۲۳) **واللہ اعلم بمایوعون** :- وہ نورانی جوھر ھے جو اُن کے اندر رکھا گیا ھے۔ اللہ تعالیٰ اسے بخوبی جانتا ھے۔ بھلا اُن کے انکار کرنے سے کیا ھوتا ھے!۔ انہیں جھک مار کر اس طرف جانا پڑے گا۔ اس کے وعاء میں جو نورانی روح ھے اللہ تعالیٰ اُس کو خوب جانتا ھے۔ اس نورانی چیز کو ضائع کرنے سے جو مضرات آئیں گے اُن کو بھگتنا پڑے گا۔

آیت (۲۴) **فبشر ھم بعذاب الیم** :- اس طرح تجھ، کو بہت تکلیف ھوگی۔ عذاب الیم سے گزر کر اُن کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنا پڑے گا۔ ھمارے واعظوں نے یہ غفلت برتی ھے کہ اُنھوں نے جہنم کی زندگی کو عذاب کی تفصیلات پر ختم کردیا ھے۔ اور اس طرح حکیم طبیعتوں کو قرآن مجید کی تعلیم سے دور ڈال دیا ھے۔ غرض اِس آیت میں اس طبقہ کا ذکر ھے جو نہ فطرت پر غور کرتا ھے اور نہ قرآن مجید کو غور سے سنتا ھے۔

آیت (۲۵) **الا الذین آمنوا** :- اب اس طبقہ کا ذکر ھے جو فطرت پر غور کرتا

ہے اور قرآن کو سنتا ہے۔ اُن کے لیے مزدوری ہے بے انتہا۔

اب صاف مسئلہ یہ ہے کہ انسانی فطرت راستہ میں کہیں گم ہونے والی نہیں ہے۔ مگر ان باریک حقیقتوں کو عام ذہنیت کے نزدیک کرنے کے لیے اس طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اب تیسرے درجہ کے عالم ان الفاظ کا صرف ترجمہ کردیں گے اور حکمت کی بات کو تو زبان سے کہہ دیں گے۔ مگر نہ خود سمجھیں گے اور نہ کسی کو سمجھا سکیں گے۔ اور نہ حکماء کو غور کرنے دیتے ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم اس قسم کے علماء میں محصور نہیں ہے۔ حکمت سکھانے کی یہ سب سے اولی درجہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ دوسری کتابیں تو حکماء کا ایک خاص طبقہ پیدا کر دیتی ہیں لیکن اگر قرآن مجید کی تعلیم باقاعدہ رکھی جائے تو تمام نوع انسانی کے واسطے مفید ہے اور قرآن شریف کے سمجھنے کے لیے شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا اور اُن کی جماعت کا فلسفہ سمجھنا اس زمانے میں ضروری ہے۔

سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَعِشْرُوْنَ آيَةً

سورہ بروج مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بائیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۱) وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ (۲) وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ (۳)

قسم ہے آسمان کی جس میں برج ہیں اور اُس دن کی جس کا وعدہ ہے اور اُس دن کی جو حاضر ہوتا ہے اور اُس کی کہ جس

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (۴) النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ (۵) اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ (۶)

کے پاس حاضر ہوتے ہیں مارے گئے گھاٹیاں کھودنے والے آگ ہے بہت ایندھن والی جب وہ اُس پر بیٹھے

وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ (۷) وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ

اور جو کچھ وہ کرتے مسلمانوں کے ساتھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اُن سے بدلہ نہ لیتے تھے مگر اس بات

يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (۸) الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ

کا کہ وہ یقین لائے اللہ پر جو زبردست ہے تعریفوں والا جس کا راج ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۹) اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ

کے سامنے ہے ہر چیز، تحقیق جو دین سے بچلائے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو پھر

يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ (۱۰) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

توبہ نہ کی تو اُن کے لیے عذاب ہے دوزخ کا اور اُن کی لیے عذاب ہے آگ لگنے کا بیشک جو لوگ یقین لائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ البروج مکیۃ

(آیت ۱ و ۲ دیکھو آیت ۱۰ کے بعد)

آیت (۳) و شاھد و مشھود :۔ اور شاھد و مشھود کو گواہ بتائے ھیں۔ آگے شاھد و مشھود کی توضیح آتی ہے۔

آیت (۴ تا ۷) قتل اصحاب الاخدود :۔ ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ یمن میں ایک خدا پرست قوم تھی۔ اتفاقاً ایک مخالف بادشاہ یمن پر حاکم ھو گیا۔ اُس نے خدا پرستوں کے طریقۂ عبادت کو بند کر کے اپنا طریقۂ عبادت رائج کرنا چاھا۔ مگر یہ خدا پرست جماعت اس پر راضی نہ ھوئی۔ اس واسطے اُس نے اُن کو خندق میں جلا دیا۔ مومنین یعنی خدا پرست لوگ جو جلائے جا رہے ھیں یہی مشھود (آیت ۳) ھیں اور اُن کو جلانے والے شاھد ھیں (یعنی حاضر کیے ھوئے) اور حاضر کرنے والے یا دیکھنے والے جن کو دیکھ رہے ھیں وہ مشھود ھیں۔

آیت (۸ و ۹) و ما نقموا منھم الآیہ :۔ اُن کا جرم یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے جو زمین و آسمان کا بادشاہ ہے اور اُس بادشاہ کی حمد گاتے تھے۔ اس ظالم بادشاہ نے اُن خدا پرستوں کو اس جرم میں جلا دیا کہ وہ خدا کو مانتے تھے۔

یہ چیز قیامت ھونے کا باعث بن جائے گی کہ جب دنیا میں ایسے واقعات ھوتے رھتے ھیں کہ لوگ خدا پرستوں کو آگ میں جلا دیتے ھیں تو اس کا بدلہ اُن کو ضرور ملے گا کہ جو لوگ اس طرح مومنوں کو جلاتے ھیں اُن کو بھی جلایا جائے گا۔

آیت (۱۰) اِن الذین فتنو المؤمنین الآیہ :۔ شاھد اور مشھود اِس بات پر گواہ ھیں کہ جن لوگوں نے خدا پرستوں کو جلا دیا، اُن کو بھی جلا دیا جائے گا۔ یہ ہے جواب قسم کہ قسم اِس واسطے کھائی جا رھی ہے۔

آیت (۱ و ۲) والسماء ذات البروج والیوم الموعود :۔ آیت ۳ میں قسم کھائی گئی ہے۔ اب آیات ۲ و ۱ میں آیت ۳ سے پہلے دو قسمیں ھیں۔ اب اُن کی کیفیت بتلائی جا رھی ہے :۔ (۱) بروج کا ترجمہ اصطلاحی طور پر ۱۲ برج کا ہے۔ مگر اس

وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۵ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ

اور کیں اُنہوں نے بھلائیاں اُن کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں یہ ہے بڑی مراد

الْكَبِيْرُ (۱۱)ؕ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۱۲)ؕ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ (۱۳)ۚ

ملنی، بیشک تیرے رب کی پکڑ سخت ہے، بیشک وہی کرتا ہے پہلی مرتبہ اور دوسری

وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ (۱۴)ۙ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ (۱۵)ۙ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۶)ؕ

اور وہی ہے بخشنے والا محبت کرنے والا مالک عرش کا بڑی شان والا کر ڈالنے والا جو چاہے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ (۱۷)ۙ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ (۱۸)ؕ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

کیا پہنچی تجھ کو بات اُن لشکروں کی فرعون اور ثمود کے کوئی نہیں بلکہ منکر

فِيْ تَكْذِيْبٍ (۱۹)ۙ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ (۲۰)ۚؕ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ (۲۱)ۙ

جھٹلاتے ہیں اور اللہ نے اُن کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے کوئی نہیں یہ قرآن ہے بڑی شان کا

۱ ع ۱۰

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۲۲)ع

لکھا ہوا لوح محفوظ میں.

جگہ آسمان کے ۱۲ برج مراد نہیں ہیں۔ یہ جو علم ہیئت کی اصطلاح ہے کہ آسمان کے ۱۲ برج (حصے) بنا کر آسمان کے ۱۲ حصے کیے گئے ہیں اُن کو اہل عرب نہیں جانتے۔ بروج کے معنی ہیں ظاہر ہونے والی چیز۔ ہر ستارہ ظاہر ہونے والی چیز ہے۔ اس واسطے آیت کا ترجمہ ہوگا:۔ ستاروں بھرے آسمان کی قسم۔ وہ قوم جنہوں نے ان خدا پرستوں کو جلا دیا تھا وہ غالباً ستارہ پرست تھے۔ اہل ایران اگرچہ آتش پرست تھے مگر اُن کے فرقے ستارہ پرست بھی تھے اور تاریخی طور پر ثبوت ملتا ہے کہ بارہا ان کا قبضہ یمن کے ملک پر ہوا، حتیٰ کہ جس وقت اسلام آیا اُس وقت بھی یمن کا حاکم ایرانی وائسرائے تھا۔

نجوم کے ماننے والے لوگ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اگر ستاروں کی وضع

ایسی واقع ہو جو ایک قوم کے لیے مضر پڑے کہ وہ جلانے کا باعث ہوئی تو اس کا ردّ عمل ضروری ہے۔ پھر ستاروں کی ایک ایسی وضع بنے گی کہ جلانے والوں کی (جنھوں نے جلایا) نسل کو وہ ضرور جلا دے گی۔

غرض والسماء ذات البروج :۔ بھی اس بات پر گواہ ہے کہ جن لوگوں نے ان خدا پرستوں کو جلایا ہے وہ بھی ضرور جلائے جائیں گے۔

آیت (۲) والیوم الموعود :۔ اور کتب الہیہ کو ماننے والے (توریت و انجیل) جو قیامت اور یوم الموعود کو ماننے والے ہیں وہ بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ جن لوگوں نے ان خدا پرستوں کو جلا دیا، وہ بھی ایک دن اسی طرح جلائے جائیں گے۔

(آیت ۳ تا ۱۰ دیکھو شروع سورت میں)

آیت (۱۱) ان الذین آمنو و عملوا :۔ جو لوگ جلائے گئے اور انھوں نے اس قدر استقامت دکھلائی اور ثابت قدم رہے ان کے لیے جنت ہے اور یہ بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس آیت (۱۵) کو آیت (۱۰) کے ساتھ ملا دینا چاہیے تاکہ یہ دونوں آیات جواب قسم بن جائیں۔

(آیت ۱۲ تا ۲۰ دیکھو آیت ۲۱ و ۲۲ کے بعد)

آیت (۲۱ و ۲۲) بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ :۔ جو حکم آیت (۱۰) و (۱۱) میں دیا گیا ہے وہی حکم قرآن مجید میں ہے جو (آیت ۲۲) محفوظ ہے۔ غرض یہ سورت نوع انسانی کی بد امنی سے قیامت پر استدلال بنے گی۔

آیت (۱۲ تا ۱۶) (اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے) ان بطش ربک لشدید انه هو یبدء و یعید ۔ الی قوله تعالیٰ۔ فعال لما یرید :۔ ان آیات میں اسماء الٰہی کا ذکر ہے اور مختلف اسماء کے اثر ظاہر ہونے کے لیے دنیا میں مختلف چیزیں وقوع پزیر ہوتی ہیں۔

آیت (۱۲) ان بطش الآیہ :۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نام لینے والوں کو محض اس وجہ سے تکلیف دیتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتے ہیں ان پر تیرے رب کا حملہ بہت سخت ہے۔

آیت (۱۳) انه هو یبدء الآیہ :۔ وہ نیا (پہلی دفعہ) اور دوبارہ پیدا کر سکتا ہے اب اگر ظالموں کو سزا دینے کے لیے دوبارہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے تو وہ ان کو دوبارہ پیدا کردے گا۔ اُس کے لیے یہ مشکل نہیں ہے۔

آیت (۱۴) وھو الغفور الآیہ :۔ اگر انسان جرم کر کے اُس سے معافی مانگے تو وہ بخش دیتا ہے اور اُس انسان کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا ہے۔

آیت (۱۵) ذو العرش المجید :۔ اللہ تعالیٰ بڑی عزت والے تخت کا مالک ہے

یعنی اس کی حکومت میں ظلم کی کہیں بھی گنجائش نہیں ہے۔

آیت (۱۶) فعال لما یرید:۔ اس کے تمام کام اور اس کا ارادہ حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کو دنیا میں فوراً جزا مل جاتی ہے اور بعض کو آخرت (قیامت) تک تاخیر ہو جاتی ہے۔ اور ان کو دوبارہ پیدا کر کے سزا دی جائے گی۔ اس میں مختلف آدمیوں کی آمیزش کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو آج سزا دی جائے تو اس کے ساتھ بعض بے گناہ بھی سزا پاجائیں گے۔ اس واسطے ان کی سزا مؤخر ہو جاتی ہے جب تک کہ بے گناہ آدمی ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں۔

آیت (۱۷ و ۱۸) ھل اتاک حدیث الجنود:۔ اگر کوئی آدمی اس خیال سے طاقت پیدا کر لے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کر لے گا تو یہ باطل خیال ہے۔ اس واسطے مثال کے طور پر کہا کہ دیکھو فرعون اور ثمود کی بڑی بڑی جماعتیں کس طرح ہلاک کر دی گئیں۔

آیت (۱۹) بل الذین کفروا الآیہ:۔ جاہل لوگ اس جزا کے نظام کا انکار کرتے ہیں۔

آیت (۲۰) واللہ من ورائھم محیط:۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو گھیرے ہوئے ہے اور وہ کسی طرف نکل نہیں سکتے۔ غرض ان کو سزا کا ملنا ضروری ہے۔

آیت (۲۱ و ۲۲) بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ:۔ اور یہ قانون اٹل ہے کس جبر اور زور سے ٹل نہیں سکتا۔ بڑی عزت والا قانون، جو ان کو بڑی عزت سے پڑھتے ہیں۔ اور یہ قانون پختہ اور مضبوط بورڈ (محفوظ) پر لکھا ہوا ہے کہ کوئی طاقت اسکو میٹ نہیں سکتی اور نہ بدل سکتی ہے۔ ان کے خلاف چلنے والے ذلیل اور برباد ہو جائیں گے۔

سورة الطارق مكية وهى سبع عشرة آية

سورہ طارق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سترہ آیتیں ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (۱) وَ مَا آدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ (۲) النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۳)

قسم ہے آسمان اور کی اندھیرے میں آنے والے کی اور تونے کیا سمجھا کیا ہے اندھیرے میں آنے والا وہ تارا چمکدار

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۴) فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ (۵) خُلِقَ

کوئی جی نہیں جس پر نہیں ایک نگہبان اب دیکھ لے آدمی کہ کا ہے سے بنا ہے

مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ (۶) يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ (۷) اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ

بنا ہے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے جو نکلتا ہے پیٹھ کے بیچ سے اور چھاتی کے بیچ سے بیشک وہ اس کو پھیر

لَقَادِرٌ (۸) يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۹) فَمَالَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ (۱۰) وَالسَّمَآءِ

لا سکتا ہے جس دن جانچے جائیں بھید تو کچھ نہ ہوگا اس کو زور اور نہ کوئی مدد کرنے والا قسم ہے آسمان

ذَاتِ الرَّجْعِ (۱۱) وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ (۱۲) اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ (۱۳) وَ مَا

چکر مارنے والے کی اور زمین پھوٹ نکلنے والی کی بیشک یہ بات ہے دو ٹوک اور نہیں

هُوَ بِالْهَزْلِ (۱۴) اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا (۱۵) وَّ اَكِيْدُ كَيْدًا (۱۶) فَمَهِّلِ

یہ بات ہنسی کی البتہ وہ لگے ہوئے ہیں ایک داؤ کرنے میں اور میں لگا ہوا ہوں ایک داؤ کرنے میں سو ڈھیل دے

۱ ع ۱۱ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا (۱۷)

منکروں کو، ڈھیل دے ان کو تھوڑے دنوں.

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥

سورة الطارق مكية

قرآن مجید میں یہ ذکر بار بار آتا ہے کہ انسان کو قیامت کے دن دوبارہ پیدا کیا جائے گا ۔ یہ سورت اِسی مسئلہ پر روشنی ڈالنے والی ہے ۔

آیت (۱) والسماء والطارق :- آسمان اور روشن ستارہ گواہ ہے ۔

آیت (۲ و ۳) وما ادراک ما الطارق النجم الثاقب * :- اس آیت میں طارق کا ترجمہ خود قرآن مجید نے کردیا کہ وہ روشن ستارہ ہے (جو رات کے پہلے حصہ میں مشرق کی طرف سے عموماً نکلتا ہے) یا سورج ہے ۔

آیت (۴) ان کل نفس الایہ :- یہ دونوں اس بات کے گواہ ہیں کہ ہر انسان کے اوپر ایک محافظ طاقت ہے - جس طرح چمکنے والا ستارہ اپنی روشنی کو اپنے ساتھ ہمیشہ محفوظ رکھتا ہے اور ستارہ کے غروب (دن کے وقت) ہوجانے سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ستارے کی روشنی غائب ہوگئی بلکہ وہ دوسری شام کو اپنی تمام روشنی سے دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے - اسی طرح انسانی روح سونے کے بعد انسانی نظروں سے غائب ہو جاتی ہے - مگر اس کے سمجھانے والی طاقت اور نگھبانی کرنے والی قوت آسمان میں محفوظ ہے اس واسطے وہ مرنے والی روح ضائع نہیں ہوتی بلکہ محفوظ رہتی ہے ۔

آیت (۵) فلینظر الانسان :- اب باقی رہا انسان کا جسم - اس کے واسطے انسان کو پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ انسان خود کس طرح پیدا ہوا ؟

آیت (۶ و ۷) خلق من ماء دافق یخرج من بین الصلب والترائب :- ایک کودنے والے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور بین الصلب والترائب کا ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ مرد کی پشت اور عورت کے سینہ سے جو منی نکلتی ہے ۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ مرد کی پشت اور سینہ سے اور عورت کی پشت اور سینہ سے یہ منی نکلتی ہے (یعنی منی مرد اور عورت دونوں کی پشت اور سینہ کے اندر سے نکل رہی ہے) یہ دوسرا ترجمہ آج کل کی سائنس کے زیادہ قریب ہوگا - اس میں شک نہیں کہ اس دوسرے ترجمہ کا رواج

---

* النجم الثاقب سے بعض مفسرین مراد سورج لیتے ہیں کہ وہ لوگوں کو جگاتا ہے نیند سے ۔

سب سے پہلے مولوی نورالدین نے دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ترجمہ دوسرے تفسیروں میں پہلے ہی سے موجود ہے ۔

آیت (۸) انہ علی رجعہ لقادر :- جس طرح انسان کا بدن پانی سے پیدا ہوا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرسکتا ہے ۔ وہ ایسی تمام قوتیں جمع کردے جو نطفہ میں تھیں تو انسان پھر پہلی کی طرح پیدا ہوجائے گا۔

آیت (۹ و ۱۰) یوم تبلی السرائر الایۃ :- جب مخفی قوتوں، کو ظاہر کردیا جائے گا تو اُن کو چھپانے کے لیے کسی کی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ پہلی زندگی (دنیاوی) اور آخروی زندگی میں یہ فرق ہوگا کہ انسان پہلے جو کچھ کر چکا ہے (اعمال) اس میں اب آخروی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ بات کہ اللہ تعالیٰ (آیت ۶) انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اِسے آیت (۱۳ و ۱۴) میں کہا گیا ہے کہ یہ قطعی طور پر طے شدہ بات ہے اور یہ مذاق نہیں ہے انہ لقول فصل و ماھو بالھزل ، یہی فیصلہ شدہ بات ہے اور مسخرگی نہیں کیونکہ وہ ضرور دوبارہ پیدا کردیا جائے گا۔

آیت (۱۱ و ۱۲) و السماء ذات الرجع و الارض ذات الصدع :- قطعی طور پر ہونے کے لیے شہادت پیش کی گیی ہے کہ یہ ضروز دوبارہ پیدا ہوگا۔ آیت (۱۱) والسماء ذات الرجع سے باربار روشن کرنے والا آسمان مراد ہے۔ و لارض ذات الصدع سے فصل پیدا کرنے والی زمین مراد ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو بنایا وہ پھر ایسی بارش کردے گا کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرلے۔ اس واسطے اب اس میں کس بات کا تردد ہے؟ اس میں ایک بات بہت ضروری ہے کہ جو چیز دوبارہ بنتی ہے وہ پہلی چیز یعنی اصلی چیز نہیں ہوتی بلکہ وہ پہلی چیز کی مثل ہے۔ اِس طرح قیامت کے دن انسان کو جو دوبارہ جسم دیا جائے گا وہ اس دنیاوی جسم کا اصل جسم نہیں ہوگا بلکہ اُس کی مثل ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہہ نہیں ہے۔

آیت (۱۵) انھم یکیدون الایۃ :- یہ لوگ خاص قسم کی تدبیریں کرتے ہیں یعنی مسئلہ قیامت کو مشکوک بنانے کے لیے نئے نئے شبہات کھڑے کرتے ہیں۔

آیت (۱۶) و اکید کیدا :- اور اللہ تعالیٰ بھی اُن کے مقابلے میں نئے تدبیر کردیتا ہے کہ اُن کے تمام شبہات کو دور کرنے کے لیے قرآن مجید میں ایک نئی سورت نازل کردی جاتی ہے تا کہ اُن کے ہرقسم کے شبہات دور ہو سکیں۔

آیت (۱۷) فمھل الکافرین الایۃ :- ظاہر میں یہ پوزیشن تکلیف دہ ہے۔ اس واسطے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے کہ تم اُس کو برا مت مناؤ ، اُن کو

مہلت دیتے جاؤ ایک زمانہ تک جہاں تک یہ چاہیں۔ انہیں شبہات دور کرنے کے لیے مہلت دیتے جاؤ تا کہ یہ اپنے شبہات دور کر سکیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس قدر اِس مسئلہ کے پہلو پر قرآن مجید میں بحث ہوگی اسی قدر یہ مسئلہ واضح اور مکمل ہوتا جائے گا۔ اگر ان کافروں کو اس کے باوجود ہدایت نہ ہو تو اس کی کوئی پروا نہیں ہے مگر بعد میں آنے والی قوموں کے لیے قرآن مجید کی رہنمائی مکمل ہو جائے گی۔

اب اگلی (۹) سورتوں میں اقرء باسم ربک تک انسانیت پر بحث ہے۔ انسانیت کے جو طبعی تقاضے ہیں اُن کو واضح کردیا جائے گا۔ اس کے بعد میں یعنی اقرء باسم ربک سے قرآن مجید کے آخر تک کی سورتوں میں قرآن مجید کا لب لباب یعنی خلاصہ بتلادیا گیا ہے۔ اور اُن سورتوں میں نتیجہ کا اظہار ہوگا۔

سُورۃ الاعلیٰ مکیۃ وھی تسع عشرۃ آیۃ

سورہ اعلیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی اُنیس آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی ﴿۱﴾ الَّذِیۡ خَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۲﴾ وَالَّذِیۡ قَدَّرَ

پاکی بیان کر اپنے رب کی جو سب سے اوپر جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا اور جس نے ٹھہرا دیا

فَھَدٰی ﴿۳﴾ وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی ﴿۴﴾ فَجَعَلَہٗ غُثَآءً اَحۡوٰی ﴿۵﴾ سَنُقۡرِئُکَ

پھر راہ بتلائی اور جس نے نکالا چارا پھر کرڈالا اُس کو کوڑا سیاہ البتہ ہم پڑھائیں گے تجھ کو

بسم اللہ الرحمان الرحیم ○

سورۃ الاعلی مکیۃ

تمام ادیان اور تمام شریعتوں کی حکمت اس وقت تک واضح نہیں ہوتی جب تک کہ انسانی نوع کے خواص پر اور اس کے طبعی تقاضوں پر پوری نظر نہ ڈال لی جے یہ علم شریعت در حقیقت انسانی تقاضوں کی تکمیل کی ایک صورت ہوتی ہے ۔ اب اس سورت میں اس کو پیش نظر رکھ کر تمام شریعتوں کی حکمت واضح کردی گئی ہے .

انسان کو جو انعامات ملے ۔ اگر جسمانی ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کے اسم عظیم کا فیض سمجھنا چاہیے اور اگر علمی اور روحانی ہیں تو انہیں اسم اعلیٰ کا اثر ماننا چاہیے جسمانی انعامات سورۃالواقعہ میں ذکر ہو چکے ہیں ۔ وہاں ہے **فسبح باسم ربک العظیم** تو یہ جسمانی فیض ، اسم عظیم اور صفت عظیم کے اثرات ہیں اور اس سورت میں علمی اور روحانی فیض کا ذکر ہے تو یہ فیض اسم اعلیٰ کا ہے ۔ تو جسمانی انعام کے شکریہ میں رکوع ہے ، رکوع نصف سجدہ ہے ، سجدۂ تلاوت اس میں ادا ہو جاتا ہے اس میں سبحان ربی العظیم پڑھنا مسنون ہے ۔ اور روحانی انعام کے شکریہ میں سجدہ ہے اس میں سبحان ربی الاعلیٰ کہنا مسنون ہے ۔ انسان کو دونوں طرف متوجہ ہوکر کام کرنا چاہیے .

انسان کو علم دینے کا پہلا ذریعہ ہیں اندرونی قوتیں جیسے حس اور عقل وغیرہ اور دوسرا ذریعہ ہے باہر سے الہام اور وحی ۔ تو اس اندرونی اور بیرونی نظام کا ایسا تطابق ہے کہ اس نظام پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اس لیے اس سورت کو اس حکم سے شروع کیا گیا ہے کہ سب سے زیادہ انعام روحانی ہے ، جب انسان کو ملے تو شکرانہ کے لیے سجدہ میں گرے .

آیت (۱) **سبح اسم ربک الا علیٰ** :- اپنے رب کی پاکی بیان کر ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم دینے کے جو نظام قائم کیے ہیں وہ تمام بے عیب ہیں .

آیت (۲) **الذی خلق فسویٰ** :- اس نے پیدا کر کے تمام اندرونی قوتیں (جیسے حس وغیرہ) پیدا کردیں ۔ اس کی تفسیر سورۃ انفطار میں زیادہ تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے .

فَلَا تَنْسٰۤى (۶) اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا یَخْفٰى (۷) وَ نُیَسِّرُكَ

پھر تو نہ بھولے گا مگر جو چاہے اللہ، وہ جانتا ہے پکارنے کو اور جو چھپا ہوا ہے اور سہج سہج پہنچائیں گے

لِلْیُسْرٰى (۸) فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (۹) سَیَذَّكَّرُ مَنْ یَّخْشٰى (۱۰) وَ

ہم تجھ کو آسانی تک سو تو سمجھادے اگر فائدہ کرے سمجھانا، سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہوگا اور

یَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى (۱۱) الَّذِیْ یَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (۱۲) ثُمَّ لَا یَمُوْتُ

یکسو رہے گا اس سے بڑا بدقسمت وہ جو داخل ہوگا بڑی آگ میں پھر نہ مرے گا

فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰى (۱۳) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (۱۴) وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (۱۵)

اس میں اور نہ جیے گا، بے شک بھلا ہوا اس کا جو سنورا اور لیا اس نے نام اپنے رب کا پھر نماز پڑھی

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۱۶) وَ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى (۱۷) اِنَّ هٰذَا لَفِی

کوئی نہیں تم بڑھاتے ہو دنیا کے جینے کو اور پچھلا گھر بہتر ہے اور باقی رہنے والا تحقیق یہ لکھا ہوا ہے

الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (۱۸) صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى (۱۹)

پہلے ورقوں میں صحیفوں میں ابراہیم کے اور موسیٰ کے

آیت (۳) والذی قدر فهدیٰ: صورت نوعیہ انسانی کے خواص۔ جیسے ہر انسان کے ذاتی خواص ہوتے ہیں اسی طرح جماعتوں کے خاصّے ہوتے ہیں۔ اس اجتماعی ترقی میں آخری نقطہ اس بات پر ختم ہوتا ہے کہ تمام انسانوں کو ملا دیا جائے۔ اس نوع انسانی کے لیے طبعی خواص ہیں جو اس کو دوسرے نوع سے ممتاز کردیتے ہیں۔ ان میں تبدیلی نا ممکن ہے۔ اس نوع کے جو افراد ہیں ان کی یہی تقدیر ہے اور وہ اس سے باہر نہیں جا سکتے۔ کوئی فرد اپنی نوع کے حکم سے باہر نہیں نکل سکتا۔ تو ہر فرد کی ترقی کا یہی راستہ مقرر ہے کہ وہ اپنی نوع کے خواص اپنے اندر زیادہ سے زیادہ پیدا کرے۔ اس کی رہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے ہیں کہ ہر انسان

کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اندر اپنی نوع کے خواص زیادہ سے زیادہ پیدا کر سکیں اگرچہ کوئی فرد اپنی استعداد سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا مگر انسانی انانیت اس کی مقتضی ہے کہ وہ اپنے لیے اسی چیز کو اپنی ترقی سمجھے جسے اُس نے خود اپنی کوشش سے حاصل کیا ہو۔ تو انبیاء علیہم السلام کے طریقہ سے لوگوں کو موقع دینا کہ وہ اپنی ترقی کریں یہ اس انانیت کے تقاضا کی تکمیل ہے۔ ان میں جو قوٰی ودیعت ہیں اُن کی ترقی اور حفاظت جن اسباب سے ہوتی ہے اُس کی طرف اس نوع کو ہدایت کردی۔ جیسے مرغی اپنے بچے پالتی ہے، اس نوع کو اس طرف ہدایت کی۔

آیت (۴ و ۵) والذی اخرج المرعیٰ :- انسان کے بعد درجہ ہے حیوان کا، حیوانی جنس کے لیے چراگاہ وغیرہ ضروری ہیں۔ چراگاہوں میں سبزہ اتنا پیدا ہوتا ہے کہ حیوان اپنا پیٹ بھر سکیں۔ حیوان اپنی کوشش سے چراگاہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حیوان کو پیدا کرنے سے پہلے سبزہ زار میدان بنادیے فجعلہ غثاءً احوی جب سبزہ کا موسم نہیں ہوتا تو اُسی سبزہ کو خشک کیا جاتا ہے، اور وہ حیوان کے کام آتا ہے۔

آیت (۶) سنقرءك فلا تنسیٰ :- ہم تجھے پڑھائیں گے یعنی تم پر علم کی بارش ہوگی۔ حیوانوں کی چراگاہوں کے نظام پر قیاس کر کے دیکھیے کہ انسان کو جس گھاس کی (سامان زندگی کی) ضرورت ہوگی، کیا اللہ تعالیٰ اُس کے واسطے مہیا نہیں کرے گا؟ انسان کی عقل کے لیے حظیرۃ القدس میں سبزہ (ضرورت زندگی) کے میدان کے میدان تیار کردیے گئے ہیں اور ضرورت کے مطابق اس جگہ (حظیرۃ القدس) سے عقلی علوم انسان پر اُترتے رہتے ہیں۔ جس طرح آفتاب کی شعاعیں زمین پر اُترتی رہتی ہیں اور زمین کی ضروریات کو پورا کر دیتی ہیں اِسی طرح حظیرۃ القدس یعنی علم کے آفتاب سے انسان پر علم کی شعاعیں ہمیشہ پڑتی رہتی ہیں جو اُس کی حاجت روائی کرتی رہتی ہیں۔

یہ جو الہام کی بارش ہوتی ہے یہ ہر انسان پر کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے۔ اور اس کا فیض انسانی نوع میں ہر انسان کو کسی نہ کسی طرح ملتا ہے۔

انبیاء کو اور انسانوں سے ممتاز سمجھنے کے لیے ایسی مثال سمجھ لو کہ جیسے پہاڑ ہیں کہ وہاں پانی اور برف پڑتی رہتی ہے، وہ ایسے اونچے ہیں کہ وہاں برف کے تودے کے تودے پڑے رہتے ہیں اور نیچے نہایت نشیبی جگہ میں آبادی کی زمینیں ہیں اور گھاس کے میدان ہیں، برف کا پانی پہاڑ کی رگوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہاں سے پانی کے چشمے بن کر یا دریا بن کر نکلتے ہیں اور میدانوں

کو سیراب کرتے ہیں اور انسان اپنے کھیت کو وہاں سے پانی دینے کے سامان کر لیتے ہیں، اور وہاں سے نالے نکالتے ہیں۔ بعض نہریں ایسی بنائی جاتی ہیں جو دریا میں اگر جوش ہو تو جاری ہو سکتی ہیں اور بعض نہریں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ دریا سے پانی لیتی رہتی ہیں اور میدانوں کو سیراب کرتی رہتی ہیں۔ اور بارش اگر میدان میں ہوتی ہے تو اُس کا پانی تھوڑی دیر ٹھہر کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور انبیاء زمین پر اُس علم کے مخزن بن جاتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ کر نکلتے ہیں اور فیض کے دریا بہتے رہتے ہیں۔

فلا تنسی الا ماشاء اللہ :- اللہ تعالیٰ کو جس قدر منظور ہے اُس کو تو نہیں بھولے گا۔ یہ بھولنا اور نہ بھولنا اس خزانے کی طرف اشارہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا فیض اُن کی زندگی میں اُن کی اُمت پر رہتا ہے اور اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کے علم کا فیض اُن کی اُمتوں پر برابر رہتا ہے۔ قومیں اُسی قدر (اتنی) ترقی کر سکتے ہیں جس قدر (جتنا) کہ اُن کے انبیاء کے پاس علم کا خزانہ ہو۔ مگر اس میں صرف ایک استثنا ہے **الا ماشاء اللہ** یعنی کسی قدر بھول جائیں گے۔ بعض اہل علم نے اِس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت مراد لی ہے یعنی اظہار شان قدرت الٰہی ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ بھول بھی جائیں گے۔ مگر ہم اسے اصلی معنیٰ میں بھی استثنا بنا لیتے ہیں۔ جیسے سبز گھاس جب سوکھ جاتی ہے تو اس میں سے کچھ نہ کچھ چیز تو نکل جاتی ہے۔

نبی کی زندگی میں علم تر و تازہ رہتا ہے، اور اس کے بعد جب اُس کی اُمت کے پاس وہ علم پہنچ جاتا ہے تو اُس کی کیفیت خشک گھاس کے مانند ہوتی ہے اور اُس کی روحانی قوت کسی قدر کم ہو جاتی ہے۔ اگر اس کمی کو اس استثنا کا مصداق بنادیا جائے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

اللہ یعلم الجہر و ما یخفیٰ :- جہر سے مراد ہے اُمت کا ظاہری کام بالفعل اور ما یخفیٰ سے مراد ہے اُمت کی استعداد۔ نبی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے فیض لینے والی جو قومیں ہیں، اُن کی ظاہری اور باطنی استعداد کے متعلق اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ کتنا علم رکھ سکتے ہیں اور کس قدر علم وہ بھول جائیں گے۔ تو یہ استثنا کی حکمت آجائے گی۔

آیت (۸) و نیسرک للیسریٰ الآیہ :- انسانی تعلیم کے واسطے دو راستے ہیں ایک آسان اور دوسرا مشکل۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر بڑی بحث کی ہے اور ان دونوں راستوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آسان راستے کا مطلب یہ ہے کہ اول تو انسانی فطرت میں کوئی نقص پیدا نہ ہو۔ اصل فطرت میں جتنی چیز جہاں ضروری ہے اُسی نسبت سے اُس کو چیزیں ملنی چاہییں۔ یعنی ہر ایک

چیز (دل۔ دماغ وغیرہ) اپنے تناسب سے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ بدنی قوت تو زبردست ہو اور دماغ بہت کمزور ہو۔ اس کو اس طرح پرکھنا چاہیے کہ فطرت اپنی حقیقت پر ہو اور اس میں نقص نہ آئے۔ اب اگر علم اس فطرت کے مطابق دیا گیا ہے تو یہ آسان راستہ ہے۔ مثلاً جہاں عقلی چیزوں کی جتنی زیادہ ضرورت ہے اسی قدر وہ زیادہ دی گئی ہیں اور اس طرح اُن کا تناسب قائم رکھا گیا۔ اب ایک علم ہے کہ جذبات سے بھرپور ہے اور عقل سے کم ہے تو صحیح فطرت والے انسان کے لیے یہ راستہ مشکل ہوجائے گا۔ اب آسان راستے کی تفصیل یہ ہے کہ اُس میں عقل سب سے زیادہ ہو۔ کوئی چیز ایسی نہ بتائی جائے جسے عقل اپنا نہ سمجھ سکے اور اُسے اپنا نہ بنا سکے۔ جذبات اُس کے دوسرے درجہ پر ہونے چاہییں (اول درجہ عقل اور دوسرا درجہ جذبات) مطلب یہ ہے کہ جذبات، عقل کے تابع رہیں اور اگر جذبات عقل پر غالب آگئے تو یہ غلط طریقہ ہوگا۔ اس کے بعد انسان کی جو معاشی زندگی ہے اُس کا نظام جذبات کے نظام سے بھی کمزور ہونا چاہیے۔ اس راستہ پر نوع انسانی کے تمام افراد آسانی سے ترقی کرتے جائیں گے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کا یہ عنوان ہے یعنی آپکو یہ شریعت دی گئی ہے۔ غرض جہاں تک ہم نے سمجھا ہے اس میں یہ اصول نکلتا ہے کہ علوم شرعیہ کی حقانیت، فطرت کی مطابقت سے سمجھی جایا کرے گی۔

آیت (۹) **فذکر ان نفعت الذکریٰ**:۔ اب فرمایا کہ اگر تو سمجھے کہ لوگوں کو فائدہ ہوگا تو اُن کو سمجھا۔ آیت (۸) میں تھا کہ جو قاعدہ بتلایا گیا ہے اس قاعدہ کے اندر اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض معین ہوتا ہے۔ اگر کوئی فرد انسانی اس فطرت نوعی سے مخالف طبیعت رکھتا ہے تو اُس کو سمجھانا نبی کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ انسان جس قدر صحیح فطرت کا مالک ہے، اُس صحیح فطرت کی تکمیل کرادینا نبوت کا فرض ہوگا۔ جس قدر زمین زراعت کے قابل ہے اگر وہاں بارش کا پانی پہنچ گیا تو وہ اُن کو سیراب کردے گا۔ مگر جو زمین زراعت کے ناقابل ہے وہاں پانی کا پہنچنا نہ پہنچنا برابر ہے۔

سیذکر من یخشیٰ:۔ اُس سے وہ آدمی ضرور فائدہ اٹھائے گا جو عاقبت اندیش ہے۔ عاقبت اندیش اُسے کہا جاتا ہے کہ خطرہ پیدا ہونے سے پہلے اُس خطرہ کی مدافعت کی تیاری کرلے۔ اور یہ حالت اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کہ انسان ہر بات اور معاملہ کو صحیح طور پر نہ سوچے، دماغ کی اعلیٰ قابلیت کا یہی معیار ہے کہ جو واقعات پیش آرہے ہیں اُن کے مستقبل کے متعلق سوچے اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے وہ صحیح نکلے۔ عاقبت اندیش میں ہمیشہ فقط ڈر کا پہلو ملحوظ نہیں ہوتا

بلکہ وہ مفید چیزیں بھی سوچ لیتا ہے۔ مگر حکمت کے قواعد کی ایک اصولی بات ہے کہ انسان کا ضرر سے بچنا بہت بڑا نفع ہے۔ اس کے بعد جو نفع ہوگا وہ دوسرے درجہ کا رہے گا۔ یعنی انسان اب جس قدر نفع حاصل کرے گا وہ ضرر سے بچنے کے بعد (یہ اول درجہ ہے) دوسرے درجہ پر رہے گا۔ اسی قاعدہ کے مطابق عاقبت اندیش اُس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ڈرنے والا ہے۔ یعنی ضرر سے بچنے کی اس میں پوری قوت موجود ہے۔ اس لفظ کو قرآن مجید عالِم کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے قرآن مجید میں ہے:- **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** (نظام قدرت الٰہیہ) میں عاقبت اندیشی کے ماہر ہی عالم ہیں۔ قرآن مجید عالم کا لفظ کسی دوسرے پر اطلاق نہیں کرتا.

آیت (۱۱) **و یتجنبھا الا شقی**:- جو لوگ بدنصیب ہیں وہ اس تعلیم سے فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ اگر نبی کا یہ فیصلہ ہو کہ فلاں آدمی سمجھ نہیں رکھتا اِس واسطے نبی کو اُس کی طرف مخاطب نہیں ہونا چاہیے تو ممکن ہے کہ نبی کا یہ فیصلہ بشریت کے تقاضے سے ہو اور بعض اوقات اس میں غلطی کرجائے۔ اب اگر وہ آدمی اس علم سے مناسبت رکھتا ہے تو وہ خود اس نبی کو تلاش کر کے اُس علم کو سیکھ لے گا اگر نبی اُس کی طرف مخاطب نہیں ہوگا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب اُس آدمی کی استعداد بھی مردہ ہوگئی ہے۔ اگر نبی اسے مخاطب کرتا تو اُس کے لیے راستہ آسان ہو جاتا اور وہ علم جلدی حاصل کرلیتا، مگر اب جب کہ نبی اُس کی طرف مخاطب نہیں ہوا اور یہ خود نبی کی تلاش میں ہے تو اسے محنت زیادہ کرنی پڑے گی اور پھر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کی اس تعلیم سے صرف وہی آدمی پرہیز کرے گا جس میں واقعی استعداد نہیں ہے۔ اور انسانیت پر جو فیض تقسیم ہو رہا ہے اس لحاظ سے یہ بد بخت ہے۔

آیت (۱۲ و ۱۳) **یصلی النار الکبریٰ ثم لایموت الآیہ**:- اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے واسطے آگ اور بے چینی کی زندگی ہوگی۔

آیت (۱۴) **قد افلح من الآیہ**:- جس آدمی میں عاقبت اندیشی ہے اور نبی نے اُس کو علم سکھایا وہ اپنے آپ کو پاک بنا لے گا۔

آیت (۱۵) **و ذکر اسم ربہ الآیہ**:- وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیتا ہے اور اس کی محبت میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اُس کی محبت میں مستغرق ہونا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس آدمی کو حظیرۃ القدس کی طرف توجہ ہو چکی ہے۔ یہ اپنی ضرورت کے مطابق اپنی مخزن (حظیرۃ القدس) سے علوم حاصل کرسکتا ہے۔ یہی آدمی ہے جو کامیاب ہوا (آیت ۱۴) اور نبی کی تعلیم سے ایسے ہی لوگ نکلیں گے اور یہ تعلیم ہمیشہ ایسی جماعتیں پیدا کرتی رہے گی۔

آیت (۱۶) بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا:- اور جو فیل ہوگئے اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ معاشی زندگی ہی کو سب سے بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ ادنیٰ حیات اور ذلیل ترین حیات کو پسند کرتے ہیں۔

آیت (۱۷) والآخرۃ خیر و ابقیٰ:- حالانکہ اس معاشی (دنیاوی) زندگی کے بعد جو آنے والی زندگی ہے وہ بہت اچھی ہے اور دیرپا ہے۔ اور یہ اس آخروی زندگی کو بھول جاتے ہیں اور دنیا کی زندگی میں ہی لگے رہتے ہیں اور یہی فیل ہونے کی نشانی ہے۔ حیوانوں کی طرح قریب بات کو سوچ لیتے ہیں اور مستقبل سے بے خبر رہتے ہیں۔

آیت (۱۸ و ۱۹) میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تفصیل ہے یہ پہلے انبیاء کے حلقہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے منسوب ہے۔ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام نظریات ابراہیمی ہیں اور عملاً آپ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ مشابہ ہیں۔

آیت (۸) ان ھذا لفی صحف :- پہلے صحیفوں (ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفے) کا خلاصہ یہی ہے جو ان سورت میں بتلایا گیا ہے۔ ہمارے مفسرین نے غلطی سے یہ خیال بنا رکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے گم ہوچکے ہیں۔ یہ اُن کی ناواقفیت ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ سابقہ کتب الٰہیہ کا انہوں نے مطالعہ ہی نہیں کیا۔ تورات کی سب سے پہلی کتاب کا نام پیدائش ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا صحیفہ ہے اور جس کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اول تورات میں رکھا۔ اس کے بعد چار صحیفے کتاب الخروج تک ہیں وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے ہیں۔ ان پانچوں کتابوں کا نام اصل میں تورات ہے اور بنی اسرائیل کے باقی انبیاء کی کتابیں ان سے مابعد ہیں وہ انہیں پانچ صحیفوں کے ساتھ ملادی گئی ہیں۔

ایک مبصر عالم عیسائی کہتا ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ بائبل کی جو اچھی چیزیں ہیں وہ سب قرآن مجید میں موجود ہیں اور جس کو قرآن مجید نے چھوڑ دیا ہے وہ بائبل کے دوسرے درجہ کی چیزیں ہیں اور انسانی ضرورت کی چیزیں نہیں ہیں۔ اب عمدہ اور اعلیٰ تعلیم قرآن مجید میں اور دوئم درجہ کی تعلیم بائبل میں دکھائی دیتی ہے۔

افسوس کہ مسلمانوں نے اس کے متعلق بہت غفلت برتی۔ اُنہیں چاہیے تھا کہ وہ تورات کو سامنے رکھ کر قرآن مجید کا مطالعہ کرتے تو یہ اُن کے واسطے بےنظیر ہوتے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اور اُن کے بعد اُن کے مدرسین اپنے مدرسہ میں ہمیشہ بائبل پڑھاتے تھے مگر اُن کے بعد مسلمانوں نے غفلت برتی۔ ہندوستانی علماء تھوڑا بہت مطالعہ رکھتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے گم نہیں ہوئے اب تک موجود ہیں۔

سُوْرَةُ الغَاشِيَهْ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتٌّ وَعِشْرُوْنَ آيَةً

سورۂ غاشیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھبیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان ، نہایت رحم والا ہے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۱) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ (۲) عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ (۳)

کچھ پہنچی تجھکو بات اس چھپالینے والی کی کتنے منہ اس دن ذلیل ہونے والے ہیں محنت کرنے والے تھکے ہوئے

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (۴) تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (۵) لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ

گریں گے دھکتی آگ میں پانی ملے گا ایک چشمے کھولتے ہوئے کا نہیں ان کے پاس کھانا مگر جھاڑ

ضَرِيْعٍ (۶) لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ (۷) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ (۸)

کانٹوں والا نہ موٹا کرے اور نہ کام آئے بھوک میں کتنے منہ اس دن تر و تازہ ہیں

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ (۹) فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (۱۰) لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً (۱۱) فِيْهَا

اپنی کمائی سے راضی اونچے باغ میں نہیں سنتے اس میں بکواس اس میں

عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۱۲) فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ (۱۳) وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ (۱۴) وَّنَمَارِقُ

ایک چشمہ ہے بہتا اس میں تخت ہیں اونچے بچھے ہوئے اور آبخورے سامنے چنے ہوئے اور قالیچے برابر

مَصْفُوْفَةٌ (۱۵) وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ (۱۶) اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ

بچھے ہوئے اور مخمل کے نہالچے جگہ جگہ پھیلے ہوئے بھلا کیا نظر نہیں کرتے اونٹوں پر کہ کیسے

وقف لازم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

سورۃ الغاشیہ مکیۃ

•

یہ سورت انقلاب کی تصویر پیش کرتی ہے۔ انقلاب ہمیشہ غرباء طبقہ سے شروع ہوتا ہے جیسے عرب میں سرمایہ اُن کا اونٹ ہے اور جبال اور زمین کی گھاس۔ اتنے سرمایہ سے انقلاب کیا۔

(آیت (۱ تا ۲۰) آیت ۲۶ کے بعد دیکھو)

آیت (۲۱) **فذکر انما انت مذکر:** اے رسول تو لوگوں کو سمجھا اور پڑھا۔ تیرا کام فقط پڑھانا اور سمجھانا ہے۔

آیت (۲۳) **إلا من تولی و کفر:** مگر اُس کو مت پڑھا جو تیری طرف سے پیٹھ پھیر لے۔ غرض آیت سے رسول کریم کا فرض اور آپ کی ڈیوٹی بالکل واضح ہوگئی۔

آیت (۲۲) **لست علیہم بمصیطر:** تو کسی کو اپنی طرف زبردستی کھینچ لانے والا نہیں ہے کہ تو اُن کو اس راستہ (سیدھا راستہ) سے باہر جانے ہی نہ دے۔ تیرا یہ کام نہیں ہے۔

آیت (۲۴) **فیعذبہ اللہ العذاب الاکبر:** (جو لوگ تیری طرف سے پیٹھ پھیرتے ہیں جن کا ذکر آیت (۲۳) میں کیا گیا ہے) اللہ تعالیٰ اُن پر عذاب کرے گا۔

آیت (۲۵-۲۶) **إن إلینا الایات:** اُن پر عذاب کرنا یا نہ کرنا صرف ہمارے ہی شایان شان ہے۔ تیرا کام فقط اتنا ہی ہے کہ جو لوگ اس کام کو سیکھنا چاہیں اُن کو سکھلادے۔ اس میں سستی نہ کر۔

اب اول سے ترجمہ شروع کرتے ہیں:۔

آیت (۱) **حل اتاك حدیث الغاشیہ:**۔ جو چیز تمام انسانوں پر چھا جانے والی ہے اُس کے اثر کا تجھ کو علم ہے یعنی بہت بڑا انقلاب جو تمام دنیا کو اپنے آغوش میں لے۔ (ایسا کرشمہ قرآن مجید سے بھی ہوا)۔ دوسرا اِس سے بھی بڑا ہے جو قیامت ہی ہے۔

آیت (۲) **وجوہ یومئذ خاشعۃ:** بعض آدمی شرمندہ ہوں گے۔

آیت (۳) **عاملۃ ناصبۃ:** حالانکہ حالت یہ ہے کہ اُنہوں نے زندگی بھر بہت بہت

خُلِقَتْ (۱۷) وقفہ وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ (۱۸) وقفہ وَ اِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ

بنائے ہیں اور آسمان پر کہ کیا اس کو بلند کیا ہے اور پہاڑوں پر کہ کیسے

نُصِبَتْ (۱۹) وقفہ وَ اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۲۰) فَذَكِّرْ قف اِنَّمَآ اَنْتَ

کھڑے کر دیے ہیں اور زمین پر کہ کیسی صاف بچھائی ہے سو تو سمجھائے جا تیرا کام تو یہی

مُذَكِّرٌ (۲۱) ط لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۲۲) لا اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَ كَفَرَ (۲۳) لا فَيُعَذِّبُهُ

سمجھانا ہے تو نہیں ان پر داروغہ مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہوگیا تو عذاب کرے گا

اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (۲۴) ط اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ (۲۵) لا ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (۲۶) ع

اس پر اللہ وہ بڑا عذاب بیشک ہمارے پاس ہے ان کو پھر آنا پھر بیشک ہمارا ذمہ ہے ان سے حساب لینا

محنت کر کے کام کیا مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نبی کی تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اس سے اعراض کیا۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت محنت کی اور مشقت اٹھائی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

آیت (۴ تا ۷) تصلی نارا حامیۃ الآیات: ان کے دوزخ میں جانے کی اِن آیات میں کیفیت ہے کہ ان کی محنتیں بے کار ہوگئیں۔

آیت (۸) وجوہ یومئذ ناعمۃ: بعض آدمی اس دن نعمت حاصل کریں گے۔

آیت (۹) لسعیہا راضیۃ: انہوں نے جو محنت اور مشقت کی ہوگی وہ اس سے راضی ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نبی کی تعلیم کے مطابق کام کیا۔ اِس واسطے وہ اب مزے سے ہیں۔

آیت (۱۰ تا ۱۶) فی جنۃ عالیۃ: ان آیات میں ان کی عافیت کی خوبی کا تذکرہ ہے کہ ان کو جنت میں یہ آرام اور صلہ ملے گا۔

آیت (۱۷ تا ۲۰) افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت: اِن آیات میں عربی قوم کا ماحول بتلایا گیا ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی ہے اگر وہ اپنے ماحول کا اندازہ نہ کرے تو کیا وہ کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہے؟ عقلمند انسان کو جہاں کہیں موقع ملے گا وہ اپنے ماحول پر پوری طرح نظر ڈالے گا، اور اس کے مطابق اپنا پروگرام

بنائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ کہیں جا کر کامیاب ہوگا۔ اب عربی ماحول یہ ہے کہ اونٹ کیسے پیدا کیے گئے ہیں۔ آسمان کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑ کیسے گاڑ دیے گئے۔ اور زمین کیسے مسطّح کردی گئی؟ مولوی حمیدالدین فراہی مرحوم اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ عرب میں بدوی زندگی ہے تو سب سے پہلے انسان کی نظر اونٹ پر پڑتی ہے اگر اونٹ سے ذرا اوپر نظریں کریں تو آسمان دکھائی دیتا ہے۔ اور ذرا نیچے دیکھیں تو پہاڑ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اگر اس سے نگاہ اور نیچی کریں تو زمین دکھائی دے گی۔ یہ عرب کی کائنات ہے اور یہ سامان ہیں، اور یہ ترقی کا مدار ہے۔ غرض ہر قبیلہ کا بڑا افسر اور لیڈر اِن چیزوں پر نظر کر کے اپنی قوم کے لیے ایک پروگرام بناتا ہے۔ اُس کے پروگرام بنانے میں یہ اساسی نقطے ہیں۔ چنانچہ ان نقطوں کا لحاظ رکھ کر ایک آدمی اپنا پروگرام بناتا ہے اور اپنے قبیلے کے لوگوں کے روبرو اس کا ذکر کرتا ہے۔ لوگ اس پروگرام کو اپنی ضرورت کے مطابق درست پاتے ہیں یعنی موافق پاتے ہیں اور ان کو مان لیتے ہیں (یہ نہیں کہ اُس کی کوئی بات ہی نہیں سنتا اور نہ ہر شخص اپنا مختلف پروگرام بناتا ہے)۔ اسی طرح ایک نبی نے ایک انٹرنیشنل زندگی کے لیے پروگرام بنایا۔ اِس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پروگرام نبی نے خود بنایا یا اُس نے سمجھ لیا۔ وہ اُس پروگرام کو جب سمجھدار لوگوں کے روبرو پیش کرے گا تو کیا اُس پر غور نہیں ہونا چاہیے؟ یعنی اس سامان سے یہ دستورالعمل کامیاب ہو سکتا ہے۔ اِس کے لیے قیصر و کسریٰ جیسے سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ جس نے غور نہ کیا اُس کا انجام تلخ ہوگا، جس کا آیات ۲ تا ے میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ بہت محنت کرے گا مگر اُس کا پھل کچھ بھی نہیں نکل سکے گا اور جو آدمی اس پروگرام پر غور کرے گا تو آیات (۵ تا ۱۶) کے موافق اُس کا انجام اچھا ہوگا۔ قرآن مجید کا دستورالعمل اس سامان سے کامیاب ہوگیا۔ اور سمجھانے کے لیے کسی جیل خانہ یا لشکر کی ضرورت نہ رہی۔ اقوام عالم اُس کو خود بخود قبول کرتے گئے اور اس میں جذب ہوتے گئے.

سُوْرَةُ الْفَجْرِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً

سورہ فجر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْفَجْرِ (۱) وَ لَيَالٍ عَشْرٍ (۲) وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۳) وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ (۴) هَلْ

قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی اور اس رات کی جب رات کو چلے ہے

فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ (۵) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ (۶) اِرَمَ

ان چیزوں کی قسم پوری عقلمندوں کے واسطے تونے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ وہ جو ارم

ذَاتِ الْعِمَادِ (۷) الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ (۸) وَ ثَمُوْدَ الَّذِيْنَ

میں تھے بڑے ستونوں والے کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے

جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۹) وَ فِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ (۱۰) الَّذِيْنَ طَغَوْا

تراشا پتھروں کو وادی میں اور فرعون کے ساتھ وہ میخوں والا یہ سب تھے جنھوں نے سر اٹھایا

فِي الْبِلَادِ (۱۱) فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ (۱۲) فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ

ملکوں میں پھر بہت ڈالی ان میں خرابی پھر پھینکا ان پر تیرے رب نے کوڑا

عَذَابٍ (۱۳) اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۱۴) فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ

عذاب کا بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں سو آدمی جو ہے جب جانچے اس کو رب اس کا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورۃ الفجر مکیۃ

آیت (۱) والفجر: صبح - آیت (۲) ولیال عشر: دس راتیں۔ آیت (۳) والشفع والوتر: جفت اور طاق۔ آیت (۴) والیل اذا یسر: اور رات جب چل پڑے۔ یہ چار چیزیں گواہ ہیں۔ یہ چار قسمیں ہیں۔ حظیرۃ القدس میں انسان کے لیے جو ترقی کے مدارج ہیں، اُن کو بیان کرنے کے لیے ان شہادتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

فرعون صبح کو مصر سے نکلا، اور عاد و ثمود پر فجر کے وقت عذاب آیا۔ رمضان کے عشرہ آخر میں قرآن اترا۔ اس نے عالمگیر انقلاب کیا، جس سے بادشاہ، بادشاہ پرست اور سرمایہ پرست تباہ ہوئے۔ اور یوم عرفہ میں یہ نعمت الٰہی بدرجۂ اتم تکمیل پر پہنچی جس سے انسان کو حظیرۃالقدس پہنچنے کا راستہ کھلا۔ *

آیت (۵) ھل فی ذالک قسم لذی حجر: عقلمند کے لیے ان چار مثالوں (آیت ۱ تا ۴) میں کوئی شہادت موجود ہے کہ وہ ان مثالوں میں سوچ کر فائدہ اُٹھائیں؟ ہمارے ہاں غلطی سے عقلمندی کا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو کر اس کے بعد انسان قرآن مجید کو سوچے۔ مگر اس کے خلاف ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جس چیز سے ہمارا تعلق نا گریز ہے، اُسے پہلے اپنے پیش نظر رکھے مثلاً آنکھ پر غور کرنے لگے تو روشنی کو روبرو رکھے۔ اس لیے کہ آنکھ کے متعلق وہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ روشنی کو سامنے نہ رکھے۔ اِسی طرح عقل کے متعلق اگر انسان سوچے تو اُس نور کو سامنے رکھے جس کے بغیر عقل کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ اگر اِس طرح سوچنے بیٹھے گا تو نتائج بخوبی نکلتے چلے آئیں گے۔ اِس نور کو سمجھنے کے لیے نوع انسانی میں جو واقعات فوق العادت پیدا ہوئے ہیں، فطرت انسانی کے اندر رہ کر اُن کے اسباب پر غور کرنا چاہیے۔ اِس طرح اللہ تعالیٰ کی حظیرۃالقدس کے ذریعہ جو حکومت الٰہی ہے، وہ سمجھ میں آنے لگ جائے گی۔ پھر

* ایک بزرگ نقشبندی کا مقولہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کو راستہ بنانے کے لیے گئے تھے، اور اب تو طالب الٰہی بذریعہ مراقبہ پہنچتے رہیں گے۔

فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ (۱۵) وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ

پھر اسکو عزت دے اور اسکو نعمت دے تو کہے میرے رب نے مجھکو عزت دی اور وہ جس وقت اسکو جانچے پھر

عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (۱۶) كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۱۷)

کھینچ کرے اس پر روزی کی تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا، کوئی نہیں پر تم عزت سے نہیں رکھتے یتیم

وَ لَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۸) وَ تَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا (۱۹)

کو اور تاکید نہیں کرتے آپس میں محتاج کے کھلانے کی اور کھا جاتے ہو مُردے کا مال سمیٹ کر سارا

وَّ تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۲۰) كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۲۱) وَّ

اور پیار کرتے مال کو جی بھر کر، کوئی نہیں جب پست کردی جائے زمیں کوٹ کوٹ کر اور

جَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا (۲۲) وَ جِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ

آئے تیرا رب اور فرشتے آئیں قطار قطار اور لائی جائے اس دن دوزخ اس دن

يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى (۲۳) يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ (۲۴)

سوچے گا آدمی اور کہاں ملے اسکو سوچنا، کہے کیا اچھا ہوتا جو میں کچھ آگے بھیج دیتا اپنی زندگی میں

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ (۲۵) وَّ لَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ (۲۶) يٰٓاَيَّتُهَا

پھر اس دن عذاب نہ دے اس کا سا کوئی اور نہ باندھ کر رکھے اس کا سا باندھنا کوئی، اے وہ

النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ (۲۷) ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۲۸) فَادْخُلِيْ فِيْ

جی جس نے چین پکڑلیا پھر چل اپنے رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، پھر شامل ہو میرے

عِبٰدِيْ (۲۹) وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۳۰)

بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں۔

انسان اپنی ترقی کا راستہ یا تو خود معین کر لے گا یا کسی بڑے اُستاد کے بتلانے پر اُسے یقین آجائے گا۔

اب پہلے قسم کی طرف (آیت ۱) توجہ کرتے ہیں۔ یعنی صبح۔ ہر صبح کے بعد وہی واقعات پیدا ہوتے ہیں جس کی علامتیں رات کو تیار ہو چکی ہیں۔ عربی میں ایک مثال ہے کہ راتیں حاملہ عورت کی طرح ہیں۔ سعدی نے کہا ہے:

ع شب آبستن است اے برادر بروز

صبح معلوم ہو گا کہ کون سا بچہ پیدا ہوا۔ یعنی معمولی واقعات کو چھوڑ دیجیے۔ ذرا عام فطرت سے اونچے واقعات جن کی طرف انسانی فطرت متوجہ ہوتی ہے اُس کی مثالیں آتی ہیں۔ (دیکھو آیت ۱۴)

خطیرۃالقدس عالم غیب میں ہے جیسے رات، اور عالم شہادت صبح کی مانند ہے۔ جو کچھ فیصلہ خطیرۃالقدس میں ہوتا ہے اُس کا نتیجہ عالم شہادت میں دکھائی دیتا ہے۔

آیت (۶) **الم ترکیف**: عرب کا قبیلۂ عاد شرارت میں بڑھ گیا، اللہ تعالیٰ نے اُسے ہلاک کر دیا۔

آیت (۷ و ۸) **اِرم ذات العماد**: عرب کے دوسرے قبیلوں کے قد متوسط تھے اور عاد طاقتور اور مضبوط تھے۔ ایک زمین کی رہنے والی قوموں کو عام طور پر ایک نسل والا بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور یہ بالکل غلط بات ہے کہ مدت ہوئی قومیں نقل و حرکت کر کے آپس میں مخلوط ہو چکی ہیں۔ قبائل تو اپنا نسب ایک ثابت کر سکتے ہیں مگر کسی ملک کی تمام قوم کو ایک ہی آباء و اجداد کی اولاد بتانا زبردستی اور ہٹ دھرمی ہے۔

غرض عاد ایسی قوم تھی کہ عربی قوموں میں اُن کی مثل دوسری کوئی قوم ممتاز نہیں تھی۔ اب یہ کہنا کہ دنیا بھر میں عاد جیسی طاقتور اور مضبوط قوم ہی نہ تھی یہ غلط ہے۔ اِس سے مراد ہے کہ اُن کے اپنے ملک کی کیفیت یعنی اُس ملک عرب میں عاد سے زیادہ تنومند عربی قوم کوئی نہیں تھی، اور اِس قسم کے محاورے ہر زبان میں ملتے ہیں۔ عاد یمن میں رہتے تھے۔ **ذات العماد** سے مراد ہے بڑے بڑے منارے بناتے تھے اور اپنی دولت اُس پر رائگان خرچ کرتے اور بڑے بڑے قلعے اور مصنوعات بناتے تھے۔ اِس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ رفاہ عامہ پر خرچ نہیں کرتے تھے۔ بڑے بڑے محلات بناتے تھے۔ ہر آفیسر کے لیے عالیشان عمارت اور باغ ضروری تھا۔ جب خزانہ ختم ہوگیا تو رعایا پر زیادہ محصولات لگائے۔ آخر اِس ظلم کے باعث انقلاب آ گیا ارو وہ تباہ ہو گئے۔ دیکھو سورۃ الشعراء۔

آیت (۹) **و ثمود الذین جابوالصخر**: حجاز کے شمال میں جو قوم ثمود تھی اب اُس کا ذکر آتا ہے۔

آیت (۱۰) و فرعون ذی الاوتاد: میخوں سے سزا دینے والا فرعون ہے یا خیمہ خرگاہ والے۔

آیت (۱۱) الذین طغوا: تجھے معلوم ہے کہ یہ تمام (آیت ۷ تا ۱۰) اپنی حد سے زیادہ نکل گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ لوگ انسانیت کی فطری حدود کے اندر نہیں رہ سکے۔

آیت (۱۲) فاکثر و فیها الفساد: ملکوں میں فساد کر کے انہوں نے اندھیر مچا دیا۔ اور غرباء پر طرح طرح کے ظلم ایجاد کیے اور ترقی کے نام پر محصولات بڑھا کر اُن کو مفلس بنا دیا۔

آیت (۱۳) فصب علیهم الآیہ: تم نے دیکھا کہ وہ حد سے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو پکڑا، اور اُن پر عذاب کیا۔ یہ کوئی مقامی قانون نہیں ہے کہ کسی خاص ملک میں کسی خاص قوم کو سزا دی۔ بلکہ ایک یمن میں ہے اور دوسرا حجاز کے شمال میں اور تیسرا مصر میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ انسانیت کا عام قانون ہے۔

آیت (۱۴) إن ربك لبالمرصاد: اب اس کا نتیجہ بتلایا کہ تیرا رب ہر قوم کو غائبانہ دیکھ رہا ہے۔ جیسے شکاری گھات میں بیٹھا ہو کہ جہاں جانور نے ذرا سی غلطی کی اور تساہل سے کام لیا اور غفلت برتی، شکاری نے فوراً وہیں نشانہ لگا دیا۔ اس نتیجہ پر عقل کا پہنچنا آسان ہے۔ انسان بخوبی سمجھ لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نگرانی کر رہا ہے اور وہ ضرور سزا دے گا۔

جہاں سے اللہ تعالیٰ نگرانی کر رہا ہے اس کو حظیرۃ القدس کہتے ہیں۔ ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرنے میں اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی قوموں پر کس طرح ہو رہی ہے۔ (اسی واسطے عاد، ثمود اور فرعون کی مثال سمجھائی)۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہنا چاہیے کہ انسان کو تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اگر عقل انسانی تاریخ سے قطع تعلق کر لے تو وہ کوئی کام نہیں کر سکتی۔

جب انسانیت کی تاریخ سے اسی طرح ایک صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی عادت ہو جائے گی تو ہر نئی صبح میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق انسانی عقل ایک اندازہ کر سکے گی۔ اب اگر ایک شخص کے اندازے عموماً ٹھیک نکلتے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ عقل کو ٹھیک طرح پر استعمال کرنا سیکھ گیا۔ اور یہی فجر سے مراد ہے جو آیت (۱) میں شاہد و گواہ لایا گیا ہے۔ (اب دوسری فصل ہے دس راتوں کی قسم آیت ۲)۔

اکثر اہل علم کی رائے دیکھ کر ہمیں یہی بات نظر آئی کہ اس سے مراد

رمضان کی آخری دس راتیں ہیں ۔ انہی دس راتوں کی ایک رات میں قرآن مجید * نازل ہونا شروع ہوا تھا ۔ مقدمہ کے طور پر اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک چھوٹی سی بات عقل کے طور پر کہہ لیں تاکہ آگے چل کر آسانی ہو ۔ عقل کے بعد انسان میں حب کے جذبات ہوتے ہیں ۔ یہ حب دو قسم کی ہوتی ہے ۔ ایک حب ہے عقلی ، کہ جو بات عقل سے صحیح سمجھ میں آئے اُس سے طبیعت میں محبت پیدا کر دی جائے ۔ اور دوسری محبت ہے جس کو طبعی کشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ خواہ انسان سوچے یا نہ سوچے طبیعت میں ایک کشش ہے کہ وہ انسان کو اپنی طرف لے جا رہی ہے ۔ اُس کے بعد وہ جب اس کشش کے متعلق سوچتا ہے تو وہ اُسے اپنے واسطے مفید پاتا ہے ۔ اور اُس کی عقل اُس سے مطمئن ہو جاتی ہے ۔ اگر مفید نہیں پاتا تو اپنی طبع پر زور ڈالتا ہے کہ اُس کی طرف رغبت نہ کرے ۔

آیت (۱۵) فاما الانسان اذا ما ابتلاہ :۔ انسان کی عادت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اُس کا امتحان لینے کے لیے اُسے عزت اور عظمت دے تو وہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے بزرگی دی ۔ حالانکہ یہ بزرگی اُسے صرف امتحان کے طور پر دی گئی تھی کہ دیکھیں یہ اُس سے کیا فائدہ اُٹھاتا ہے ۔ مگر یہ ایسے ہی میں مست ہوگیا کہ میں بڑا بزرگ ہو گیا ہوں ۔ اُس بزرگی پر جو فرائض عائد ہوتے تھے وہ ان کو بھول گیا ۔ اور اس کو خیال ہوگیا کہ یہ بزرگی میری ہی قابلیت سے مجھے ملی ہے ۔ اور وہ مساکین و غربا کا کوئی انتظام نہیں کرتا ۔ اُلٹا ان کو لوٹ کھسوٹ کر مال جمع کرتا ہے ۔ مال جمع کرنا اُس کا نصب العین ہے ۔

آیت (۱۶) وآما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ الآیہ :۔ اور جب اللہ تعالیٰ اُس کا امتحان لیتا ہے اور اُس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری اہانت

---

* جو سرمایہ پرستی کی بیخ کنی کے لیے نازل ہوا ہے وفی اموالھم حق للسائل والمحروم اب آگے سرمایہ پرست کی مثال آتی ہے کہ اُس کی عادت ہے کہ وہ یتیموں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ، اور اپنی بیٹی بیٹے کو عزت کے نگاہ سے دیکھتا ہے اور مساکین کی روزی کا بندوبست نہیں کرتا ، اُلٹا اُن کے مال کو کھاتا ہے اور دوسروں کے میراث کو بھی ہضم کر جاتا ہے ۔ غرض کہ مال اُس کے نزدیک محبوب ہے نہ انسانی ذات ، یہ ایسا خبیث طبیعت ہے کہ اگر اس کی حالت دولتمندی کی ہے تو اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں محبوب الٰہی ہوں ۔ اور اگر اُس پر تھوڑی سی تنگی رزق کی آجاتی ہے تو خدا پر غصہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے ۔ ایسے سرمایہ پرستوں کے استیصال کے لیے یہ قرآن مجید نازل ہوا ہے اور غربا کی ہمت کو بڑھاتا ہے اور سرمایہ داروں کو ڈراتا دھمکاتا ہے (دیکھو والقلم کو)

کردی * اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ اُس کی اھانت نہیں ھوتی بلکہ اُس کی عقل کا امتحان ھوتا ھے غرض جو لوگ پہلی حالت کو (آیت ۱۵) عزت سمجھتے ھیں اور دوسری کو (آیت ۱۶) اھانت - یہ دونوں باتیں غلط ھیں - انسان کے لیے بہتر یہ ھے کہ وہ سوچ سمجھ کر کوئی کام کرے اور پھر نتیجہ کے طور پر اُسے عزت نصیب ھو - اور اھانت یہ ھے کہ جن چیزوں کو وہ اچھا سمجھتا ھے، اُن کو غفلت سے چھوڑدے اور اُس غفلت کے نتیجہ میں اُس کی بری حالت ھوجائے یہ ھے حقیقی اھانت.

اگر بغیر محنت کے نعمت مل گئی یا بغیر غفلت کے رزق میں تنگی آگئی تو یہ دونوں حالتیں عارضی ھیں جو امتحان کے طور پر پیش آتی ھیں.

آیت (۱۷) کلا: ایسا نہیں ھے کہ اتفاقی طور سے کام مل جائے- اسے عزت کا ذریعہ بنایا جائے- جو کام عزت پیدا کرنے والے ھیں وہ تو تم کرتے نہیں اور جو کام ذلیل بنانے والے ھیں وہ تم کرتے ھو- اب تم کیسے توقع کر سکتے ھو کہ تم کو عزت ملے- بل لا تکرمون الیتیم انسانی عقل کے مطابق عزت حاصل کرنے کا یہ طریقہ ھے کہ تم محتاجوں کی خبرگیری کرو، تمہاری عزت ھوگی- یہ عادت سرمایہ پرست کی ھے.

آیت (۱۸) ولا تحاضون: اور مساکین کو مدد دو- ان احکام کی عدم تعمیل سے اُن پر تباھی آئی- عاد و ثمود اور فرعون بادشاہ پرستوں کی مثال تھی اور اما الانسان سے سرمایہ پرست کی مثال ھے-

آیت (۱۹ و ۲۰) و تاکلون التراث: تم میراث کو کھاتے ھو- یعنی دوسرے کی جائداد کے خود مالک بننا چاھتے ھو- اور مال محبت سے جمع کرتے ھو- اگر کبھی مال مل گیا تو اُسے سمیٹ کر رکھتے ھو- یہ دونوں چیزیں اھانت کا ذریعہ ھیں- ان سے انسان بے عزت ھو جاتا ھے- تمہاری اُلٹی عقل ہے کہ تم اس کو عزت کا ذریعہ سمجھ رہے ھو- سرمایہ پرستی اس سے پیدا ھوتی ھے جو ملعون اور مغضوب ھے- تمہیں چاھیے تھا کہ یتیم اور مساکین اور دوسرے کے مال و جائداد کی حفاظت کرتے- اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کھانے پینے کے لیے بہت کچھ دیا ھے- تو اُس کے شکرانے میں نظام عالم میں کام کرو- مگر تم دوسروں کی تباھی کر رہے ھو.

(دوسری فصل ختم ھوئی اب تیسری فصل شروع ھوتی ھے)

---

* یعنی جب اُس کا دیوالہ نکل گیا تو پھر وہ بیٹھ کر اپنی بزرگی یاد کر کے اُس حالت کو اھانت سمجھتا ھے اور اُس کو خدا پر غصہ آتا ھے اور خدا کا منکر بن جاتا ھے - حالانکہ یہ ساری تباھی اُس کے عدم ادائے فرض سے ھوئی.

(آیت ۲۱ تا ۲۶- جو جفت اور طاق ہے۔ آیت ۰)

عام اہل علم کے مطابق ہماری سمجھ بھی یہی ہے کہ آیت ۳ سے عرفہ (ذوالحج کی ۹ تاریخ) اور حج کا دن (۱۰ تاریخ) مراد ہے۔

قرآن مجید اقلیت سے ترقی کر کے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ انہی دس راتوں (رمضان) میں نازل ہوا تھا۔ غرض یہ دس راتیں قرآن کے نزول کا زمانہ تھا اور اسی طرح ۹ اور ۱۰ ذی الحج کی تاریخیں اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو جذب کرنے کی یادگار ہیں۔ سیدنا ابراھیم علیہ السلام اور آپ کے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام محبت الٰہی سے کھچ کر قربانی دینے کے لیے تیار ہوئے اور اس قربانی کو وہ اپنی عقل کے مطابق اطمینان سے ٹھیک مانتے ہیں۔ انسانی ترقی کا اس عقلی حب کے درجے پیدا کرنے کے بعد کا زمانہ ہے۔ جو لوگ عقل کے مطابق اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے طریقہ پر عمل کرتے رہتے ہیں، اور اُن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت راسخ ہوگئی، اس سے یہ اونچا درجہ ہے۔

اس کے بعد انسانی ترقی یہ ہے کہ جن چیزوں میں انسانی عقل خود نہیں پہنچ سکتی اور وہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا اعلیٰ ذریعہ ہیں تو اللہ تالیٰ وہ کشش انسان کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ عقل بھی اُس کی موافقت کرنے لگ جاتی ہے تو یہ حج اسی قسم کی محبت کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اور اسی طرح حجۃالوداع میں الیوم اکملت نازل ہوئی یعنی قرآنی تعلیم اس میں پوری ہوئی۔ آیت ۲۱ تا ۲۶ میں اس تیسری فصل کا ذکر ہے۔

آیت(۲۱ و ۲۲) کلا اذا دکت الارض دکا دکا: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نزول ہوگا۔ انجیل میں اس کا تفصیل سے ذکر ہے۔ قیامت کی یاددھانی کے لیے قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی آسمانی کتاب نہیں ملتی۔

جو لوگ اس محبت کے درجہ کو طے کر چکے ہیں، اُن کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑی عزت سے جگہ ملے گی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کہتے ہیں کہ "میں دائیں طرف بیٹھوں گا" اور یہی طرف ہے تمام انبیاء کرام کی اور اُن بزرگوں کی جو اس محبت میں کامیاب ہوچکے ہیں۔ مسیح علیہ السلام اپنی قوم کو اپنی مثال درحقیقت سبق کے طور پر بتلاتے ہیں مگر نصاریٰ نے غلطی سے اسے مسیح علیہ السلام کے لیے مخصوص کر دیا کہ وہاں صرف مسیح علیہ السلام ہی بیٹھیں گے۔ اگر انسان نے اس دنیا میں یہ درجہ حاصل نہیں کیا تو پھر اُس کے لیے اُس دنیا میں کوئی موقع نہیں ہے۔

آیت (۲۳) وجیئ یومئذ بجهنم: اس میدان میں جہنم سامنے لایا جائے گا۔ یومئذ یتذکر الانسان: اور وہ جہنم اپنی کشش سے لوگوں کو اپنی طرف کھینچے گا۔

اب انسان کو ہوش آئے گا۔ کہ کاش میں ایسی حالت میں ہوتا کہ جہنم کی جو کشش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اس کے بجائے میں اس کشش کو پاتا (حاصل کرتا) جو اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے والی ہے۔

و انیٰ له الذکریٰ :- مگر اس نعمت کو یاد کرنے سے کیا فائدہ؟ اب تو موقع ہی نہیں رہا۔

انسانوں کا ایک طبقہ ایسا ہے کہ وہ غیر فطری کاموں کے لیے اپنے اندر ایک جذب (کشش) پاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی عقل کو بھی ان غیر فطری کاموں پر مطمئن کر لیتا ہے۔ یہ لوگ ہوں گے جن کو جہنم اپنی طرف زور سے کھینچ کر لے جائے گا۔ انہیں اس وقت تنبّہ پیدا ہو گا کہ ہم کو جس طرح یہ کشش اب پیدا ہوئی ہے کاش یہ پہلے ہی ٹھیک طریقہ پر ہوتی۔ انسان کو یہ ترقی ہمیشہ اچھی سوسائٹی حاصل ہونے سے نصیب ہوتی ہے۔ اور بری سوسائٹی میں رہ کر انسان جہنم کا اہل بن جاتا ہے۔

آیت (۲۴) یقول یا لیتنی الآیہ :- انسان کو جب تنبّہ ہونا ہے تو کہتا ہے اے کاش میں اس زندگی کے لیے کچھ تو کرتا۔

آیت (۲۵ و ۲۶) فیومئذ لا یعذب الآیات :- اس دن ایسی گرفت ہوگی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ اس طبقے کا ذکر ہے جس نے غیر فطری کاموں کی کشش اپنے اندر پیدا کرلی ہے۔ ان کو ایسی گرفت ہو گی کہ وہ سمجھ ہی نہیں سکیں گے۔

(تیسری فصل ختم ہوئی۔ اب چوتھی فصل شروع ہوتی ہے)

آیت (۴) میں کہا گیا ہے کہ واللیل اذا یسر یعنی رات جب چل پڑی۔ اس سے مراد لیلۃ المعراج "سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام" سورۃ بنی اسرائیل۔ تو وہ رات ہے یسر والی۔ ترقی کا یہ آخری درجہ ہے کہ انسان حظیرۃ القدس میں پہنچ جائے۔ تیسرے فصل میں بیان کیا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دربار لگائے گا تو اس میں انسان کو عزت سے بٹھائے گا۔ اور اس چوتھی فصل میں یہ بتلایا جاتا ہے کہ انسان اپنے آخری درجۂ ترقی (حظیرۃ القدس) میں پہنچ کر اسے حاصل کرلے۔ اسے معراج یعنی عروج کا حصہ کہتے ہیں۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں سیر کرائی گئی اور یہ ترقی کا آخری درجہ تھا۔

آیت (۲۷ و ۲۸) یا ایتھا النفس المطمئنۃ الآیات :- نظام عالم کی درستی کے لیے کام کرنے والا، نہ اس کو سرمایہ پرست بننے کا شوق ہوتا ہے اور نہ بادشاہ، نہ بادشاہ پرستی کا خیال ہے۔ اے انسان، خدا کا بندہ ہو جا۔ یہ انتہائی ترقی ہے کہ انسان

اللہ تعالیٰ سے راضی ہو اور اللہ تعالیٰ انسان سے راضی ہو۔

آیت (۲۹) فادخلی فی عبادی :- میرے بندوں کی جماعت میں بیٹھ جا۔ یہ حظیرۃالقدس ہے۔ جو اپنے آپ کو ایک اللہ کا غلام سمجھتا ہے ایسے آدمی کو حکم ہوتا ہے کہ تم میرے غلاموں میں داخل ہو جاؤ۔ پھر تو دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔

آیت (۳۰) وادخلی جنتی :- اور میرے باغ میں داخل ہو جا۔ باغ میں داخل ہونا دوسرے درجہ کی چیز ہے۔ اگر انسان حظیرۃالقدس میں پہنچ گیا (یہ انتہائی ترقی ہے۔ اور اس سے دوسرے درجہ پر یہ ترقی ہے کہ جس قدر باغ وغیرہ ہیں اُن کی یہ بخوبی سیر کرے۔

ھل فی ذالك قسم لذی حجر :- حاصل مطلب یہ نکلا۔ قرآن مجید کی تعلیم ہے إن ربك لبالمرصاد :- بادشاہوں نے خدا کے احکام کی برخلافی کی اور مساکین پر ظلم کیے تو فنا ہو گئے۔ اور سرمایہ پرست جو سلطنت کے دست و بازو ہوئے ہیں اُن کو بھی تباہ کرنا ہے۔ اُن کے اخلاق بالکل ردی ہیں۔ اس کے بعد قیامت کی تصویر ہے کہ پھر دولت پرست انسانوں کو معلوم ہو گا کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" اور اُنہوں نے اپنی روحانی ترقی کو بھلایا جس کے باعث وہ جہنم میں پڑے۔ اور اللہ کے بندے جنہوں نے نظام عالم میں ایک پرزہ بن کر کام کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے وہی دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں۔ اس میں بالکل مسلسل مضمون ہیں۔ انسان چار قسم کے ہیں :- ایک ایمپائر۔ دوسرا امپیریلسٹ۔ تیسرا سرمایہ دار۔ چوتھا غمخوار نوع انسانی۔

سُوْرَةُ الْبَلَدِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ عِشْرُوْنَ آيَةً

سورہ بلد مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی بیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۱) وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۲) وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ (۳)

قسم کھاتا ہوں میں اِس شہر کی اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اِس شہر کی اور قسم ہے جننے کی اور جو اُس نے جنا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ (۴) اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ (۵)

تحقیق ہم نے بنایا آدمی کو محنت میں، کیا خیال رکھتا ہے وہ کہ اُس پر بس نہ چلے گا کسی کا؟

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا (۶) اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ (۷) اَلَمْ نَجْعَلْ

کہتا ہے میں نے خرچ کرڈالا مال ڈھیروں، کیا خیال رکھتا ہے کہ دیکھا نہیں اُسکو کسی نے؟ بھلا ہم نے

لَّهٗ عَيْنَيْنِ (۸) وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ (۹) وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (۱۰) فَلَا اقْتَحَمَ

نہیں دیں اُسکو دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ؟ اور دکھلادیں اُس کو دو گھاٹیاں سو نہ دھمک سکا

الْعَقَبَةَ (۱۱) وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ (۱۲) فَكُّ رَقَبَةٍ (۱۳) اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ

گھاٹی پر اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی؟ چھڑانا گردن کا یا کھلانا

يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (۱۴) يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ (۱۵) اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۱۶) ثُمَّ

بھوک کے دن میں یتیم کو جو قرابت والا ہے یا محتاج کو جو خاک میں رل رہا ہے پھر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

سورۃ البلد مکیۃ

اِس سورت میں انسانی فطرت کا ایک خاص مظاہرہ ہے۔ انسانی فطرت چاہتی ہے کہ اُس کو مکلف بنایا جائے۔ اِس صورت میں مذہبی علماء اور رہبان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اُن میں سرمایہ پرستی کا سخت مرض ہے۔ تقریریں بہت کرتے ہیں مگر نظام عالم میں کام نہیں کرتے۔ تقریریں کرنے سے اُن کی غرض و غایت سرمایہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی بد اخلاقی ہے۔ سرمایہ پرستی بڑی لعنت ہے۔ اِس مرض کے ازالہ کا اِس سورت میں علاج بتایا گیا ہے۔

آیت (۴) لقد خلقنا الانسان فی کبد: انسان کبھی حالت میں مشقت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یہ اُس کی فطرت کا اہم جزو ہے۔ اس نقطۂ نظر سے انسانی فطرت پر ایک قسم کا تذکرہ ہے۔

آیت (۱ و ۲) لا اُقسم بھذا البلد و انت حل بھذا البلد: جب تو اس شہر مکہ میں رہتا ہے۔ اِس حالت میں ہم اسے گواہ بناتے ہیں*۔ اِس گواہی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو ہمیشہ مشقت میں پیدا کیا۔ انسانی کمالات میں ترقی کرنے کے بعد اگر کوئی آدمی مشقت سے بچ سکتا تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی خدمت کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی محنت بے انتہا مفید ثابت ہوئی۔ اور آپ کی حالت جب آپ مکہ میں موجود تھے تو کس قدر مصیبت میں گذر رہی تھی یہ عیاں ہے۔ غرض انسان کمالات پر پہنچ کر اپنے آپ کو مشقت سے نہیں بچا سکتا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کی زندگی اس کی گواہ ہے۔ ہمارا یہ اصول ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی آپ کی مکی زندگی کا تتمہ ہے۔ آپ کے تمام کمالات اُس ابتدائی زندگی (مکی زندگی) میں طے ہو چکے تھے۔ انبیاء کے سلسلے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم جیسا

* اگر دو گواہ سمجھے جائیں تو بھی صحیح ہے۔ یہ مکہ مکرمہ جو عرب میں ام القریٰ ہے کیسی مشقت سے بنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل و بی بی ام المؤمنین ھاجرہ کا قصہ مشہور ہے۔

كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (١٧) اُولٰٓئِكَ

ہووے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی وہ لوگ

اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ (١٨) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ (١٩)

ہیں بڑے نصیب والے اور جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے وہ ہیں کمبختی والے

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ (٢٠)

انہی کو آگ میں موند دیا ہے۔

با کمال انسان کوئی نہیں دکھائی دیتا۔ آپ مکہ میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ مگر آپ کا کوئی وقت مشقت سے خالی نہیں گزرا غرض کہ یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ انسان کے باکمال ہوجانے سے اس سے مشقت نہیں ٹل سکتی۔ یہ انسان کا انتہائی درجۂ کمال تھا۔ اس میں مشقت ہی مشقت ہے۔ یہ پہلی شہادت ہے اور دوسری شہادت آیت ۳ میں آئی ہے۔

آیت (۳) و والد وما ولد :۔ کہ جننے والی کس قدر مصیبت سے بچہ پیدا کرتی ہے اور اِس طرح کس قدر مصیبت سے ماں کے پیٹ سے بچہ نکلتا ہے۔ یہ ہے انسان کی ابتدائی حالت کہ اس جگہ بھی انسان کے لیے مشقت ہی مشقت ہے۔ تو پہلی اور دوسری گواہی (آیت ۱ و ۳) کو ملاکر یہ نتیجہ نکلا کہ انسان کی زندگی مشقت میں گتھی ہوئی ہے (آیت ۴)

آیت (۵) أیحسب ان لن یقدر علیه احد :۔ اس پر تنگی کی جائے گی۔ شرائع کا مکلف ضرور بنایا جائے گا۔ یہ اس کی فطرت کے تقاضے کی تکمیل ہے۔ جو لوگ آرام طلبی کو اپنا مقصد زندگی بناتے ہیں وہ ایک محال چیز کے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بادشاہ بنیں یا بادشاہ کے نوکر یعنی بادشاہ پرست یا سرمایہ پرست بن کر آرام کرنا چاہتے ہیں۔ انسان اپنے دل میں ایسے بہت سے خیالات بنا لیتا ہے کہ میں آرام حاصل کرلوں۔ کیا اس کا خیال ہے کہ وہ اِس قدر خود مختار پیدا کیا گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے واسطے آرام بنالے اور اس کے سر پر کوئی طاقت نہیں ؟

جب انسان ایک بڑے نظام کے ماتحت جکڑا ہوا ہے تو اُسے یہ کبھی خیال نہیں کرنا چاہیے۔

آیت (۶) یقول اھلکت مالا لبدا:۔ وہ شرائع سے آزاد رہ کر اپنے طور پر خرچ کرتا ہے مگر بے سود۔ پھر مایوس ہو کر کہتا ہے کہ میں نے (آرام طلبی) کے لیے بے انداز مال خرچ کیا (مگر آرام نہ پایا)

آیت (۷) ایحسب ان لم یرہ احد:۔ اُس نے خلاف تقاضائے فطرت اور خلاف شرائع کام کیا۔ اس نے جو بے انداز مال لٹا دیا تو اُس سے کبھی آرام حاصل نہیں ہوا۔ انسان اگر شراب و کباب سے عارضی آرام حاصل کر لے تو کیا ہوا۔ اِن باتوں سے دائمی سرور کبھی پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اگر اُس کو آرام کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے بڑی رقم خرچ کر کے آرام حاصل کیا ہے۔ اے انسان، سرمایہ پرست بے عقل، تو نہیں جانتا کہ تیرے دیکھنے والے موجود ہیں۔ تو نے کتنے غرباء کو قلاش کیا۔ تو نے کتنے یتیموں اور مسکینوں کا مال کھایا۔ تو نے اپنے پیٹ میں آگ کو جمع کیا۔ کیا کبھی تجھ کو آرام ملے گا؟ ہرگز نہیں۔

آیت (۸) الم نجعل له عینین:۔ انسان کو غور کر کے اور دیکھ بھال کر روپیہ خرچ کرنا چاہیے تھا۔ کہ پہلے لوگوں نے جو اس طرح روپیہ برباد کیا، کیا اُن کو اِس طرح آرام حاصل ہوا؟ اس کے واسطے ہم نے اُس کو دو آنکھیں عطا کیں تاکہ وہ دیکھ بھال کر چلے۔

آیت (۹) و لساناً وشفتین:۔ اِس کے ساتھ ہم نے انسان کو زبان عطا کی کہ اگر اُسے نظر نہیں آتا تو کسی دوسرے ہی سے دریافت کر لے۔

آیت (۱۰) و ھدیناہ النجدین:۔ اور ہم نے اُسے دو بڑے اُونچے راستے دکھلائے اگر وہ فطرت پر غور کرے تو اُس کو سمجھنے کے لیے ایک اونچا راستہ خود بخود سامنے آجائے گا۔ اور وہ دو راستوں میں سے ایک ہوگا۔ ایک ہے اصلاح عالم اور دوسرا ہے ترقیٔ روحانی۔ نوع انسانی کے لیے کام کرنا پہلا راستہ ہے۔ اِس میں فیل ہونے سے دوسرا راستہ ہاتھ نہیں آتا جیسا سورۃ ماعون میں ہے۔

آیت (۱۱) فلا اقتحم العقبة:۔ وہ شرائع الٰہیہ کے منشاء کے مطابق صرف کیوں نہیں کرتا۔ یہ ہے گھاٹی۔ صبر سے عبور کرنا کامیابی ہے۔ مگر اس کے لیے شرط ہے کہ انسان پہلی گھاٹی پر چڑھے۔ جب تک انسان اس بڑی گھاٹی پر نہیں چڑھے گا اُس کو وہ دونوں راستے نظر ہی نہیں آئیں گے۔

آیت (۱۲) و ما ادراک ما العقبة:۔ وہ مشکل گھاٹی کیا ہے؟ ایک کام ہے۔ فك رقبة یہ کام بڑا ہے۔ اس میں جنگ اور مشقت ہے۔

آیت (۱۳) **فک رقبۃ**:۔ پھنسے ہوئے آدمی کو آزادی دلوانا۔ اگر تم اس جگہ روپیہ صرف کرتے تو تم بے شک آرام اور سکون قلبی حاصل کرتے۔ بھلا شراب و کباب میں روپیہ برباد کرنے سے کیا آرام مل سکتا ہے؟ زبردست آدمی اگر بے گناہ اور مظلوم کی گردن میں پھندا ڈال دے تو اس کو آزاد کراؤ یا کسی مقروض کو اس کے قرضخواہ سے آزادی دلواؤ۔ اگر کسی آدمی یا قوم کو غلام بنا رکھا ہے یا کسی سرمایہ دار نے اسے غلام بنا رکھا ہے تو اس کو آزاد کراؤ تب بھی تم کو دونوں ہدایت کے راستے معلوم ہو جائے۔ اگر انسان پہلا کام نہ کر سکتا تو یہ کرتا کہ گھر میں بیٹھ کر مساکین اور یتیموں کے کھانے کا بندوبست کرتا یعنی سوشل اصلاح کرتا۔

آیت (۱۴ تا ۱۶) **او اطعام فی یوم** الآیات:۔ دوسرا کام ہے کھانا کھلانا۔ بڑا کام تو یہ تھا کہ غلام کو آزاد کراؤ۔ اگر تم میں اتنی توفیق نہیں تو مساکین کو کھانا کھلاؤ۔ غرض یہ دو بڑے راستے ہیں۔ اور ان دونوں کاموں کو اونچی گھاٹی سے تعبیر کیا ہے کہ جب تک بلندی کے اوپر چڑھ کر نہیں دیکھوگے اُن کو نہیں پاسکوگے۔ تم کو اونچی ذہنیت رکھنی چاہیے تاکہ تم انسانی زمرہ میں آسکو۔ ورنہ اپنے کھانے کے لیے اور دوسروں کو شکار کرنے کے لیے ایسے حیوانوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤگے جو انسانیت کے بہت بڑے دشمن ہیں۔ پھر تو تمام انسانوں کی لعنت ایسے سرمایہ داروں پر پڑے گی۔

آیت (۱۷) **ثم کان من الذین آمنو** الآیہ:۔* دوسرا یہ ہے ترقیٔ روحانی۔ اس کا درجہ دوم ہے سرمایہ پرست کے لیے۔ جب انسان نے یہ درجہ طے کر لیا اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد راحت حاصل ہوگئی تو اب اس کی تکمیل یہ ہے کہ وہ اس انٹرنیشنل مرکزی جماعت کا ممبر بن سکتا ہے جو صحیح پروگرام پر عمل کر رہی ہے اور اس پر مشقت کی ڈیوٹی عائد ہے۔ یہ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ یعنی جب تک انسان، انسان نہ بنے تب تک اس کو ایماندار سوسائٹی میں شامل ہونے کی دعوت بھی نہ دی جائے۔ پہلے دو کام انسان بننے کے لیے ضروری ہیں۔ جب انسان بن گیا تو پھر ایماندار جماعت میں شامل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ایماندار جماعت کے پروگرام کا جزٔ ہے انسانیت۔

---

* ترقیٔ روحانی اکثر جگہ قرآن میں دوم نمبر پر آتی ہے اور اکثر جگہ اول تو اس کا مطلب ہے اختلاف طبائع۔ سرمایہ پرست کو اولاً سوشلزم کی دعوت ہے پھر ایمان اور صلواۃ کی۔ ع گرالحمد بخوانی صدمی خوانند الخ۔ اور غرباء کو اولاً دعوت ہے ایمان اور صلواۃ کی۔ سرمایہ پرست گرگ ہے۔ اس کو انسانیت سکھانا ضروری ہے ورنہ اس کی عبادت کسی کام کی نہیں جیسے طوطی کو قرآن خوانی اور بندر کو نماز خوانی فائدہ نہیں دیتی

انسانیت کی تکمیل کا درجہ ہے ایمان باللہ ۔ اور جو مشقت انسانوں کے فائدے کے لیے ہیں اُن کو برداشت کرنا اور پیچھے نہ ہٹنا اور انسانوں پر ماں باپ کی طرح شفقت کرنا ۔ جس شخص کے دل میں انسانوں پر رحم کرنا اور اُن کے راحت کے سامان تیار کرنے کا خیال بھی نہیں اُن کو ایماندار جماعت سے کیا تعلق؟ انسان تو ہمیشہ ایسی جماعت تلاش کرتا ہے جو اُس کے ہم خیال ہوں ۔ جب اُس انسان کو فقط اپنی راحت طلبی مطلوب ہے تو ایسی جماعت جو اپنی راحت کے لیے کام کرتی ہے اور وہ جماعت جو انسانیت کے لیے اپنے آرام پر لات مارتی ہے اُس سے اُس کا کیا تعلق؟

آیت (۱۸) **اولئك اصحاب المیمنہ** :- یہ ہیں یمن (برکت) اور بخت والے لوگ ۔ اُن کو دائمی راحت اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے ۔

آیت ۱۹) والذین کفرو :- اور جو ہمارے ان طریقوں کو چھوڑتے ہیں وہ بدنصیب ہیں ۔

آیت (۲۰) علیهم نارٌ موصدۃ :- اُن کو آگ جلاتی رہے گی ۔ جیسے دنیا میں بے آرام رہے (کہ اصلی سرور میسر نہ ہوا) ویسے ہی آخرت میں بھی بے آرام رہے ۔

سورۃ الشمس مکیۃ و ھی خمس عشرۃ آیۃ

سورہ شمس مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پندرہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا (۱) وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۲) وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا (۳) وَالَّيْلِ

قسم سورج کی اور اس کے دھوپ چڑھنے کی اور چاند کی جب آئے سورج کے پیچھے اور دن کی جب اسکو روشن کرے اور

اِذَا يَغْشٰهَا (۴) وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا (۵) وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۶) وَنَفْسٍ

رات کی جب اس کو ڈھانک لیوے اور آسمان کی اور جیسا کہ اس کو بنایا اور زمین کی اور جیسا کہ اس کو پھیلایا اور

وَّمَا سَوّٰهَا (۷) فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (۸) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (۹)

جی کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک بنایا پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ کر چلنے کی، تحقیق مراد کو پہنچا ←

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۱۰) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ (۱۱) اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا (۱۲)

اور نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں ملا چھوڑا جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں کا ←

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا (۱۳) فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۥ فَدَمْدَمَ

پھر کہا ان کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی پینے کی باری سے پھر انہوں نے اسکو ←

عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا (۱۴) وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۱۵)

پھر الٹ مارا ان پر ان کے رب نے بسبب ان کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو اور وہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے۔

بسم اللّٰہِ الرّحمٰن الرحیم ٥

سورۃ الشمس مکیۃ

انسانیت کا خلاصہ ہے انسان کا ارادہ ۔ اس سے انسان کی قیمت معلوم ہوتی ہے ۔ ارادہ ، پیدا کرنے والے سامان کا ایک حصہ ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے دل میں چھوٹے چھوٹے خطرات پیدا ہوں ۔ ایک ھلکا سا خیال جو پانی کی بوند کی طرح اِنسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اُسے خطرہ کہا جاتا ہے ۔ پانی کی بوندوں سے دریا بن جاتے ھیں اور پھر ھر ایک چیز کو بہا لے جاتے ھیں ۔ اسی طرح انسان کے دل میں خطرات پیدا ہوتے ھیں اور وہ جمع ہوکر ارادہ پیدا کر دیتے ھیں ۔ اگر اچھا ارادہ پیدا کردیا تو وہ اچھا آدمی ہے ۔ اور اگر برا ارادہ پیدا کردیا تو وہ برا آدمی ہے ۔ اِس درجہ (بھلے اور برے) میں بھی انسان کی تمیز ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کے دل میں اچھے اور برے خطرات کیوں پیدا ہوتے ھیں او کہاں سے پیدا ہوتے ھیں ۔ اِس کا تفصیل سے جواب دینا ناممکن ہے ۔ زمین و آسمان کے خالق کے سوائے کوئی شخص خطرات پیدا ہونے کے اسباب معین نہیں کر سکتا ۔ مجمل طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اِس کائنات کا جو نظام ہے انسان اُسکا ایک جزء ہے ۔ اور وہ اِس مجموعی نظام سے باہر نہیں نکل سکتا ۔ اِس نظام کے مختلف * اثرات سے مختلف خطرات انسان کی طبیعت میں پیدا ہوتے ھیں ۔ اب اگر وہ خطرات اچھے سمجھے جاتے ھیں تو سمجھیے کہ یہ انسان اس نظام میں بہت اونچے درجے والا ہے ۔ یعنی اِس نظام میں اُس کا بہت بلند درجہ ہے ۔ اور اگر خطرات ایسے ھیں کہ اِس سے برا اِرادہ پیدا ھوا تو سمجھیے کہ اُس انسان کا درجہ اِس نظام سے نیچے ہے ۔ خطرات کی نوعیت کو معین کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے (یعنی اُس کی قدرت سے باہر ہے) اِس لیے انسان کے بس میں تو وہ چیز ہوتی ہے جو اُس کے ارادہ کے اندر ہو ۔ اور یہ خطرات ایسے ھیں کہ وہ خود ارادہ کو پیدا کرتے ھیں ۔ جس اصول پر یہ نظام مختلف چیزیں پیدا کرتا ہے (جیسے سورج

---

* سوسائٹی ۔ ملک ۔ آب و ھوا ۔ ضروریاتِ معاشرہ ، وسائل اور جسمانی طاقت اور عقل کے مد نظر پیدا ہوتے ھیں ۔

ہے کہ روشنی دینے میں اُس کے مختلف درجے ہیں) اِسی طرح یہ نظام مختلف قسم کے اِنسان پیدا کرتا ہے ۔ تو یہ حصہ کہ یہ مختلف کیوں بنتے ہیں ، انسانیت کے علوم سے خارج چیز ہے ۔ اولاً خطرات پیدا ہوتے ہیں پھر جن خطرات کو عقل مستحسن سمجھتی ہے اُس کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے ۔ اگر مضبوطی سے اُنہوں نے جگہ کرلی تو عقیدہ پیدا ہوتا ہے اور عقیدے سے ارادہ پیدا ہوتا ہے ۔ اور ارادہ سے عمل ۔ یہ درجات ہیں عمل کے ۔ اگر ان خطرات کو عمل نے جگہ نہ دی تو وسوسہ کہلاتا ہے ، اور قدرے جگہ دی تو ظن ہوا اور اگر اُس سے بڑھا تو شک ہوا ۔ اور مضبوط ہوا تو عقیدہ ہے ۔ انسانی علوم میں پہلا درجہ یہ ہے کہ اُس میں یہ تمیز پیدا ہو کہ کون سا ارادہ اچھا ہے اور کون سا ارادہ برا ہے ۔ یعنی انسان اپنے ارادہ کی صحیح قیمت سمجھ لے ۔ اچھے برے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کا نمبر اول ۔ دوم اور سوم ہے ۔ اُس سے زیادہ کوئی مطلب نہیں ہے ۔

اِس سورت کے شروع میں خطرات کے اسباب گنا دیے گئے ہیں اُن سے انسان خود اندازہ کر سکتا ہے کہ تمام انسان ایک قسم کا ارادہ پیدا ہی نہیں کر سکتے :۔

آیت (۱) **والشمس وضحٰها**:۔ * سورج اور اُس کی روشنی گواہ ہے ۔ سورج اور اُس کی روشنی انسان کے دل میں خطرات پیدا کرتی ہے ۔ انسان کے علم کو روشن کردیتی ہے ۔ اور اُس کی گرمی اور روشنی سے متاثر ہوکر انسان کے دل میں خطرات پیدا ہونے شروع ہوجاتے ہیں ۔ تو سورج اور اُس کی روشنی کا اثر تمام انسانوں پر یکساں کبھی نہیں ہوتا اِس لیے یہ توقع رکھنا کہ تمام انسان ایک ہی قسم کے خطرات کیوں پیدا نہیں کرتے یہ عبث ہے ۔

آیت (۲) **والقمر اذا تلٰها**:۔ اور چاند جب کہ اُس سے پیچھے آتا ہے تو یہ بھی اسی طرح خطرات پیدا کرنے کا مستقل سبب ہے ۔

آیت (۳) **والنهار اذا جلّٰها**:۔ اور دن جب کہ آئے سورج چمکادے ۔ یعنی سورج کے چمکنے سے دن پیدا ہوتا ہے ۔ تو دن بہت روشنی والا مراد ہے ۔ اب اس تیز روشنی سے مختلف قسم کی روشنیاں پیدا ہوجاتی ہیں ۔ نباتات ، حیوانات اور انسان کے مختلف نظام دن کو سمجھ میں آجاتے ہیں ۔ اُن کی حرکتیں ۔ اور اُن کا نظام وغیرہ بہت سی چیزیں سمجھ میں آنے لگ جاتی ہیں ۔

آیت (۴) **والیل اذا یغشٰها**:۔ اِس طرح جب رات سورج کو ڈھانپ لے تو مختلف ستارے اور زمین کی مختلف چیزیں ایسی پیدا ہوتی ہیں کہ اُن سے آگے مختلف قسم کی چیزیں اور پیدا ہوتی ہیں اور اس سے مختلف قسم کے خطرات پیدا ہوتے ہیں ۔

---

* اول روشنی طلوع کے وقت ۔

آیت (۵) والسماء وما بناها * اور آسمان جس حکمت سے بنایا گیا ہے اور اس میں جو نظام قائم ہے اگر انسان اس کی حکمت غور کرنے لگے تو اس کے دل میں مختلف قسم کے خطرات آئیں گے یعنی اگر وہ سلسلہ علل پر غور کرے گا تو کسی نظام میں پریشان ہوگا اور کسی میں یقین کرے گا وغیرہ۔

آیت (۶) والارض وما طحٰها:- † اور زمین اور وہ حکمت جس نے اس کو پھیلادیا ہے۔ زمین کے پھیلنے کے بعد علل یعنی معلومات کا سلسلہ سامنے آجاتا ہے کہ نباتات سے حیوانات اور حیوانات سے انسان بنے۔

آیت (۷) و نفس وما سواها±:- اور انسانی نفس۔ نفس سے مراد ہے انسان کی انانیت جسے انسان انا (یعنی میں) سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس حکمت کو دیکھیے جس نے اسے برابر بنایا یعنی انسانی نفس کو درست کیا ہے، تو اس کو ایک شیشہ کے مانند سمجھیے کہ بعض میں اثر دیر سے ہوتا ہے اور بعض میں کم۔ خطرات تو باہر سے آتے ہیں مگر ان کا اثر مختلف ہوتا ہے۔

آیت (۸) فالهمها فجورها و تقواها:- نفوس انسانی میں فرق ہے۔ انسان کے دل میں جو خطرات باہر سے یا الہام کے ذریعے جمع ہوتے ہیں، ان کے متعلق جو انسان میں قوت فیصلہ ہے وہ فیصلہ کرتی ہے یعنی وہ بعض خطرات کو اچھا سمجھتی ہے اور بعض کو برا۔ پہلے کسی چیز کو انسان کی طبیعت اچھا سمجھتی ہے مگر بعد میں وہ سمجھتی ہے کہ اس نے غلطی کی۔ تو ان نفوس میں بھی انسان مختلف درجے کے ہیں اور ایک درجہ پر نہیں ہیں۔

آیت (۹ و ۱۰) قد افلح من زکٰها:- یہ تمام چیزیں (۱ تا ۸) اس بات پر گواہ ہیں کہ جس شخص نے اچھا ارادہ کیا وہ کامیاب ہوگیا۔ یعنی جس نے اپنے نفس کو پاک بنایا وہ کامیاب ہوگیا۔ اور اس شخص نے نقصان اٹھایا جس نے اپنے نفس کو نیچے گرایا۔ یہ انسانیت کے اصول میں سے ایک چیز ہے جس کی انسان کبھی خلاف ورزی نہیں کرسکتا اور یہ کہ انسان نے جو خطرات اپنی طبیعت میں جمع کیے ہیں یعنی ان اسباب کی علتیں نظام قدرت ہیں۔ وہ اگر نفس کو ترقی دینے والے ہیں تو انہیں

---

* الہیات کے عالموں کے لیے ہے کہ ان تینوں آیات (فقط سما۔ ارض۔ نفس)۔ کو نہ دیکھو بلکہ اس حکیم قادر کو بھی دھیان میں رکھو۔ اسی طرف اشارہ ہے۔

† طبقات الارض کے ماہروں کے لیے۔

± سیکالاجی کے علما کے لیے۔

انسان اچھا سمجھتا ہے اور اگر وہ انسان کو پیچھے ہٹانے والے ہیں تو نفس اُن کو برا سمجھتا ہے۔ یہ نوع انسانی کا فطری تقاضا ہے۔ اس کا پہلے ذکر ہوچکا ہے کہ ایک فرد کے لیے خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے نوعی خواص کا زیادہ جامع ہو۔ فرد کے اچھے ہونے کا فقط یہی مطلب ہے۔ اب ہر بڑھنے والے انسان کے لیے جس کے پاس اس قدر خطرات جمع ہیں کہ وہ اُس کو آگے بڑھاتے ہیں اور ترقی دیتے ہیں تو انسانی نوع کا فیصلہ ہے کہ آگے بڑھیں اور ترقی کریں۔ اسی طرح نوع انسانی کا فیصلہ ہے کہ ہر پیچھے ہٹنے والے انسان کی ترقی روک دی جائے۔

اب نوع انسانی کی ترقی کا تقاضا یہ ہے کہ برے خیالات کا جو مجموعہ پیدا ہوچکا ہے اُس کی ترقی، کو روک دیا جائے۔ اور جو علتیں خطرات پیدا کرنے والی ہیں اُن کا تقاضا یہ ہے کہ خطرات کی رفتار قائم رہے اور اسے ختم نہ کیا جائے۔ اب اِس جگہ دو متعارض (مخالف) عاتیں اکٹھی ہوگئیں۔ ایک اُن کو پیچھے لے جانا چاہتی ہے اور ایک چیز اُن کے پیچھے جانے کو روکنا چاہتی ہے۔ اس انسانی نفس کے گرداگرد جس قدر مصلحتیں جمع ہیں اُن کا عام تقاضا جب تک خطرات کے اسباب کے موافق ہوگا انسانی نوع کا تقاضا مغلوب رہے گا اور ظاہر نہیں ہوگا۔ اور جہاں مصالح عامہ کی تائید خطرات کے اسباب کے لیے جو حاصل تھی ختم ہوگئی تو اُسی وقت انسان کا نوعی تقاضا اپنا کام کرجائے گا اور اُس کی ترقی بند کردی جائے گی۔

آیت (۱۱) **کذبت ثمود بطغواھا**:- اب اس قاعدہ کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال ہے کہ ثمود نے حدود انسانیت سے باہر قدم رکھ کر اپنے نبی کی تعلیم کا اِنکار کردیا (جھٹلایا)۔

آیت (۱۲) **إذانبعث أشقاھا**:- ثمود کے قبیلہ کا بدترین انسان کھڑا ہوا، یہ امیر تھا۔ سرمایہ اور مویشی اُس کے پاس بہت تھے۔

آیت (۱۳) **فقال لھم رسول اللہ الایۃ**:- یہ اونٹنی اور اُس کے پانی پینے کا قانون الٰہی قانون ہے۔ اس نظام کے ذریعے سے اس زبردست قوم میں جو غریب لوگ رہتے تھے اُن کے اونٹوں کو پانی کا سامان ملتا تھا۔ اور اِس طرح ظالموں کی قوت کو کم کرنے کے لیے یہ اونٹنی ایک میزان تھی۔

آیت (۱۴) **فکذبوہ فعقروھا**:- اُنہوں نے اونٹنی کو ذبح کردیا۔ یہ لوگ غرباء کو چوپایہ مال رکھنے نہیں دیتے تھے۔ اگر کسی کے پاس ہوتا تو پانی پر قیود ڈالتے اور بہت دنوں کے بعد اُن کی باری آتی۔ **فدمدم علیھم ربھم**:- تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو برابر یعنی ختم کردیا۔ یہ نوع انسانی کا تقاضا تھا کہ ایسی قوم کو زیادہ تنزل کی

طرف نہیں دینا چاہتی۔ بظاہر یہ پوری قوم ایک اونٹنی کے ہلاک ہونے کی وجہ سے ہلاک کی گئی۔

آیت (۱۵) ولا یخاف عقبٰھا:۔ مگر اس نظام قدرت پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ ایک چھوٹی سی مصلحت پر بڑی مصلحت قربان کردی گئی۔ اِس آیت میں اُس کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُس واقعہ کی عاقبت سے کوئی ڈر نہیں ہے۔ عام طبیعتوں میں جو اِس واقعہ سے نظام قدرت میں اعتراض پیدا ہو سکتا ہے وہ اعتراض اِس جگہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام نوع انسانی کا جو نظام تھا اُس کو توڑنے کی پاداش میں یہ لوگ ہلاک کیے گئے۔ اونٹنی تو صرف ایک مجسم یعنی مثال ہے۔ اس لیے عقلمند آدمی اس پر کبھی اعتراض نہیں کر سکتے۔

یہ خدائی اونٹنی جو صالح علیہ السلام کی دعا سے تھی اُس سے اُن کو یقین آگیا تھا کہ صالح علیہ السلام، اللہ کے فرستادہ ہیں اور جو کچھ وہ ہم کو بتاتے ہیں راست ہے، اس سے اُن کو بصیرت آگئی تھی۔ مگر سرمایہ پرستی نے اُن کو اندھا کردیا تھا۔ وہ مساکین سے مال چھین لیتے تھے۔ چونکہ اس ناقہ کی باری میں وہ طبقہ غربا کا پانی پیتا تھا اور دولتمندوں کا چوپایہ پانی کے قریب نہیں پھٹکتا تھا، یہ معجزہ حسب حال اُن کے تھا۔ مگر سرمایہ پرستی کے خطرات اُن میں بہت جمع ہوگئے تھے، اس لیے اُنہوں نے اس ناقۃ اللہ کو ذبح کرڈالا اور اپنے غصہ کو اس طرح فرو کردیا، تو عذاب قدرتی نے اُن کو تباہ کیا۔

سورة الليل مكية وهي احدى وعشرون آية

سورہ اللیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی اکیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى (۱) وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى (۲) وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۳)

قسم رات کی جب چھا جائے اور دن کی جب روشن ہو اور اس کی جو اس نے پیدا کیے نر اور مادہ

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (۴) فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۵) وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى (۶)

تمہاری کمائی طرح طرح پر ہے سو جس نے دیا اور ڈرتا رہا اور سچ جانا بھلی بات کو

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى (۷) وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى (۸) وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى (۹)

تو اسکو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے آسانی میں اور جس نے نہ دیا اور بے پروا رہا اور جھوٹ جانا بھلی بات کو

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (۱۰) وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى (۱۱) اِنَّ

سو اسکو ہم سہج سہج پہنچا دیں گے سختی میں اور کام نہ آئے گا اسکے مال اسکا جب گڑھے میں گرے گا

عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (۱۲) وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۱۳) فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى (۱۴)

ہمارا ذمہ ہے راہ سمجھا دینا اور ہمارے ہاتھ میں ہے آخرت اور دنیا سو میں نے سنادی تمکو خبر ایک بھڑکتی آگ

لَا يَصْلٰىهَاۤ اِلَّا الْاَشْقٰى (۱۵) الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (۱۶) وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰى (۱۷)

کی اس میں وہی گرے گا جو بڑا بدبخت ہے جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور بچا دیں گے اس سے بڑے ڈرنے والے کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

سورۃ اللیل مکیۃ

انسان کی قوت ارادیہ پر جو مضمون پچھلی سورت میں تھا۔ یہ سورت اس کا تتمہ ہے۔ پہلے فقط ارادہ پر بحث کر چکے ہیں۔ اب جب ارادہ جاننے کے بعد انسان کام کرتا ہے تو کام کی تفاصیل پر بھی نظامِ قدرت اسی طرح مؤثر ہوتا ہے جس طرح اس نے خطرات ڈالنے میں کام کیا تھا۔

مثال کے طور پر دو آدمی لیجیے کہ وہ ایک ہی ارادہ لے کر کام کرنا چاہتے ہیں مگر دونوں کا ماحول مختلف ہے یعنی ایک سرد اور دوسرا گرم ملک میں ہے۔ یا وہ کسی اور مختلف قسم کے ماحول میں رہتے ہیں تو ان مخالف ماحولوں کے اثرات سے انسان کے کام کے نتائج بھی مختلف قسم کے ہو جائیں گے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ ہم جب دو انسانوں کے مختلف کام دیکھتے ہیں تو اس اختلاف کی علتیں دو علیحدہ علیحدہ درجوں میں نظر آتی ہیں۔ چونکہ ارادے مختلف تھے۔ اس واسطے کام کے نتائج بھی مختلف ہوں گے اور یہ ارادوں کے اندرونی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے کہ خطرات مختلف تھے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ عمل کے ماحول کے مختلف ہونے سے عمل میں بھی اختلاف پیدا ہو جائے گا۔

آیت (۱ و ۲) و اللیل اذا یغشیٰ و النھار اذا تجلیٰ:- یہ ہے عمل کے ماحول کے اختلاف سے پیدا ہونا۔ ایک کام اگر رات کو کیا جائے یا دن کو کیا جائے، وہ اگرچہ ایک ہی چیز ہے مگر اس میں اختلاف ہونا ضروری ہے۔ دن والا کام بنسبت رات کے زیادہ مکمل ہوگا۔

آیت (۳) و ما خلق الذکر و الانثیٰ:- اور جس حکمت سے نر اور مادہ پیدا کیا۔ نر اور مادہ کی داخلی قوتوں میں اختلاف ہے۔ ارادہ کے اندر جو خطرات ہیں یہ ان کی مثال ہے۔

آیت (۴) ان سعیکم لشتیٰ:- یہ دونوں چیزیں گواہ ہیں کہ تمہاری کوشش اور اعمال مختلف ہیں اور یہ ایک ہو ہی نہیں سکتے۔ ارادے کے جوہر، اختلافات سے اور عمل کے ماحول کے مختلف ہونے سے کھل جائیں گے۔ اب ان اعمال سے جو

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (۱۸) وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی (۱۹)

جو دیتا ہے اپنا مال دل پاک کرنے کو اور نہیں کسی کا اس پر احسان جس کا بدلہ دے

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (۲۰) وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی (۲۱)

مگر واسطے چاہنے مرضی اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے اور آگے وہ راضی ہوگا۔

نتائج نکلیں گے اُن کا سلسلہ آخر تک نکلتا جائے گا۔ اب آگے چل کر انبیاء کی تعلیم سے انسان دو قسم کے بن گئے۔ اور آگے جنت اور دوزخ میں مختلف ہوں گے، تو یہ سارے ماحول کے اختلاف کے باعث ہیں۔ اور نہ تمام اختلافات انسانی فطرت کے ذاتی تقاضے ہیں۔

مختلف اعمال سے جو مختلف نتائج نکلتے ہیں ان پر بحث کی جارہی ہے:-

آیت (۵) فاما من اعطیٰ:- جس نے اچھے کام کیے مثلاً محتاجوں کی رفع ضرورت کے لیے روپیہ دیا۔ واتقیٰ اور انصاف قائم کرنے میں مؤید ہوا۔

آیت (۶) و صدق بالحسنیٰ:- اور اس نے اچھی بات کی تصدیق کی یعنی ایک شخص کے دماغ میں جو خطرات جمع ہوئے اور عمل کے لیے جو ماحول میسر ہوا اس نے یہ نتیجے پیدا کردیے۔ اچھے اخلاق پیدا کرنا اور اچھے اعمال کرنا انسانی فرائض سے سمجھتا ہے اور عملاً اس کی تصدیق کرتا ہے۔

آیت (۷) فسنیسرہ للیسریٰ:- جب یہ عمل ہوا تو اس کا نتیجہ بھی چاہیے تو ہم اُس کے لیے آسان موقع بھی پیدا کر دیں گے۔ روحانی اور اخلاقی ترقی، تدبیر منزل وغیرہ۔

آیت (۸) و اما من بخل و استغنیٰ:- اور اس کے خلاف جس شخص کے خطرات اور ماحول نے ایسے عمل پیدا کرائے جن کا اس آیت میں ذکر ہے کہ یہ شخص روپیہ کماتا ہے مگر محتاجوں کی ضرورت میں خرچ نہیں کرتا (بخل) اور چونکہ اُس کے ساتھ ظلم نہیں ہوتا اس واسطے وہ انصاف کا خواہشمند نہیں ہے (استغنیٰ)۔

آیت (۹) و کذب بالحسنیٰ:- اور اچھی بات کی قدر نہیں کرتا۔ غریبوں سے مال حاصل کرتا ہے اور پھر اُن کے کھانے کا بندوبست نہیں رکھتا۔ یہ شخص کسان سے کمتر عقل رکھتا ہے۔ کسان بیلوں کے ذریعہ اناج پیدا کرتا ہے مگر اُن کو موٹا تازہ

رکھتا ہے کہ پھر بھی اُن سے کمائی کرنی ہے۔

آیت (۱۰) فسینسرہ للعسریٰ :۔ تو اب ایسے آدمی کے لیے اُس کے عمل کا نتیجہ ہونا ضروری ہے۔ اس واسطے ہم اُس کے آسان راستہ کو بھی مشکل کر دیتے ہیں۔ یہ عام انسانی نوع کا تقاضا ہے۔ اس کا اُس پر اثر ہونا ضروری ہے۔ پہلے راستے سے اُس کا راستہ مساوی نہیں ہو سکتا۔ انسانیت کبھی اُس کا تقاضا نہیں کر سکتی۔ اِس سرمایہ پرست کے سب انسان دشمن بن جائیں گے اور اُس کو قتل کرنے اور تنگ کرنے سے اُس کا قافیہ تنگ کریں گے۔

آیت (۱۱) وما یغنی عنہ مالہ إذا تردیٰ :۔ اب غلط روی کی مصیبت آنے اِس واسطے آئی کہ اُس نے مال کو ٹھیک جگہ پر صرف کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس واسطے جب وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرے گا تو اُس کا مال اُس کے کسی کام نہیں آئے گا۔

آیت (۱۲) إن علینا للھدیٰ :۔ اسی طرح انسانی اعمال سے جب مختلف نتیجے پیدا ہوتے ہیں تو لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری ہدایت کے عنوان بدل جاتے ہیں۔ انسانی نوع پر جو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ انسان کی رہبری کی جائے چنانچہ جو ہدایت کرنی ہے وہ ہم نے انبیاؑ کے ذریعہ کردی ہے۔

آیت (۱۳) و إن لنا للآخرة والاولیٰ :۔ اور ہمارے ہی لیے ہیں دوسرے اور پہلے نتائج۔ دونوں کا انتظام ہم نے کردیا۔ ایک چیز کا پہلے ایک نتیجہ نکلے گا پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔ اسی طرح یہ تمام ہمارا بنایا ہوا نظام ہے۔ اور سب کا رجوع ہمارے طرف ہے۔

آیت (۱۴) فانذرتکم ناراً تلظیٰ :۔ اب ہماری رہبری کا عنوان بدل گیا کہ ہم اُن لوگوں کو اُن کی غلط روی سے ڈراتے ہیں۔

آیت (۱۵) لا یصلھا إلا الاشقیٰ :۔ وہ جھٹلاتا ہے۔ غرض ڈرانے اور دھمکانے سے آگے چل کر لڑائی ہو جائے گی۔ تو یہاں فقط انسان کی ہدایت کا عنوان بدل گیا ہے یعنی ہم ڈراتے ہیں کہ دوزخ میں وہ بدبخت گرے گا، جس نے جھٹلایا اور پھر مقابلہ کرنے پر تیار ہوگیا۔ دیکھو غلط راستے پر چلنے والے کو ڈرانے سے ہدایت دیتے ہیں تاکہ یہ سمجھ جائے۔ یہ دھمکی ری اکشنری طاقت کو روکتی ہے۔ اور اگر دھمکی سے نہ رکے گی تو پھر لڑائی شروع ہوجائے گی۔

آیت (۱۷ تا ۲۰) وسیجنبھا الاتقی الذی :۔ مال حاصل کرنے میں بعض اوقات فرو گزاشت ہوجاتی ہے۔ معاملات میں حقوق کا پورا حساب نہیں ہو سکتا تو اِس کا کفارہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو مال کی ضرورت ہے اُن کو کسی معاوضہ کے بغیر وہ روپیہ دیاجائے۔ اِس کا کسی پر احسان نہیں ہے کیوں کہ وہ اِس کا کفارہ دے رہا ہے۔

آیت (۲۰) الا ابتغاء وجہ ربہ الا علیٰ :- اعلیٰ رضا یہ ہے کہ فقط اعلیٰ اوصاف پیدا کیے جائیں - وہ فقط انصاف کے قائم رکھنے کے لیے اپنے نفس پر جرمانہ کرتا ہے .

آیت (۲۱) ولسوف یرضیٰ :- جب اللہ تعالیٰ اِس قانون کو قائم رکھے گا تو اِس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ بھی اُس سے راضی رہے گا - اُس کے کام چونکہ انسانی نوع کی ترقی کے مطابق ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اُن کو ترقی دی جائے - مفسرین نے اِس جگہ یہ غلطی کی ہے کہ ان آیات کو خاص خاص صحابہ کے حالات پر منطبق کردیا ہے - اور حالت یہ ہے کہ یہاں کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ایک قاعدہ بتایا جا رہا ہے - مگر اُن مثالوں سے شیعہ اور سنی کے جھگڑے برپا کرنے کا سامان بہم پہنچ گیا ہے .

سُوْرَةُ الضُّحیٰ مَكِّيَّةٌ وهِیَ اَحْدیٰ عشرة آیة

سورهٔ الضحیٰ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان ، نہایت رحم والا ہے

وَالضُّحٰی (۱) وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۲) مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَ مَا قَلٰی (۳) وَ

قسم دھوپ چڑھتے وقت کی اور رات کی جب چھا جائے نہ رخصت کر دیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا اور

لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی (۴) وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (۵)

البتہ پچھلی بہتر ہے تجھ کو پہلی سے اور آگے دے گا تجھ کو تیرا رب پھر تو راضی ہوگا

اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی (۶) وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی (۷) وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا

بھلا نہیں پایا تجھکو یتیم پھر جگہ دی اور پایا تجھکو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی اور پایا تجھکو مفلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سورة الضحیٰ مکیة

پچھلی دونوں سورتیں قرآن مجید کی حکمت کے اصول میں نہایت اعلیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ اس مشکل مسئلہ کو اس وضاحت سے نہ تو کسی حکمت کی کتاب نے اور نہ کسی کتبِ الٰہی نے حل کیا ہے۔ مگر اُن موٹی عقل والوں کا برا ہو کہ وہ فلسفے اور حکمت کے نام سے قرآن مجید کی آیات کو حل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور عام مفسرین کی یہ حالت ہے کہ وہ لے دے کر یہ کہتے ہیں کہ یہ سورتیں حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی فضیلت میں آئی ہیں اور یہی اُن کا آخری تیر ہے۔ مانا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضہ کو ان آیات سے مناسبت تھی مگر ان آیتوں کو کسی خاص شخص کے فعل سے کیا تعلق؟ اور جو جھگڑے اسلام میں پچاس برس بعد پیدا ہوئے بلکہ کوئی سو یا ڈیڑھ سو برس بعد پیدا ہوئے، وہ تمام جھگڑے قرآن مجید میں لا کر رکھ دیے گئے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو آدمی قرآن مجید کو پڑھنا چاہے وہ پہلے ان جھگڑوں سے نمٹ لے اور اس کے بعد قرآن مجید پڑھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اختلاف اصل میں سیدنا عثمان رضہ سے ہوا تھا۔ مگر شیعوں (حضرت علی رضہ کے طرفدار لوگوں) نے سو برس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضہ اور حضرت عمر رضہ پر بھی اعتراض کرنے شروع کر دیے۔ ان آیات کو جب حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی شان میں خاص کر دیا جائے تو جو لوگ صحابہؓ کرام کے مخالف ہیں (یعنی شیعہ) وہ اِس جھگڑے میں گویا قرآن مجید پڑھنے سے محروم ہوگئے۔

نبی اپنے زمانے میں انسانیت کا مجسم ہوتا ہے۔ اُس کے حالات سے عام انسانی مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور حکمت انسانی شروع کرنے والے لوگوں کے لیے پہلے اُنھی مثالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اب انسانیت کا ایک عام مسئلہ ہے کہ انسانیت ہمیشہ علم کی روشنی میں ترقی کرتی ہے۔ اور انسانیت پر جو تنزل کے دور آتے ہیں وہ عارضی ہوتے ہیں، اُس کے طبعی ارتقاء کو روکا نہیں جا سکتا۔ یہ مسئلہ اِس سورت میں بتلایا گیا ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال میں۔

فَاَغْنٰی (۸)ؕ فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (۹)ؕ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۱۰)ؕ وَ اَمَّا

پھر بے پروا کر دیا سو جو یتیم ہو اُس کو مت دبا اور جو مانگتا ہو اُس کو مت جھڑک اور جو

۱ ع ۱۸ بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (۱۱)ع

احسان ہے تیرے رب کا سو بیان کر

شروع نبوت میں اتفاقی واقعہ ہوا کہ وحی چند روز آ کر رک گئی۔ مکہ کے مخالف لوگوں نے استہزا شروع کر دیا۔ اور آپ کی طبیعت پر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ آپ کا جی چاہتا تھا کہ پہاڑ کے اوپر چڑھ کر اپنے آپ کو نیچے گرا دیں اس حالت میں روح القدس آپ کو تسلی دیتے ہیں اور آپ یہ خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ پریشانی آپ کو تقریباً چالیس دن تک رہی۔ اور اس پریشانی کے ختم ہونے پر یہ سورت نازل ہوئی۔

آیت (۱) والضحیٰ :- جس طرح دوپہر کے وقت دن تیز ہوتا ہے، اُس کی قسم ہے۔

آیت (۲) واللیل إذا سجیٰ :- اور رات جب وہ اندھیرا کر دے، وہ گواہ ہے کہ

آیت (۳) ما ودعك ربك و ما قلیٰ :- تیرے پروردگار نے نہ تو تجھے چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے ناراض ہوا۔ یعنی جس طرح دوپہر کے بعد رات آتی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بعد دوسرا دن ہی نہیں آئے گا۔ دن کے بعد رات کا نہ آنا بذاتِ خود نظام کی بربادی ہونے کی دلیل ہے۔ تو اس سے یہ نتیجہ کبھی نہ نکالنا چاہیے کہ ترقی کے بعد اگر چند روز حالت اس کے برخلاف ہو جائے تو یہ سمجھ لیا جائے کہ بس اب ترقی بند ہو گئی۔ جیسے رات کے بعد دوسرا دن اُس کی تکمیل کر دیتا ہے۔ ایسے ہی اس بندش وحی کے بعد جو وحی آئے گی وہ اس بندش کی تکمیل کردے گی۔ اور آئندہ تیری تعلیم کی ترقی کے دور بھی اسی طرح ہوں گے جس سے انسانیت ترقی کرے گی۔

آیت (۴) و للآخرۃ خیرلك من الاولیٰ :- پہلی حالت کی بنسبت تیرے لیے پچھلی حالت بہتر ہے۔ یہی ارتقا ہے کہ ہر پچھلی حالت پہلی حالت سے اچھی ہو۔ عام مفسرین نے اس کو دنیا اور آخرت پر محمول کرکے اس کے مضمون کو ذرا کمزور کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر پچھلی حالت پہلی حالت سے اچھی ہوتی رہے گی۔

یہاں تک کہ جو کچھ تیرا مقصد ہے وہ پورا ہو جائے.

آیت (۵) ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ:- تجھے تیرا پروردگار دے گا، اور تو راضی ہو جائے گا۔ اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول نبوت کے زمانے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں کوئی مقصد تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ ہماری قوم کی جو بری حالت ہے وہ دور ہو جائے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی جو دعا ہے وہ میرے حق میں پوری اترے اور وہ کام میں کروں۔ اس لیے کہ یہ لوگ (عرب) اس دعائے ابراہیمی کو نسل در نسل نقل کرتے چلے آئے ہیں۔ بعینہ اسی طرح جس طرح آج کل مسلمان حضرت مہدی کا انتظار کر رہے ہیں.

غرض اس میں وعدہ دیا گیا ہے کہ اے رسول! تیری حالت میں ارتقا ہوتا جائے گا، یہاں تک کہ تیرا مطلب پورا ہو جائے.

دوسری قوموں سے مباحثہ کرنے والے مسلمانوں نے نبوت کے یہ معنی مقرر کیے ہیں کہ نبی کے دل میں کوئی خیال نہیں ہوتا۔ اور خدائے تعالیٰ اپنی طرف سے نبی کے دل میں زبردستی ایک بات ڈال دیتا ہے. ان مباحثہ کرنے والے مسلمانوں کے اس قاعدہ کا لحاظ رکھ کر ان کے مقلد یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ اب اِس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ اس واسطے وہ اب اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مقصد یہ تھا کہ آپ قیامت کے دن اپنی امت کو بخشوا لیں گے۔ مناظرہ کرنے والے اِس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ جو آدمی کوئی کام کرے، اس میں پہلے اس کام کرنے کی استعداد ہونی چاہیے۔ اِسی طرح نبی جو نبوت کا کام سر انجام دے گا اس کے لیے نبوت کی استعداد ضروری چیز ہے۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت میں طبعی طور پر یہ بات آئے گی کہ ان کی قوم ذلت سے بچے۔ اور ان کی قوم میں جو تاریخی فخر رکھا گیا ہے وہ قوم کو حاصل ہو۔ امت کے بخشوانے کا مسئلہ زیادہ تر مسیح علیہ السلام کے کفارہ کی نقل ہے اور یہ دوسری صدی کے بعد ہوا، جب مسلمان عیسائی قوموں سے ملے.

آیت (۶) الم یجدک یتیماً فاویٰ:- آپ کی زندگی کا ابتدائی واقعہ ہے کہ آپ کے لیے بچپن ہی میں مصیبت پڑ گئی۔ آپ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ایسا سامان پیدا کر دیا کہ آپ کے خاندان کا سب سے بڑا آدمی (عبدالمطلب) آپ کی تربیت پر لگ گیا.

لوگوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب نبوت کی تعلیم ختم ہو جائے گی۔ یعنی آپ چونکہ خاتم الانبیاء ہیں اور نبوت کے خاتمے کی طرح اب نبوت کی تعلیم بھی پوری

ہو جائے گی۔ اس واسطے اب یہاں سمجھایا جا رہا ہے کہ لوگوں کو ایسا خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی پر غور کرنا چاہیے کہ آپ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے اور آپ کا یتیم ہونا ایک قدرتی واقعہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پرورش کا خیال پہلے آپ کے دادا کے اور اُن کے بعد آپ کے چچا کے دل میں زیادہ شدت سے ڈال دیا اب آپ کے لیے کوئی ایسا موقع نہیں تھا جس میں آپ کو ترقی نہ ہوئی ہو۔

آیت (۷) **و وجدك ضالاً فهدىٰ**:۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک مقصد تھا۔ آپ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے دماغ پر پورا زور لگاتے ہیں مگر اس کے متعلق کوئی راستہ نہیں پاتے۔ آپ کے دل میں یہ حیرانی اور گمراہی تھی۔ **فهدىٰ** اللہ تعالیٰ نے راستہ کھول دیا اور وحی کا آنا شروع ہوگیا۔ اقوام عالم کی آزادی کا نسخہ مل گیا۔ اس کے دو جز تھے۔ ایک **اقرء** یعنی تعلیم اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی غلامی یعنی **لا الٰہ الا اللہ**۔ کسی کی بادشاہی کا اقرار نہ کیا جائے بلکہ سلطنت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اُس کی ہدایت کی۔

عیسائی اور یہودی وغیرہ اپنے انبیاء کو بشریت کے اوپر فوق العادت ہستی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح اُن کی نقل میں مسلمان بھی انبیاء کی نسبت بشری احکام کا کھلے طور پر آج کل اقرار نہیں کرتے۔ عیسائی مسیح علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں۔ یہودی حضرت عزیر کو خدا کہتے ہیں اور ہنود رامچندر اور کرشن کو خدا کہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی وہی شان الٰہی آجائے۔ مسلمانوں میں اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشریت کی باتیں ذکر کی جائیں (یعنی کہا جائے کہ آپ بشر تھے) تو وہ اسے پسند نہیں کرتے۔

آج کل مسلمانوں پر گمراہی کا لفظ بہت گراں گذرتا ہے۔ اور اب اس کی تاویل بناتے ہیں کہ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پہاڑوں میں کہیں راستہ بھول گئے اور گھر نہیں پہنچ سکے۔ تمام خاندان پریشان رہا اور آپ کی تلاش کرتا رہا مگر آپ نہ مل سکے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی راستہ بتا دیا۔ اور آپ گھر پہنچ گئے۔ یہ بچپن کا واقعہ ہے۔ اور لوگ اس کو اِس آیت کا مصداق بتاتے ہیں۔ قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے **ما كنت تدري بالكتاب ولا الايمان**:۔ تو کتاب (پروگرام) اور قانون و ایمان یعنی نظریات صحیحہ (جس پر پروگرام کی بنیاد رکھی جاتی ہے) نہیں جانتا تھا اور ہم نے وہ تجھ کو بتلائے۔ یہ اس آیت کی صحیح تفسیر ہے۔

آیت (۸) و وجدك عائلاً :- عیال دار آدمی جسے خرچ کے لیے ضرورت ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ غنا اصل میں نفس کی غنا ہے۔ یعنی انسان کا نفس غنی ہونا چاہیے۔ "تونگری بدل ست نہ بمال"۔ اس میں شک نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی مالی ضرورتیں تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک غنی دل دیا تھا اور اُس کا اثر آپ کے اہل بیت پر پڑا (اہل بیت بھی آپ کی طرح غنی دل رکھتے تھے)۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے مگر آپ کے اہل بیت کی بھی یہ حالت تھی کہ وہ تنگی کے موقع پر شکایت لب پر نہیں لاتے تھے۔

بڑے کام کرنے والوں کے لیے اس قسم کی اخلاقی قوت ایک بہت بڑی نعمت الٰہی ہے۔ مفسرین اِس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ آپ کو ایک دفعہ کہیں سے تھوڑا سا مال حاصل ہوا اور وہ آپ نے خرچ کر دیا۔ تو اس آیت کی تفسیر میں اُس تھوڑے مال کا ذکر کرنا ایک بہت بھاری غلطی ہے اس لیے کہ وہ مال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام زندگی کے لیے کبھی کافی نہیں ہو سکتا تھا تو چند روزہ استغنا کا قرآن مجید میں کیسے ذکر ہو سکتا ہے۔ جنگلی قوموں میں یہ عادت ہے کہ جب اُن کا رئیس سخی اور مطعم ہوتا ہے تو اُس کی قوم اپنے مال میں سے کچھ حصہ خود بخود دے دیتی ہے تاکہ وہ خرچ کریں اور ہماری قوم کی ناموری ہو۔ اسی طرح اکثر بنی ہاشم اپنا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ مفسر کو چاہیے کہ ہمیشہ حالات پر نظر رکھے۔

آیت (۹) فاما الیتیم فلا تقہر :- رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طبعی حالات پر اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ عنایت الٰہی آپ کو ترقی کے راستے پر چلا رہی ہے اس لیے چند روزہ وحی کی بندش کو کیسے نقصان سمجھ لیا گیا ہے۔ یتیم کی صفت لازمی ہے بے کسی اور محتاجی۔ یعنی بے کسوں کی ہمت بڑھاؤ، اُن کے پشتیبان بنو۔ اگر آپ نے اُن کی ہمت نہ بڑھائی تو اُن کی کمر ٹوٹ جائے گی:

ع چہ غم دیوار امت را چو باشد نوح پشتیباں۔

چالیس دن کے قریب قریب آپ پر وحی نہیں آئی۔ تو اس کی حکمت یہ تھی کہ اس وحی کی بندش کے زمانے میں اپنے لیے پیروکار جمع کیے جائیں اور اُن کو اپنے پروگرام کی تعلیم دی جائے اور یہ کام ساتھ ساتھ ہوتا چلا جائے۔ جس قدر قرآن مجید نازل ہو، اُسے سمجھنے والی اور سوچنے والی جماعت آپ کے پاس ہمیشہ موجود رہے۔

اب جو پیروکار تلاش کرنے ہیں، اس کے دو درجے ہیں ایک تو یتیموں کے بچے

کہ ان پر سختی کرنی چھوڑدی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بخود جمع ہوتے جائیں گے۔ اور دوسرے سائل۔ یتیم کا لازمی وصف بے کسی ہے۔ بے کس و مظلوم جماعت کی مدد کرو۔

آیت (۱۰) و اما السائل فلا تنہر*:- جو محتاج ہے اور لوگوں سے اپنی حالت بیان کرکے مانگ رہا ہے، اسے مت دھمکاؤ یعنی اس سے اخلاق سے پیش آؤ تو وہ بھی تمہارے پاس جمع ہوتے جائیں گے۔ محتاج کے ساتھ اگر اچھی بات کی جائے تو اس بات سے بھی اس کو سکون ملتا ہے۔ اور طالب علم کو نرمی سے سمجھاؤ۔

آیت (۱۱) اما بنعمت ربك فحدث:- اپنے اللہ تعالیٰ کی نعمت یعنی اس کو قرآن مجید سکھاؤ۔ غرض فرصت کا وقت جو دیا گیا ہے وہ اس کام کے لیے ہے کہ اس عرصہ میں اپنے پیروکار تلاش کیے جائیں جو آگے چل کر جماعتی طور پر مدد دے سکیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اگر چند روز تک وحی نازل نہیں ہوئی تو اس سے آپ کی ترقی میں رکاوٹ نہیں ڈالی گئی۔

اسی طرح اگر نوع انسانی کے متعلق قیاس کیا جائے تو اس میں بعض واقعات ایسے نظر آتے ہیں کہ جن سے اس کی ترقی رک جاتی ہے۔ مگر جب گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ رکاوٹیں بھی ترقی کی بعض ضرورتیں پوری کرنے والی ثابت ہوں گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جماعت کو قرآن مجید سکھانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ انسانی نوع علم سے ترقی کرتی ہے۔

آیت (۱۲) و لسوف یعطیك ربك فترضیٰ:- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعقل اھل الارض و اعلم اھل الارض ہیں۔ آپ میں سب صفات و اخلاق اعلیٰ سے اعلیٰ موجود تھے اور آپ نہایت رحیم اور نرم دل تھے۔ کسی پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے حلف الفضول بھی آپ کی سعی سے قائم ہوئی اور آپ اس کے ممبر تھے۔ ایک موقع پر جب ابوجہل نے ایک آدمی کا حق نہ دیا تو اس مظلوم شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر شکایت کی۔ آپ ابو جہل کے گھر تشریف لے گئے اور دستک دی اور اس سے کہا کہ اِس شخص کا حق دو۔ تو اس نے دے دیا۔ کیونکہ ابوجہل کو معلوم تھا کہ اگر آپ کے آنے پر بھی اس کو حق نہ دیا گیا تو تمام ممبر حلف الفضول جمع ہو کر مقابلہ کریں گے۔

---

* سائل سے مراد طالب العلم ہے یعنی طالب علموں پر رحم کرو۔ اکثر استادوں اور معلموں کو دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم اگر کوئی بات پوچھے تو غصہ میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نوکر نہیں ہیں، فی سبیل اللہ پڑھاتے ہیں۔

آپ نے عرب کی حالت بری دیکھی۔ شام گئے وہاں کے آبادکاروں اور رعایا کی تباہ حالت دیکھی۔ یمن کی حالت معلوم تھی۔ ایک روایت ضعیف میں آتا ہے کہ آپ نے عراق کی حالت دیکھی۔ اُن کی تباہ حالی تو حیوانوں سے بھی بدتر تھی (دیکھو حجۃ اللہ البالغہ)۔ آپ کا یہ مقصد تھا کہ نوع انسانی کو ابتر حالت سے نکال کر اور غلامی سے نکال کر آزادی کے میدان میں لایا جائے۔ یہ ایک ایسا نسخہ عطا ہوا ہے جو انسانیت کے لیے ابدالآباد تک مفید ہے۔ ایک یہ کہ:- یا ایہا الناس اعبدو ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم الیٰ قولہ و انتم تعلمون:- یعنی انسان کو تمدن کی حالت میں دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک آزادیِ رائے یعنی اُن کی رائے بھی سنی جائے اور دوسرا پیٹ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لا إله إلا الله: یعنی اللہ تعالیٰ کی غلامی کرو، تمہارا خالق اور رب وہی ہے۔ اور جو تم میں رتبۃً یا زماناً بزرگ ہیں، اُن کا رب اور خالق وہی ہے۔ لعلکم تتقون تب تم جاکر عدالت قائم کرو گے* یہ معنیٰ ہے تقویٰ کا جس سے آزادیِ رائے پیدا ہوتی ہے۔ باقی رہا پیٹ کا مسئلہ، زمین کو تمہارے لیے آزاد بنادیا، اور سورج اور چاند کی روشنی مفت ہے اور برسات بھی آزادی سے برستی ہے اور میوے تمہارا رزق ہیں۔ اس زمین پر کسی کو مالکانہ قبضہ کرنے مت دو۔ اور اس پر خدا کی حکومت کے مقابلہ میں دوسری کوئی حکومت مت قائم کرنے دو، ورنہ وہ ٹیکس ہر ٹیکس اور محصولات لگا کر تم کو غلام بنالیں گے۔ و انتم تعلمون تمہاری کانشنس یہ قبول نہیں کرتی یعنی انسانوں کے دل سے اپیل ہے۔

دوسری تعلیم اقرأ:- آپ کو یہ پسند تھا اور مرغوب تھا کہ انسانیت اِس نسخہ کو قبول کرلے تو کہا گیا و لسوف یعطیك۔ جیسے ایک طالب علم کو کہا جائے کہ جتنے نمبر تم چاہتے ہو لکھ دو، ہم اتنے ہی دے دیں گے۔ یعنی اقوام عالم اس کو قبول کرلے گی۔ آپ کو عرب اور قیصر و کسریٰ کی رعایا کو ظلم سے چھڑانا تھا یہ پہلا مقصد تھا۔ نیز اقوام عالم یعنی تمام انسانیت کو بادشاہوں رہبان و احبار اور سرمایہ پرست کے ظلموں سے نجات دلوانی تھی، تو آپ کو تسلی دی گئی کہ یہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔

حضرت مولانا مولوی نجم الدین صاحب مرحوم (پروفیسر اورنٹیل کالج لاھور) فرماتے تھے کہ میرے خیال میں یوں آتا ہے کہ والفجر سے مراد ثمود کی قوم کی ھلاکت ہے اور و لیال عشر یعنی عشرۂ محرم جس میں موسیٰ علیہ السلام نے خروج کی تیاری کی اور والشفع والوتر سے مراد عاد ارم کی ھلاکت ہے۔ سبع لیال و ثمانیۃ ایام۔ واللیل اذا یسر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ کی ہجرت کی رات ہے جس سے بڑا انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کا پروگرام کلا بل لا تکرمون الیتیم الآیہ سے شروع ہوتا ہے۔

---

* دیکھو غنیۃ الطالبین۔ فصل فی التقویٰ۔

سُوْرَةُ الانْشِرَاحِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

سورہ الانشراح مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۱) وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (۲) الَّذِیْٓ اَنْقَضَ

کیا ہم نے نہیں کھول دیا تیرا سینہ اور اتار رکھا ہم نے تجھ پر سے بوجھ تیرا جس نے جھکادی تھی

ظَهْرَكَ (۳) وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۴) فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۵) اِنَّ

پیٹھ تیری اور بلند کیا ہم نے مذکور تیرا سو البتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے البتہ

مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (۶) فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (۷) وَ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ (۸)

مشکل کے ساتھ آسانی ہے پھر جب تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

سورۃ الانشراح مکیۃ

یہ سورت مکیہ ہے۔ آپ کا دستورالعمل یہ رہا کہ آپ نے مکہ میں جماعت تیار کی اور مدینہ میں حکومت استوار کی اور حدیبیہ کے بعد **فاذا فرغت فانصب** پر عمل کیا اور بڑی جنگ چھیڑ دی تاکہ جماعت کو تن آسانی کا موقع نہ ملے اور اخیر عمر تک **و الی ربک فارغب** پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا پروردگار سمجھا، نہ حکومت کو۔ اور پیٹ پر پتھر باندھ کرحیات مستعار کو اختتام تک پہنچایا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ترقی کے جس قدر سامان تھے اُن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کو وہ تمام سامان دے دیے گئے۔

آیت (۱) **الم نشرح لك صدرك**: جو کام کرنا ہو اُس کے متعلق جو علمی نظریے دیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ طبیعت میں ذرا بھر بھی شبہہ نہ رہے۔ اس کو عربی میں **شرح الصدر** کہتے ہیں۔ وہ ایسی حالت ہوتی ہے کہ جس سے کام کا مصمم ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ طبیعت چاہتی ہے کہ یہ کام میں کر لوں گا۔ اس درجہ پر جب ایک نظریہ پہنچ جائے کہ انسان اُسے اپنے بس کی چیز سمجھے اسے شرح الصدر کہا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا گیا کہ کیا ہم نے تیرے لیے شرح الصدر نہیں دیا۔ یعنی تو اس ارادہ کو پورا کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ اِس قسم کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قرآن مجید میں آتی ہے۔ **رب اشرح لی صدری**۔ اِسے سینے کے چیرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کو چیرنے کا اِس جگہ کوئی ذکر نہیں ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی زندگی میں آپ کے سینہ چیرنے کا ایک واقعہ ہے مگر اس کو اِس آیت کی تفسیر میں لانا زیادتی ہے۔

ہر معلم اور لیڈر کو معلوم ہے کہ جب تک اس کے دل سے تمام شکوک رفع نہ ہو جائیں اور دل میں کوئی شبہہ اس کام یا علم میں نہ رہے اور اس کام کی سرانجامی کی تمام تجویزیں سمجھ میں آجائیں اور اس کے موانع کے رفع کرنے کے طریقے سوچ لیے جائیں اُس وقت تک انسان کو اُس کام کے کرنے کی ہمت ہوتی ہے اور یہ ہے

شرح الصدر۔ یعنی تمام ترقی کی راہیں آپ کے دل میں آگئیں، اور پوری سمجھ سے بات آپ کے دل میں جاگزیں ہوئی تو بات کو آخر تک سوچ لیا اور پھر کبھی تردد اور شک کا موقع پیش نہیں آیا اور تمام اطمینان سے کام میں آپ اور آپ کی جماعت لگ گئی اور سر انجام ہوگیا۔ یہ ہے شرح الصدر جس کا ذکر ہے.

آیت (۲) و وضعنا عنك و زرك الذی انقض ظهرك :- جب انسان ایک بڑا کام کرنے کے لیے کھڑا ہو اور وہ اس کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو اس کو اپنے ہم خیال سچے رفیقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک ضرورت کے مطابق رفیق جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک کام اسے خود کرنے پڑتے ہیں، چھوٹے سے چھوٹا کام اور بڑے سے بڑا کام اسے خود کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے طبیعت پر اس قدر بوجھ پڑتا ہے کہ یہ بوجھ کمر توڑ ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زندگی کے ابتدائی سال میں تمام کام خود کرتے تھے۔ جس سے مقصد یہ تھا کہ آپ کے فیصلے کی پختگی ظاہر ہو جائے۔ جب یہ درجہ طے ہوگیا اور معلوم ہوگیا کہ آپ کسی چیز سے تھکنے والے نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ویسے ہی رفیق دیے جس قسم کے رفیقوں کی آپ کو ضرورت تھی۔ اس طرح آپ کی کمر پر جس قدر بوجھ تھا وہ ہٹ گیا.

غرض جب رفیق جمع ہو گئے اور آپ کی پارٹی بن گئی، تو اس کے بعد اس کام کی تکمیل کے لیے صحیح اور عالمگیر پروپیگنڈے کی سخت ضرورت ہے۔ اسے اشاعت اور دعوت کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آج کل ڈپلومیسی میں جھوٹ کا لفظ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ مگر اس صحیح پروپیگنڈے میں اس جھوٹ کی مطلقاً اجازت نہیں ہے۔ اور اسے لوگوں نے خواہ مخواہ غلطی سے مشہور کر دیا ہے کہ اس میں جھوٹ کی اجازت ہے.

اس سورت کے نزول سے اول مکہ مکرمہ میں ایسی جماعت آپ نے تیار کر لی تھی جو آپ کے کام کی ذمہ دار بن گئی۔ وہ عشرہ مبشرہ اور دوسرے صحابی تھے۔ انہوں نے تبلیغ اور اشاعت کے کام کو اپنے سر لے لیا اور قوت اور سمجھ سے کام میں لگ گئے۔ اور آئندہ یہی جماعت سلطنت اسلامیہ کی بنانے والی ہوئی۔ اس جماعت کے ہم خیال آدمی اس کام کو سب کاموں سے مقدم جانتے تھے اور اس پر مال اور جان دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے.

کام کرنے کے لیے جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر تین ہوں تو نصاب جماعت کا پورا ہوگیا جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم اور ابوبکر صدیق رضہ اور خدیجۃ الکبریٰ یا علی رضہ یا زید جس کو بھی تیسرا سمجھا جائے۔ جب

تین ہوگئے تو اب کام کرنے کے لیے کافی ہیں، کام شروع کر دو۔ اور امام شافعی کہتے ہیں کہ چالیس ہوں۔ جب مدینہ منورہ میں اول جمعہ پڑھا گیا تو چالیس تھے۔ چالیس اگر جمع ہو جائیں تو تمام سیاسی کام شروع کر دینے چاہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ سیاست کے لیے دس اور اشاعت مقصد کے لیے بیس اور حکومت قائم کرنے کے لیے چالیس کافی ہیں۔

آیت (۴) و رفعنا لك ذكرك: سمجھدار آدمی جب آپ کے کام کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اِس آدمی کو دیکھنا چاہیے جو اس قدر کام کر رہا ہے اور مخالف خواہ مخواہ اِس پر اتہام لگا رہے ہیں۔

آپ کا کام سمجھدار لوگوں کی نظروں میں کھُب جاتا ہے اور دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ڈیپوٹیشن آپ کے پاس روانہ کرتے ہیں۔ اور خود ملنے کے لیے آتے ہیں۔ اور جب اُن کا اطمینان ہو جاتا ہے تو وہ خود ہی اشاعت شروع کر دیتے ہیں۔

قبل از نبوت آپ برابر قوم کو اُبھارنے اور اُن میں جو بد اخلاقیاں آگئی تھیں اُن کو دور کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور نہایت سرجوشی سے کام کرتے تھے۔ حلف الفضول جو عبداللہ ابن جدعان کے گھر میں منعقد ہوئی تھی۔ اُس میں آپ اور ابوبکر صدیق رض دونوں سرگرم ممبر تھے۔ اگرچہ اس حلف الفضول کے مقاصد ظاہر میں مختصر نظر آتے ہیں مگر اُن کے معانی بہت اعلیٰ ہیں کہ اِس شہر مکہ میں اگر کوئی ظلم ہو تو جب تک مظلوم کو حق نہ دلایا جائے تب تک ہم برابر کوشش کرتے رہیں گے خواہ اس میں ہماری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ تو یہ اصل مقصد بعثت نبوت کا ہے۔ یعنی تمام جہان سے ظلم دور کیا جائے اور باقی چیز سب اُس کی شرائط اور مدات میں سے ہیں۔ مگر آپ کو صحیح راستہ کی خبر نہیں تھی کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ تو الہام کے ذریعہ وہ راستہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا۔ اور رفعنا لك ذكرك کے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرے ذکر یعنی قرآن مجید کو بلند کردیا۔ یعنی قرآن کو اقوام عالم نے قبول کر لیا۔ اور اس پر عمل درآمد شروع کردیا۔ یہ آخری معنی سورت سے بہت چسپاں ہے۔

اب یوں دیکھنا چاہیے کہ یہ حلف الفضول اگرچہ چند نوجوانوں نے قائم کی ہے مگر حکیم جانتا ہے کہ قوم میں ایسا ماحول پیدا ہوگیا ہے اور ایسے افراد اِس قوم میں پیدا ہو گئے ہیں تو یہ قوم کی استعداد کا مظاہرہ ہے کہ یہ قوم نبوت کو بلا رہی ہے۔ اب جب اس میں نبی آتا ہے تو مخالفین آپ کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں اور لوگوں میں آپ کے کام کی اشاعت ہوتی ہے۔ اور عرب کا سمجھدار طبقہ جانتا تھا کہ یہ وہ شخص ہے جس نے ظلم کے برخلاف ایک تحریک جاری کر رکھی تھی، اب یہ

لوگ کیوں اس کی مذمت کرتے ہیں، تو حقیقت حال جاننے کے لیے مرکز میں آتے ہیں، آپ سے ملتے ہیں اور بات کو سمجھ جاتے ہیں۔ یہ ہے ورفعنالك ذكرك کا مطلب۔ پروپیگنڈا خواہ مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اس تحریک سے انسان روشناس ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ کا نام تمام عرب میں شایع ہوگیا کہ یہ شخص ظلم دور کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک سمجھدار جماعت بھی موجود ہے تو کمزور طبقہ جس کو مساکین کہا جاتا ہے، وہ مساکین آپ کو اپنا سرپرست سمجھنے لگ جاتے ہیں اور محبت کا دم بھرنے لگ جاتے ہیں اور اچھے ناموں سے آپ کو یاد کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ تو آپ کو نصرت و مدد دے تاکہ ہم کو ظلم سے نجات دلائیں۔

آیت (۵ و ٦) فان مع العسر يسرا إن مع العسر يسرا :- تنگی کے بعد آسانی آجاتی ہے۔ آئندہ بھی بڑا سخت کام کرو تو آسانی آجائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اب آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں مگر اس سے پہلے آپ کو بہت سی مصیبتیں تھیں۔ آپ نے نہایت عالیٰ حوصلگی اور فراخ دلی سے اُن کو برداشت کیا۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے آپ کے واسطے آسانی پیدا کردی۔ اب کام کو لگاتار کرنا چاہیے۔ یعنی آسانی، تنگی کے بعد آتی ہے۔ اب اس کی قدر معلوم ہوئی۔ اب بھی آئندہ آپ کو تنگی آئے گی تو آسانی اس کے بعد آجائے گی کیوں کہ یسر تو ہے ہی عسر کے بعد۔

آیت (۷) فاذا فرغت فانصب *:- آپ جب ایک کام کے ایک حصہ سے فارغ ہو گئے تو اس کام کو جو زیادہ مشکل تھا اب شروع کیا۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں بہت تکلیف اٹھائی تو ایک سمجھدار طبقہ نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا یہ گویا إن مع العسر يسرا تھا۔ اور دوسری تکلیف آپ نے مدینہ منورہ میں صلح حدیبیہ کے وقت اٹھائی۔ اس میں یہ شرط تھی کہ ہمارے قافلوں کے نگہبان تم ہو (دیکھو قصیدۂ عظمیٰ) اور قریش کے معاہدے میں بنو بکر آئے۔ اس کے سوائے تمام عرب کو قریش نے آپ کے سپرد کردیا۔ یسر کی لذت بھی عسر کے بعد ہوتی ہے۔ محنت کرنے کے بعد اجرت کاملہ ملے تو مزدور ہمیشہ یہی چاہتا ہے کہ محنت کروں۔

فانصب :- تکلیف برداشت کر۔ جس قدر مشکل حصہ ہو اسے شروع کر۔ اس میں تجھے مشکلات بھی درپیش آئیں گی مگر تو ان کی پروا نہ کر، کیوں کہ اس مشکل کام کے بعد تمام آسانیاں شروع ہو جائیں گی۔ عرب انصب الحرب اسے کہتے ہیں جب شعلہ مارنے والی جنگ قائم ہو جائے۔

---

* بڑی جنگ قائم کر دو۔ عرب کہتا ہے انصب الحرب۔ بعد فراغت حدیبیہ جنگ شروع کر دی جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطمح، مظالم کو دور کرنا تھا جو سرمایہ داروں نے کاشت کاروں اور غریب صناعوں پر قائم کر رکھے تھے - اور رفتہ رفتہ یہ مظالم طبعی صورت اختیار کر گئے تھے - بڑی دو سلطنتیں ایران اور روم بڑی مدت تک سلطنت کرنے کے باعث ظلم کی خوگر ہوگئی تھیں اور غرباء کی حالت حیوانوں کے مانند تھی - چھوٹے بڑے لوگ اُن سے یہ عادات سیکھ کر زیر دستوں پر ظلم کرتے تھے - تو اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کو جہان سے نابود کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تاکہ انقلاب کردیں اور تمام طاقت غرباء کے ہاتھ میں آجائے، تو اس کام کی سرانجامی کے لیے عرب کی سر زمین سے جماعت تیار کرنی تھی اور اُن کو اپنے پروگرام کا پابند بنانا تھا - یہ کام بڑا مشکل تھا - جب صلح حدیبیہ ہوئی تو یہ کام سرانجام ہوگیا - پھر آپ نے مدینہ میں آکر بڑے کام کو شروع کردیا یعنی قومی کام کے بعد انٹرنیشنل کام کی ابتدا کردی - کسریٰ اور قیصر اور تمام بادشاہانِ گرد و نواح کو اطلاع کردی کہ اس پروگرام پر عمل کرو ورنہ ہماری تلوار سے بچ نہیں سکتے - یہ بڑی دھمکی تھی - اِس طرح بڑے شہنشاہوں کو دھمکی دے کر کام شروع کردیا گیا - معنی ہیں اِس آیت کے - اور ہر انقلابی کے لیے یہی ضروری ہوتا ہے، ورنہ اس نے جتنا اول کام کیا ہے سارے کا سارا برباد ہوجاتا ہے - سستی کرنے سے کام تباہ ہو جاتا ہے.

آیت (۸) والی ربك فارغب :- اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کر - جب انسان کے سر پر مشکل آجاتی ہے تو اُس کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے اور اس حالت میں اُس کو مناجات میں بڑی لذت آتی ہے - یعنی کام کی تکمیل کے لیے ارادہ میں سستی نہ آئے - اور اُس کی تکمیل کے لیے انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنا چاہیے - جو لوگ انسانیت کا مکمل خاکہ ہیں، اُن کی زندگی کا اِس سورت میں خاکہ کھینچا گیا ہے - اس سے یہ نتیجا نکالنا نہایت آسان ہے کہ تمام نوع انسانی اپنی پوری جامعیت میں اِس طریقہ سے ترقی کر رہی ہے - اِس خیال کو سامنے رکھنا کہ نوع انسانی اپنی فطرت میں ہمیشہ ترقی کرتی ہے، اگر یہ خیال دماغ میں راسخ ہوجائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر اچھا آدمی ہمیشہ ترقی کی دُھن میں لگا رہے گا - اِس واسطے کہ فرد کا کمال یہ ہے کہ اپنی نوعی خوبیوں کو زیادہ حاصل کرے - تو اِن دو سورتوں میں فرد کامل کے حالات پیش کیے گئے ہیں تاکہ اِس نمونہ پر اچھے آدمی ترقی کرتے رہیں.

ہر ایک مصلح کا پہلا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ ہم غریبوں اور مسکینوں پر سے ظلم دور کرنے کے لیے محنت کر رہے ہیں - جب غرباء اُن کی یہ آواز سن کر اُن کی

امداد کرتے ہیں تو اُن کی حکومت قائم ہو جاتی ہے - پھر وہ مدعی اصلاح پہلی حکومت سے زیادہ ظلم کرنے لگ جاتے ہیں تو اس لیے کہا گیا کہ الی ربک فارغب. یعنی خدا کے لیے کام کرو - آخر حیات تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما نے حکومت کے ثمرات سے کچھہ فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ حالت مزدور جیسی رکھی اور جس طرح ہمارے ملک میں آبادکار اور مزارعین روٹی کھانے کے وقت بیٹھتے ہیں ویسے ہی آپ نے ہیئت اختیار کی - اور واسجد واقرب کا معنیٰ بھی یہی ہے -

عرب کے بہادر اور روسی بہادر لڑائی کے وقت اپنی اپنی معشوقہ حاضر کرتے اور خوب بہادری دکھاتے تو اس جگہ بھی کہا گیا کہ خدائی وصال کے لیے محنت کر کے مشقتیں برداشت کرو۔

سُوْرَۃُ التِّیْنِ مَکِّیَّۃٌ وَّ هِیَ ثَمَانُ اٰیٰتٍ

سورہ التین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ (۱) وَ طُوْرِ سِیْنِیْنَ (۲) وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ (۳) لَقَدْ

قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طور سینین کی اور اس شہر امن والے کی ہم نے

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۴) ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ (۵)

بنایا آدمی خوب سے اندازے پر پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے نیچے

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (۶) فَمَا یُكَذِّبُكَ

مگر جو یقین لائے اور عمل کیے اچھے سو اُن کے لیے ثواب ہے اجر ہے بے انتہا پھر تو اس کے پیچھے کیوں جھٹلائے

بَعْدُ بِالدِّیْنِ (۷) اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ (۸)

بدلہ ملنے کو کیا نہیں اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیمO

سورۃ التین مکیۃ

قرآن مجید اساسی طور پر انسان میں دو نظریے پیدا کرنا چاہتا ہے:- (۱) ایمان باللہ تعالیٰ (۲) ایمان بالیوم الآخرۃ (یعنی دوسری زندگی کا یقین)۔ جس اِنسان میں یہ دونوں چیزیں فطرۃً موجود ہوں، اُس کی تعلیم کو مکمل کرنے کا ذمہ قرآن مجید لیتا ہے۔ جیسے اقلیدس کے لیے چند اصول ہیں کہ جب تک انسان کو اُن پر دست رس نہ ہو وہ اس فن کو مکمل نہیں کر سکتا۔ اُسے پہلے ہر قسم کے فارمولے سیکھنے پڑیں گے تب وہ کہیں اقلیدس سیکھے گا یعنی اقلیدس میں جتنے علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ ہیں جب تک انسان وہ یاد نہ کر لے آگے نہیں چل سکتا۔ اِسی طرح یہ دونوں علوم (ایمان باللہ و ایمان بالیوم الآخر) صحیح المزاج عقلمندوں کے لیے علوم متعارفہ کا درجہ رکھتے ہیں اور عام انسانیت کے لیے اصول موضوعہ کی کیفیت رکھتے ہیں (جیسے اقلیدس میں خط کا کھینچنا اور دائرہ کا بنانا).

یہ سورت اِس بات کو سمجھا دیتی ہے کہ یہ چیزیں انسان کی فطرت میں داخل ہیں۔ اب اِنسان کی فطرت پر ذرا سا تفصیلی اشارہ کرنا ضروری ہوگا۔ ہم نے شاہ ولی اللہ صاحب کا جو فلسفہ پڑھا ہے اُس میں انسانیت کی تحلیل کو چار حصوں میں پایا (۱) بدن انسان (۲) وہ قوت جو اِس بدن کو ہلاتی ہے اور موت کے وقت بدن اس قوت سے خالی ہو جاتا ہے (۳) وہ علمی نور جس کو ملکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور (۴) وہ محبت الٰہی کا جذبہ جو ایک موتی کی شکل میں انسانی طبیعت میں موجود ہے۔ اب اِس سورت کی شرح میں چار قسمیں بیان کی گئی ہیں.

آیت (۱) **والتین و زیتون:-** تین اور زیتون ایک قسم کے پھل ہیں یعنی میوے ہیں۔ بعض اہل علم اِس سے مسجدیں مراد لیتے ہیں مگر ہماری رائے اس کے موافق نہیں۔ تین سے تو ہم جسم انسانی کی طرف اشارہ سمجھ رہے ہیں اور زیتون سے وہ روح ہوائی مراد لیتے ہیں جو اس بدن کو چلاتی ہے۔ جیسے زیتون کے ہر ذرہ کے اندر تیل ملا ہوا ہے اِسی طرح وہ روح، اِنسان کے ذرہ ذرہ میں پیوستہ ہے.

آیت (۲) **و طور سینین:-** طور سینا پر تجلیٔ الٰہی ظاہر ہوئی۔ حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے اسے دیکھا۔ اِس سے انسانیت میں وہ ملکی شان مراد لیتے ھیں جس سے انسان حکومتیں بناتا ھے اور یہی وہ چیز ھے جو اسے عام حیوانات سے ممتاز کر دیتی ھے اسے ھم ملکی روح سمجھتے ھیں۔

آیت (۳) و ھذا البلد الامین:- اور امانت والے شہر مکہ کی قسم۔ یہ شہر ھمیشہ خدا دوست لوگوں کا مرکز رھا ھے۔ ایسا کہنا چاھیے کہ یہ عاشقان الٰہی کی بستی ھے۔ اِس سے ھم اُس روحانی جوھر کی طرف اشارہ مراد لیتے ھیں جو اللہ کی طرف کوشش کرتی ھے اور جس کا نام روح الٰہی رکھا جاتا ھے۔

آیت (۴) لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم:- غرض یہ چاروں چیزیں گواہ ھیں کہ ھم نے انسان کو بہترین ترکیب میں پیدا کیا۔ ایک مرکب کی خوبی پر اس کے اجزاء کی خوبی سے استدلال کیا جا سکتا ھے۔

جب کہ انسان کے یہ چار اجزاء بہت قیمتی ھیں تو ان کی ترکیب سے جو انسان پیدا ھوا وہ اعلیٰ، عمدہ اور احسن پیدا ھوگا۔

آیت (۵) ثم رددناہ اسفل سافلین:- پھر ھم نے اُس کو زیادہ محتاج بنا دیا۔ بدن کی وجہ سے زمین پر جس قدر چیزیں ھیں اِنسان اُن کا محتاج ھے۔ یعنی انسان کو سب سے زیادہ محتاج بنا دیا۔ روح ھوائی کی وجہ سے انسان تمام چیزوں کا محتاج ھے۔ اسی طرح اعلیٰ درجہ کی جو ملکی قوتیں ھیں، اپنی ملکیت کے لیے ان کا بھی انسان محتاج ھے۔ آخر اِس جوھر (روح الٰہی) کی حفاظت کے لیے انسان اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت کا محتاج ھے۔ تو جیسا کہ کہا گیا ھے کہ:- "آناں کہ غنی ترند محتاج ترند" یہ جس قدر بہتر صفات کا مالک تھا، اُتنا ھی زیادہ نیچے اُترتا گیا۔ یعنی چونکہ اس کو سب چیزوں کی احتیاج تھی اس لیے سب کائنات سے زیادہ محتاج ھوتا گیا۔ اور بہت لوگ فقط بدن کی احتیاج رفع کرنے میں لگ کر اور چیزوں کو بھول بیٹھے اور نفس کے گڑھے میں گر گئے، تو اب اس کی عزت برقرار رکھنے کے لیے ھم نے قانون اُتارا۔

آیت (۶) الا الذین آمنو و عملو االصالحات فلھم اجر غیر ممنون:- یعنی اب اگر یہ اپنی عزت قائم رکھنا چاھتا ھے۔ جیسا کہ خود بہترین اجزاء سے مرکب ھو کر ایک اعلیٰ درجہ کا انسان بنا۔ اگر اس عزت کو سمجھنا چاھتا ھے (جو اس کا فطری تقاضا ھے) اور اپنی ضرورتیں بھی پیدا کرنا چاھتا ھے تو اُسے چاھیے کہ اعلیٰ درجہ کے فرشتوں سے خاص تعلق پیدا کر لے۔ اِس واسطے فرمایا کہ اُن کے واسطے اجر بے انداز ھے۔ یعنی وہ فرشتوں کے مانند ھمیشہ اللہ تعالیٰ سے تعلق خاص پیدا کر لے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے تعلق ٹھیک کر لیا، اُن کی تمام ضرورتیں ھمیشہ پوری ھوتی رھیں گی اور وہ اپنی شان قائم رکھ سکتے ھیں۔ کیوں کہ جب انھوں نے تمام اجزاء کی

نگہداشت کی تو پہلا جو نظریہ تھا (ایمان باللہ) وہ تو اس کی فطرت کے لوازم سے ہوگیا۔ اس میں روح الٰہی کا جزء موجود تھا اور اس کی طبعی کشش اللہ تعالیٰ کی طرف تھی تو ایمان باللہ اس کے لوازمِ فطریہ میں سے ہوگیا۔

آیت (۷) فمایکذبک بعد بالدین :- خدا کو تو مان لیا، اب یوم الدین سے انکار کرنے کی کون سی چیز باعث بنتی ہے؟

آیت (۸) الیس اللہ باحکم الحاکمین :- کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں کا بڑا حاکم نہیں ہے کہ اس کے پاس اپیل نہیں ہونی چاہیے؟

اب دوسری بات (ایمان بالیوم الاخر) رہی، تو یوں سمجھنا چاہیے کہ چھوٹے حاکم کے فیصلے میں اگر غلطی ہو جائے تو بڑے حاکم کے ہاں اپیل ہو سکتی ہے اور بڑا حاکم اس غلطی کو درست کر دیتا ہے، اور جو فیصلہ ٹھیک ہوتا ہے اسے بدستور قائم رہنے دیتا ہے۔ تو اِس سلسلے میں انسان اگر غور کرے تو دنیا میں جس قدر آخری فیصلہ کن طاقت پیدا ہو سکتی ہے، اس کے (آخری فیصلہ) میں بھی غلطیاں باقی رہیں گی۔ ان کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین مان لینا انسانی فطرت کا طبعی تقاضا ہوگا کہ وہ سب حاکموں کا حاکم ہے۔

اس واسطے کہا کہ کیا اس کے پاس اپیل کرنے کے لیے دماغ میں گنجائش پیدا نہیں کی جائے گی؟ ضرور ہونی چاہیے۔ اس کا نام یوم الدین ہے۔ یہ بھی انسان کے فطری علوم میں داخل ہے۔ اور دنیا کے جبار حاکموں کے خلاف اپیل وہاں ہوگی۔

جب ایسے قیمتی اجزاء سے انسان کو مرکب کیا اور اس میں اتنی اعلیٰ قوتیں رکھیں تو اب اگر کوئی شخص ایسے احکم الحاکمین کی امانت اور ودیعت کو ضایع کرے یا اس کو بے جا خرچ کرے، یا اس کی قدر و قیمت نہ پہچانے، تو کیا اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین نہیں ہے؟ ادنیٰ حاکم کی کوئی شخص خیانت کرے تو وہ اس کو اپنی حکومت کی حیثیت سے سزا دیتا ہے اور تم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے، پھر تو سزا بھی سخت ہوگی۔ جو چیزیں تم میں اس نے ودیعت رکھی تھیں ضرور ایک دن ایسا آنا چاہیے کہ وہ اس ودیعت کو دیکھے اور جس نے اس کو اعلیٰ طریقہ سے استعمال کیا اس کو اچھا بدلہ دے اور جس نے اس کو خراب کیا اس کو سخت سزا دے۔

سورة العلق مكية وهى تسع عشرة آية

سورہ علق مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انیس آیتیں ہیں

بسم الله الرحمن الرحيم

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اقرأ باسم ربك الذى خلق (١) خلق الانسان من علق (٢) اقرأ و ربك

پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا، بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے، پڑھ اور تیرا رب

الاكرم (٣) الذى علم بالقلم (٤) علم الانسان ما لم يعلم (٥) كلا ان

بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے، سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا کوئی نہیں

الانسان ليطغى (٦) ان راه استغنى (٧) ان الى ربك الرجعى (٨)

آدمی سر چڑھتا ہے اس سے کہ دیکھے اپنے آپ کو بے پروا، بے شک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے

ارءيت الذى ينهى (٩) عبدا اذا صلى (١٠) ارءيت ان كان

تو نے دیکھا اس کو جو منع کرتا ہے ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھے بھلا دیکھ تو اگر ہوتا

على الهدى (١١) او امر بالتقوى (١٢) ارءيت ان كذب و تولى (١٣)

نیک راہ پر یا سکھلاتا ڈر کے کام بھلا دیکھ تو اگر جھٹلایا اور منہ موڑا

الم يعلم بان الله يرى (١٤) كلا لئن لم ينته ۵ لنسفعا بالناصية (١٥)

یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھتا ہے کوئی نہیں اگر باز نہ آئے گا ہم گھسیٹیں گے چوٹی پکڑ کر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورة العلق مکیة

(یہ سورۃ آزادیِ عالم کا نسخہ ہے)

قرآن مجید کے نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ اور اب فقط نتیجہ نکالنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ اب اِس فصل میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ یعنی اب اِس فصل میں قرآن مجید کے تمام خلاصہ کو بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ سورت العلق سب سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اِس سورت سے پہلے جس قدر قرآن ہے اور اس میں جس قدر تعلیم دی گئی ہے اُس تمام تعلیم کو اب کتاب کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ہم اِس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ بطور نتیجہ کے دعویٰ کا اعادہ ہے۔

قرآن مجید انسانیت سے بحث کرتا ہے تو انسانیت کو اس علم کا موضوع کہا جائے گا۔ موضوع کا مقرر کرنا اور اس کی جنس و فصل بیان کر کے اس کی تعریف کرنی ضروری ہے اور دوسری بحث ہے قرآن مجید میں الہام کی۔ تو الہام کی تعریف، اُس کے فوائد اور اُس کی طرف انسانیت کا احتیاج بیان کرنا بھی ضروری ہے۔ اِس پہلی سورت میں دونوں باتیں نہایت واضح طریقہ سے بیان کی گئی ہیں۔

آیت (۱ تا ۵) اقرء باسم ربك الذی خلق. خلق الانسان من علق الآیات:- اِس سورت کی پہلی پانچ آیات اکٹھی نازل ہوئیں۔ یہ پانچوں آیات، انسانیت اور الہام کی تفسیر ہیں۔ شریعت الٰہی میں انسانیت کے احوال سے بحث کی جاتی ہے اور جس چیز کے احوال سے علم میں بحث ہو اس چیز کو علمی اصطلاح میں موضوع علم کہا جاتا ہے۔

آیت (۱) اقرء باسم ربك الذی خلق *:- جس اللہ نے پیدا کیا ہے اُس کا نام لے کر پڑھنا شروع کر۔ جو چیز کائنات میں سے ہے اُس کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اِس بارے میں تمام انسانیت متفق ہے اور اس میں کوئی جھگڑا نہیں ہے:-

---

* تربیت کا مادہ تعلیم سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک شی سے دوسری شی تیار کرنے کی قوت بھی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ خوبی تعلیم کی ہے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (۱۶) فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ (۱۷) سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ (۱۸) كَلَّا

کیسی چوٹی جھوٹی گنہگار اب بلالیوے اپنے مجلس والوں کو ہم بھی بلاتے ہیں پیادے سیاست کرنے کو

لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۱۹)

کوئی نہیں، مت مان اُس کا کہا اور سجدہ کر اور نزدیک ہو

السجدۃ

(۱) انسانیت کا وہ حصہ جو کسی نہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو عام مخلوقات کا پیدا کرنے والا مانتا ہے۔ (۲) ترقی یافتہ انسانیت کا جو حصہ مذہب سے تعلق نہیں رکھتا اور عقلی فلسفے کا قائل ہے وہ بھی بالاتفاق اِس تمام کائنات کا ایک مرکز متعین کرتے ہیں کہ جس سے تمام وجود ظاہر ظاہر ہوا، اور اُسی کو تمام چیزوں کا خالق کہتے ہیں۔ اِس سے آگے اگر تفصیل سے یہ بیان کیا جائے کہ خلق کس طرح پیدا ہوئی تو اس میں (۱) اور (۲) میں کچھ اختلافات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیوں کے مختلف مسلک ہیں کہ روح اور مادہ کس طرح بڑھے وغیرہ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمام انسانیت کا مرکز ایک ہے اور یہ تمام چیزیں اس مرکز سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں اور مذکورہ بالا دونوں جماعتیں اس پر متفق ہیں۔

بعض لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں اختلاف دکھلائیں کہ انسانیت میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ کسی حکیم نے مادہ سے مخلوقات کو پھیلانے کی صورت اختیار کی ہے اور یہ کہ اِس باب میں وہ حکیم اپنے پیدا کرنے والے (اللہ) کا نام نہیں لیتا تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ فلاں حکیم اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتا۔ یہ اُن لوگوں کی کوتاہ نظری ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ان فلسفیوں کے مذہب کا اچھی طرح سے مطالعہ نہیں کیا۔ بہرحال تمام انسانیت اِسی بات پر متفق ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، تو اِس واسطے اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بھی اُسی کا نام لے کر پڑھ۔

آیت (۲) خلق الانسان من علق*:- اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ (اب انسانیت کی بحث شروع ہوگئی)۔ انسان جب تک انسانیت کو نہ سمجھے وہ شرائع

* تعلیم کے بغیر تو انسان ایک علق ہے۔

الٰہیہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ انسان کا ایک حصہ ہے بدن، اور گوشت کے ٹکڑے سے انسان کو پیدا کیا۔ اب وہ گوشت کا ٹکڑا کب پیدا ہوا؛ اِس پر اِس جگہ بحث نہیں ہے۔ مادّیات کے خلاصہ میں سے خلاصہ نکلتا ہوا گوشت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس میں سے انسان پیدا کیا جاتا ہے۔ تو انسان بھی عام مخلوقات میں شریک ہوا اور یہ بھی اس جنس کا ایک نوعی فرد ہے۔ تو جیسے تمام مخلوقات کا تعلق اپنے خالق سے ہے ویسے ان کا تعلق بھی ثابت ہوا اور اگر خلق میں عام مخلوقات کا بیان کر کے پھر انسان کی خلقت بیان کرنے سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام مخلوقات کا خلاصہ در خلاصہ انسان ہے تو یہ اشرف المخلوقات ہوا، اور اس کی ذمہ داری بڑھ گئی۔

آیت (۳ تا ۵) اقرء و ربك الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان ما لم یعلم*:- انسان کو پیدا کرنا یہ کرم تھا۔ اور اُس کو عالم بنانا اور تمام انواع کے علم کا اُس میں جمع کر دینا یہ اُس کے کرم میں ایک اضافہ ہے۔ انسان اجتماعیت سے ترقی کرتا ہے اور اجتماعی علم قلم سے محفوظ رہتا ہے۔ پہلے لوگوں نے جو کچھ کیا اپنے تجربات اور اپنی تاریخ قلم بند کر دی۔ اس کے بعد جو دوسری قوم آئی اُس نے پہلی تحقیقات اور تاریخی باتوں سے فائدہ اُٹھایا اور اِس طرح اپنی تاریخ بھی قلم بند کر دی، تو انسان میں قلم (نوشت و خواند) سے علمی اجتماع پیدا ہوتا ہے۔

آیت (۵) و علم الانسان ما لم یعلم:- اب آئندہ کے واسطے جن چیزوں کو انسان نہیں جانتا تھا ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم دیا۔ قلم کا استعمال نہ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم ہی کچھ زیادہ جانتی تھی۔ تو اب انسانیت کا تمام علم جو ترقی پر پہنچ چکا ہے، اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھانا منظور ہو تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی نہیں سکھلا سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم کا ایک تو یہ اثر ہے کہ جس قوم میں قلم کا استعمال محفوظ ہے وہ لوگ کتابیں پڑھ کر عالم ہو جاتے ہیں اور جس قوم میں یہ بات نہیں ہے اُس کو اللہ تعالیٰ اور طریقہ سے تعلیم دیتا ہے۔ اب یہ واقعہ ہے کہ اور طریقہ (قلم کے سوائے) جس سے علم دیا جاتا ہے وہ حظیرۃ القدس سے اتصال ہے۔ صوفیائے کرام کی اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جس فرشتہ کے ذریعہ سے انسان کو

---

* پہلے اقرء میں پرائمری تعلیم تھی۔ اب اعلیٰ تعلیم کے لیے کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم سے بڑی عزت اور سخاوت انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو تربیت دینے والے کی لوگ عزت کرتے ہیں اور علم کا خاصہ سخاوت، جوان مردی اور ہمت عالی ہے۔ علم بالقلم:- اب علم کی تقسیم کی جاتی ہے ایک پرانا نوشتہ اور دوسرا علم الہامی جو نبوت کے ذریعہ نازل ہوتا ہے۔

حظیرۃالقدس میں سے علم ملتا ہے اس فرشتہ کو قلم اعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اب قلم کو ہم یہاں عام طور پر لے لیتے ہیں کہ وہ زمین کا قلم ہو یا حظیرۃالقدس کا قلم ہو۔

اِن آیات کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان ایک حیوان ہے اور وہ علم اجتماعی رکھتا ہے اور وہ علم میں ترقی کر سکتا ہے اور آلات کا استعمال کرتا ہے۔ منطق میں انسان کی دو تعریف بیان کرتے ہیں ایک تو حیوان ناطق اور دوسری تعریف ہے **حیوان یستعمل الآلات** یعنی اپنے تمام کاموں میں آلات کا استعمال کرتا ہے۔ ایک علم تو اُس نے قلم کے ذریعہ حاصل کیا جس کو زمین کا قلم کہا جاتا ہے اور دوسرا علم اُس کا قلم اعلیٰ سے حاصل ہوا، پھر اُس کو قلم کے ذریعہ جہان میں پھیلایا۔ خود بھی مستفید ہوا اور دوسرے کے افادہ کے لیے اُس کو عام کر دیا۔ یہ خاصیت انسان کی ہے۔ قلم سے جو علوم اور تاریخ لکھی جاتی ہے اُس میں بہت غلط باتیں لکھی جاتی ہیں۔ اس کے باعث ان علوم سے اتنا فائدہ نہیں ہوتا اور بہت مشکلات درپیش آجاتی ہیں اور غلط در غلط تاویل سے انسان کا دماغ چکرا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے وہ تمام عقدے انسانیت کے لیے وحی کے ذریعہ دور کرتا ہے اور ترقی کے راستہ میں جتنے غلط نظریے یا نتائج اعمال، رکاوٹ ڈال رہے تھے الہام کے ذیعے وہ رکاوٹیں ددر کر دی جاتی ہیں۔ آیندہ پروگرام اُس کو غیر مبدل دیا جاتا ہے جس کو انسانی فطرت اپنا سمجھ کر قبول کر لیتی ہے اور ایسی نعمت الٰہی کا کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ایسی باتیں انسانی عقل سے بالا تھیں تو اُس کو ایسا علم حظیرۃالقدس سے دیا گیا جس سے اُس کی تمام مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

الہام کی ضرورت اِس لیے ہوئی کہ قلم کے لکھے ہوئے علم میں خلط ملط سے جو عقدہ پڑ جاتا ہے اس کے حل کرنے کے لیے ہی الہام کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ وہ مشکلات ایسی تھیں کہ عقل انسانی اس کے حل کرنے سے قاصر تھی اِلاّ بعد بہت تجربہ کے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور عنایت سے انسان کو سہل راستہ دکھایا (الہام سے)۔ اب یہ آخری الہام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونا شروع ہوتا ہے ایسا محفوظ کر دیا جائے گا کہ اس میں غلط بات کا خلط ہرگز نہ ہو گا۔ اِس لیے آئندہ کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس کے سمجھنے کے لیے عقل کفایت کرتی رہے گی۔

اب جب الہامی علم کی اتنی ضرورت محسوس ہوئی اور مطلق علم بھی انسانی ترقی کے لیے مفید اور سخت ضروری ہوا تو علم کی دشمنی کرنا کسی کے ذہن میں نہیں آتی اور مفید شیٔ کے لیے ہر ایک سخت کوشش کرتا ہے۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی کا اجماع میرا محتاج رہے اور اُن کو میری خفیہ تدبیروں کا علم نہ ہو اِس لیے علم کی اشاعت سے وہ لوگوں کو روکتا ہے۔ کبھی کوئی سرمایہ دار

اپنے زیر دستوں کو علم سے مانوس نہیں ہونے دیتا۔ اب آئندہ آیات میں یہ بیان کیا جاتا ہے۔

آیت (۶ تا ۱۹) اب دوسری فصل شروع ہوتی ہے۔ اس میں انسانیت کی تقسیم دو حصوں میں کر دی جاتی ہے (تعریف کے بعد تقسیم ہوتی ہے)۔ ایک انسان ہے کہ وہ انسانیت کے حدود چھوڑ دیتا ہے۔ اور دوسرا انسان ہے کہ انسانیت کے حدود پر اور اس کے مقتضا پر پوری پوری طرح کاربند ہے۔ اور وہ علم جو مقتضی انسانیت میں سے تھا اس کی اشاعت کرتا ہے اور دوسرا اس کو روکتا ہے۔ چنانچہ اس کا سبب بتلایا جاتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور صحیح علم جو صحیح تمدن کی لیے نہایت ضروری ہے، اس کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔ اس کا سبب بتایا جاتا ہے۔

آیت (۶ و ۷) کلا إن الانسان لیطغیٰ* ان راٰہ استغنیٰ :- اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے پاس جب روپیہ جمع ہوتا ہے وہ انسانیت کی حد سے نکلنے لگتا ہے۔ اور اپنی جماعت سے مستغنی ہو جاتا ہے اور اپنی حدود چھوڑنے لگ جاتا ہے۔

اس سے یہ اشارہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان جماعت کے اندر رہے تو اس کی انسانیت ٹھیک رہتی ہے۔ بعض چیزوں میں وہ دوسروں کا محتاج ہے اور بعض میں دوسرے لوگ اس کے محتاج ہیں۔ اسی طرح سوسائٹی میں برابری کا خیال محفوظ و ملحوظ رہتا ہے کہ لوگ اس کے محتاج ہیں اور یہ لوگوں کا محتاج ہے۔ اور جب اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں انسانی سوسائٹی میں لوگوں کا محتاج نہیں ہوں تو وہ اپنی حد سے بڑھنے لگا۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون ایسا بنایا ہے کہ کوئی فرد اپنی نوع سے باہر جا ہی نہیں سکتا۔

کلا :- ہرگز نہیں یعنی یہ خیال کرنا کہ تمام انسان اعلیٰ علوم کی اشاعت اور انسانیت اور تمدن کے لیے علم کے برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلکہ بعض انسان طاغی ہوتے ہیں اور لوگوں پر ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انسانوں میں فہم اور علم پیدا ہونے نہیں دیتے اور اس کا سبب فقط استغنا ہے یعنی سرمایہ داری ہے۔ سرمایہ دار طبقہ مساکین پر ظلم جاری رکھنے کے لیے ان کو علم سے آشنا نہیں ہونے دیتے۔

---

* تعلیم سے روکنے والا طاغی انسان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ غرباء غلامی کی زنجیر میں جکڑے رہیں۔ دوسروں کو اپنا محتاج بناتا ہے۔ یہ سرمایہ پرستوں کی عادت قبیحہ ہے۔ وہ جبری تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں۔ اِقرأ امر ہے، فرض عینی ہے۔ یہ تعلیم ہی ایسا نسخہ ہے جس سے غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں اور انسان ترقی کے راستے دیکھنے لگتا ہے۔ سرمایہ پرست انسان پڑھنے لکھنے سے لوگوں کو روکتا ہے تاکہ وہ غلامی میں رہیں۔

آیت (۸) إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَىٰ :- تیرے رب کی طرف رجوع ہونا ہے۔ یعنی ہر ایک محتاج ہے اور اس کا رخ حظیرۃ القدس کی طرف ہے۔ جہاں شخص اکبر موجود ہے۔ اور تجلی الٰہی بھی موجود ہے۔ یعنی ہر ایک انسان کو ہم نے اپنا محتاج بنا دیا ہے تو اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اُس کی صورت نوعیہ کا تقاضا ہے۔ اور ہر ایک کو دوسرے کا مساوی احتیاج ہے اور مستغنی فقط اللہ تعالیٰ ہے، اُس سے سب مانگ رہے ہیں تو انسان پر واجب تھا کہ وہ اپنی حقیقت پر غور کرتا اور جانتا کہ :-

آنان کہ غنی تراند محتاج تراند واللہ ھوالغنی و انتم الفقراء

آیت (۹ و ۱۰) أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ :- اب اِس سلسلہ میں انسانیت کے دوسرے فریق (طاغی) کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ حد سے گذرنے والے انسان کی مثال دی جاتی ہے اور اِسی ضمن میں انسانیت کے دوسرے طبقہ کا ذکر آ جاتا ہے۔

ایک بندہ جب اللہ تعالیٰ کا نام لینا (نماز پڑھنا) شروع کرے تو اُسے منع کرتا ہے۔ وہ جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے تو اس کا اتصال اپنے رب سے ہوا اس لیے وہ ضرور اُس کے بندوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھے گا اور یقیناً مظلوم کی داد رسی کرنے میں سعی کرے گا، لوگ اُس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ محتاجوں اور مسکینوں کا مددگار ثابت ہوتا ہے اور ان محتاجوں، مسکینوں اور مظلوموں کو یقین ہے کہ یہ شخص ہم کو ظلم سے نجات دلائے گا اور وہ بندۂ نمازی اُن کو تسلی دیتا اور بشارت دیتا ہے۔ مگر جو آدمی انسانیت کی حدود سے بڑھ جائے (ظالم ہو جائے) وہ اِس بات کو برداشت نہیں کر سکتا، کیوں کہ اُسے خطرہ ہے کہ اس طرح پر وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا۔ وہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس نمازی کے پاس چار آدمی جمع ہوں۔ لہٰذا وہ نمازی آدمی کو نماز پڑھنے سے بھی منع کرتا ہے کہ اِس نماز کی باعث لوگ ایسے ظالموں سے متنفر ہو جائیں گے۔ یعنی نماز میں قرآن شریف پڑھا جاتا ہے جس میں عدالت قائم کرنا اور عدالت کی فضیلت اور ظالموں، فاسقوں پر لعنت ملامت ہے اور اعمال صالحہ یعنی عدالت قائم کرنے والے مسکینوں اور محتاجوں کو، اور انصاف کرنے والوں اور محتاجوں کے کھانے کا انتظام کرنے والوں کے لیے بشارت اور ہمت افزائی ہے۔ تو در اصل وہ قرآن مجید پڑھنے سے منع کر رہا ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کو روکتا ہے۔ کیوں کہ اُس کو خوف ہے کہ اِس سے لوگوں میں بیداری پیدا ہو جائے گی تو پھر وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکے گا.

قرآن مجید کی تلاوت اور دَور کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ نماز میں پڑھا جائے۔

صلواۃ اور قرآن مجید کی تلاوت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ کبھی آپس میں جدا نہیں ہوتے۔

آیت (۱۱ و ۱۲) **أرئیت إن کان علی الھدیٰ او امر بالتقویٰ**:- اِس آیت میں اللہ تعالیٰ کے خاص بندے کا ذکر ہے۔ ترجمہ آیت (۱۱):- اگر وہ آدمی سیدھے راستہ پر ہو تو کسی کو کیا حق ہے کہ اُسے منع کرے؟ اُس کو روکنا درحقیقت صریح ظلم ہے۔

آیت (۱۲) وہ لوگوں کو انصاف کا حکم دیتا ہے تو کیا اُس کو کوئی روک سکتا ہے؟ ہرگز کوئی نہیں روک سکتا۔ اُس کو روکنے کا مطلب تو یہی ہوگا کہ انسانیت پر ظلم ہوتا ہے۔

اِن آیات (۹ تا ۱۲) تک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کوئی طاغی اور ظالم اُس کا مقابلہ کرے تو اولاً اُس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا ایک ذلیل بندہ سمجھے اور جو صحیح تعلیم ہے اُس پر کاربند رہے اور انصاف قائم کرنے میں کوشش کرے۔ پھر انسانیت کے اچھے افراد اُس کی جماعت میں شامل ہو کر اُس ظالم اور اُس کے ظلم کی بیخ کنی کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اُس کو خوب دیکھتا ہے اور وہ اس کو ترقی دیتا رہے گا۔ ہر بات میں آگے بڑھنا چاہیے یعنی جو صحیح تعلیم اُس نے شروع کی ہے اُس کی تکمیل کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور اس سبقت سے وہ میدان جیت لے گا۔

عام مفسرین نے یہ خیال بنا رکھا ہے کہ وہ طاغی، خدا کو یاد کرنے سے روکتا ہے اِس لیے یہ ظلم ہے، حالانکہ اِس طرح نہیں ہے۔ اصل میں نمازی اپنی نماز میں قرآن شریف پڑھتا ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کی اشاعت کرتا ہے اور قرآن مجید کا وعظ کرتا ہے جس میں انصاف کرنا انسانیت کے لیے ضروری بتایا جاتا ہے۔ اِسی لیے مسکین، محتاج اور مظلوم اُس کے پاس جمع ہو جاتے ہیں اور ظلم دور کرنے کے لیے اُس کی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں تو سرمایہ دار سے جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ظالم برباد ہوتا ہے اور اُس کی سلطنت اور سرمایہ تمام ہاتھ سے جاتے ہیں۔ اس سے اُس پر زد پڑتی ہے۔ کیوں کہ جب انصاف قائم ہو گیا تو اُس کی کوئی حقیقت ھی نہیں رہے گی۔ انصاف قائم کرنا اور لوگوں پر سے ظلم دور کرنا قرآن مجید کی تعلیم کی روح و رواں ہے۔ اور خدا کو یاد کرنے والا آدمی لوگوں کو کہتا ہے کہ انسانیت سوائے انصاف قائم کرنے کے کبھی ترقی کر ھی نہیں سکتی۔ آیت (۱۳) **ارئیت ان کذب و تولیٰ**: اور یہ ظالم اُس کو جھٹلاتا ہے اور انسانیت کو ترقی دینے سے روکتا ہے۔ یعنی ترقی کی طرف پشت کر رہا ہے اور رجعت پسندی اختیار کررہا

ہے اور لوگوں کو بھی پیچھے لے جا رہا ہے۔ رات دن اس کی یہی کوشش ہے کہ اس دعویٰ کو (کہ انسانیت انصاف کے سوائے ترقی نہیں کر سکتی اور مظلوموں سے ظلم دور کرنا انسانیت کا فرض ہے) جھوٹا ثابت کرے۔ یہ معنی ہے **کذب** کا۔ اور جب اس کے پاس کوئی برہان اور دلیل نہیں رہتی اور وہ عاجز ہو جاتا ہے تو لڑنے کی تیاری کرتا ہے یہ معنیٰ ہے **و تولی** کا۔

آیت (۱۴) **الم یعلم بان اللہ یریٰ**:- اس طاغی کو اتنی بھی سمجھ نہیں کہ اس کے کام کو اور اس بندۂ نمازی کے کام کو خدا دیکھ رہا ہے۔ اور کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس انصاف قائم کرنے والے بندے کو کامیاب کر رہا ہے۔ کیا یہ طاغی اس کو نہیں سمجھتا؟

شروع سورۃ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنایا اور اسے فطرت دی۔ اب اگر کوئی آدمی اس فطرت کے خلاف کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دے گا۔ کیا یہ اس کو نہیں جانتا؟ غرض اِس سورۃ میں یہ بات معین کر دی گئی کہ انسانیت دو جماعتیں ہو کر کام کرتی ہے۔ آگے جنگ شروع ہوتی ہے۔

اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے کہ اب جب کہ یہ نزاع شروع ہو گیا کہ وہ بات کو نہیں سنتے تو ان میں ہاتھا پائی ہونی ضروری ہے):-

آیت (۱۵ و ۱۶) **کلا لئن لم ینتہ○ لنسفعاً بالناصیۃ○ ناصیۃ کاذبۃ خاطئۃ**:- اگر یہ آدمی اپنی حرکت سے باز نہ آیا تو ہم اسے بالوں سے پکڑیں گے۔ کلا یعنی یہ خیال کرنا کہ یہ ایسا کرتا رہے گا اور یہ چونکہ سرمایہ دار ہے اس کو کوئی اپنے کام سے روک نہیں سکتا، یہ غلط ہے۔ بلکہ اگر یہ شخص اپنی غلط روی پر قائم رہا اور عدالت اور انصاف کرنے سے روکتا رہا تو اس کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر اُلٹا زمین پر مار دیا جائے گا۔ یعنی اُن کو نہایت ذلیل کر دیا جائے گا۔ وہ پیشانی کے بال تو پاکیزہ لوگوں کی طرح رکھتا ہے مگر باطن میں بڑا شیطان، جھوٹا اور خطا کار ہے کہ وہ حق کا مقابلہ کرتا ہے۔

سیدنا ابراھیم علیہ السلام کی اولاد میں پیشانی کے بال مقدس سمجھے جاتے تھے جیسے سکھوں کے ہاں کیس اور ھندوؤں کے یہاں بودی رکھنی۔ اھل عرب بال رکھتے اور نہایت عزت سے اُن کی پرورش کرتے اور پھر اُن کو حج کے ایام میں مقام منیٰ میں منڈواتے تھے۔ اور یہ منڈوانا سر کٹانے کے برابر سمجھا جاتا تھا۔

قریش مکہ یعنی مخالفین اسلام کے بہت سے آدمی بدر کی جنگ میں مارے گئے اور اُنہیں اُن کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔

آیت (۱۷) فلیدع نادیہ *:- وہ اپنی مجلس کے ہم نشینوں کو اپنی مدد کے لیے بلائے جو اُس کے شریک کار ہیں۔

آیت (۱۸) سندع الزبانیۃ †:- اور اگر اُس کے ہم مجلس آدمی کسی نیک آدمی کو کسی اچھے کام سے روک دیں تو اُن کے واسطے ہم جہنم کے پیادے بھیج دیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ تمام قوت خرچ کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں آجائیں تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا نہیں سمجھنا چاہیے۔ حق کی اطاعت کرنے والی روحیں اُن کے ساتھ ہیں۔ اب اگر وہ ہاتھا پائی (جنگ دست بدستی) کریں گے تو شکست کھائیں گے۔

اب تیسری فصل شروع ہوتی ہے جس میں یہ ہے کہ تو طاغی کی اطاعت نہ کر۔ وہ تیری اطاعت کرے اور تیرے آگے ذلیل ہو کر تابع ہو جائے۔ ایسی کوشش کرو اور ایسی تعلیم عام کرو کہ مجبوراً اُس طاغی کو تیری اطاعت کرنی پڑے۔

آیت (۱۹) کلا لا تطع:- اطاعت نہ کر، یعنی اُن لوگوں سے صلح نہ کر۔ کفار صرف یہ چاہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کفار کے ظلم کرنے اور اُن کی بت پرستی کو برا کہنا چھوڑ دیں۔ کسی خاص کا نام لے کر ذکر نہیں کیا جاتا بلکہ عام طور سے مخاطب کیا جا رہا ہے۔ اور اس میں قریش مکہ اور اُن کے آباء و اجداد تمام شریک تھے۔ اس واسطے وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظلم اور شرک کو برا کہیں۔ صلح کے معنی یہ ہیں کہ ایک فریق اپنے دعویٰ کا کچھ حصہ چھوڑ دے، تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ کا کچھ حصہ چھوڑ دیتے تو تمام تعلیم برباد ہو جاتی لیکن آپ اپنے دعویٰ پر بڑی پختگی سے قائم رہے۔ اِسی سبب سے کامیابی ہوئی۔

واسجد واقترب:- اور سجدہ کر اور قرب حاصل کر۔ سجدہ کے معنی ہیں خدا کی پوری اطاعت اور قرب سے مطلب ہے کہ حظیرۃ القدس کے جو مقدس درجے ہیں اُن میں پہنچنا۔ مثلاً حکم دیا گیا ہے کہ کافروں کی اطاعت نہ کرو اور اُن سے صلح نہ کرو تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو حکم دیا جاتا ہے، اس کی پوری اطاعت کرو۔ یہ نہیں کہ کسی معاملہ میں کفار سے صلح کر لی اور کسی میں چپکے ہو رہے، بلکہ

---

* نادی = شراب کی مجلس میں بیٹھنے والا۔

† یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے۔ زبانیہ، انصار و مہاجر کی ایسی جماعت تھی (جیسے بلال رضہ وغیرہ) جس کو قریش سے نہ کوئی تعلق رحمی تھا اور نہ تعلق احسانی تھا۔ وہ اپنے معبود برحق اور محبوب الٰہی کی محبت میں سرشار تھے۔ جنگ میں کفار کو بے تحاشا مار کر ڈھیر کر دیا اور طاغی کے معاونین سب بھاگ گئے۔ وللہ الحمد۔

اُن سے صلح کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے اور سجدہ کے معنی ہیں کہ اِس حکم کی پوری اطاعت کرو اور اس حکم کے آگے سربسجود ہو جاؤ، جیسے کہ بادشاہ حکم دیتا ہے اور اُس حکم کی اطاعت کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اُسی دم بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ظالموں سے کسی قسم کی مصالحت نہیں کی۔ حتیٰ کہ قیصر و کسریٰ جو ظالم حکومتیں تھیں اُن کو بھی دھمکایا۔ اُن کے ساتھ برسرِ پرخاش ہوئے۔ اور آپ کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ نے انقلاب کامیاب بنا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا درجہ اِس قدر بلند ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کلام کیا ہے وہ کلام الٰہی مانا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو کام آپ نے کیا ہے اُس کو بھی لوگ فرشتوں کے کام کی طرح مانتے ہیں اور یہ نتیجہ محض اِس امر کا ہے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پوری اطاعت کی۔

غرض سورۂ فاتحہ دعویٰ ہے اور یہ سورۃ اُس کا نتیجہ ہے۔ اُس میں بین الاقوامیت زیادہ ہے اور اِس میں قومیت زیادہ ہے۔ اس دعویٰ کے موقع پر وہ سورۃ پیش کی گئی ہے جو بین الاقوامیت کے مساوی ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قومی انقلاب مکمل کر دیا اور اس کے نتیجہ میں یہ سورت منتہیٰ کر دی گئی ہے۔

واسجد واقترب:- ایک ضروری خطرہ دور کرنا ہے، وہ یہ کہ ظالم طاغی کہیں گے کہ یہ جو اپنے آپ کو خیرخواہ اور مصلح اور خیرخواہ خلق بتا رہا ہے اور لوگوں کو عام تعلیم دے رہا ہے اور لوگوں کو ہم سے متنفر کر رہا ہے اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خود امیر بننے کا ارادہ رکھتا ہے اور جب لوگ اس کے پاس جمع ہو جائیں گے تو یہ بھی لوگوں پر ظلم کرے گا۔ کیوں کہ جب بہت لشکر اُس کے پاس جمع ہو جائے گا تو اُس کے اخراجات کے واسطے وہ مسکین لوگوں پر ظلم کرے گا۔ تو یہ ہم سے حکومت و ریاست چھین کر اپنے ہاتھ رکھنا چاہتا ہے اور یہ بات تاریخ میں عام طور پر ثابت ہے کہ ایک شخص مظلوموں سے ہمدردی کرنے کے واسطے کھڑا ہوتا ہے اور جب کامیاب ہوتا ہے تو اُسی طرح ظلم کرنے لگ جاتا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کیا جاتا ہے کہ ایک تو کسی ظالم کی اطاعت نہ کر بلکہ وہ تیری اطاعت کرے۔ اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کو سجدہ کیا کر اور اُس کا قرب حاصل کر۔ جب شاہنشاہ کا قرب حاصل ہوا، اور اُس کے دربار میں ہر وقت حاضر رہنا ہوا تو اُس کی رعیت پر کبھی ظلم کا خیال تک نہیں آئے گا۔ مقرب بارگاہ الٰہی کبھی کسی پر نہ ظلم کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو ظلم کرنے دیتے ہیں۔ سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی کے قرب حاصل کرنے سے انسان طاغی بن جاتا ہے۔ جب

آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے درپے ہوگا تو ممکن نہیں کہ اس سے ظلم ہو سکے۔ یا لوگ اس کے حق میں ایسا خیال کر سکیں۔ یہ سورت قومی تعلیم و تربیت کے لیے ہے۔ عربی قوم میں کیا کیا نقص ہیں ان کو رفع کرنا مقصود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک میں عرب کی تکمیل کر دی۔ اور اس سورت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر انسان میں ایسی روح پیدا ہونی چاہیے کہ جو علم حاصل کرے اور دوسروں کا مظلوم ہو کر نہ رہے اور خود بھی ظالم نہ بنے۔ اس مرض کے رفع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ الہامی علوم کی انسانوں میں وقعت پیدا کر دینی چاہیے اور ظالم طاغی کی کوئی بات نہ ماننی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے جھکنا اور سجدہ کرنا وہ اپنے اوپر ضروری سمجھے اور قرب الٰہی کو ڈھونڈے۔ کیوں کہ جب وہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کا شوق رکھتا ہے تو اسے گناہ کا خیال تک نہیں آتا۔

یہ سورت پہلی سورت ہے جس میں لڑائی کا حکم دیا گیا ہے۔ فَلْيَدْعُ نَادِيَه۔ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَه: یہ تو صریح ہے اور لا تطع میں قطع تعلقات اور الٹیمیٹم ہے۔ اس سے لڑائی ضرور چھڑ جاتی ہے۔

سُوْرَۃُ الْقَدْرِ مَکِّیَّۃٌ وَّہِیَ خَمْسُ آیَاتٍ

سورہ التین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَۃِالْقَدْرِ (۱) وَ مَآ اَدْرٰىکَ مَا لَیْلَۃُالْقَدْرِ (۲) لَیْلَۃُالْقَدْرِ

ہم نے اس کو آتارا شبِ قدر میں اور تو نے کیا سمجھا کہ کیا ہے شبِ قدر، شبِ قدر

خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ (۳) تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ

بہتر ہے ہزار مہینے سے آترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے حکم سے ہر

کُلِّ اَمْرٍ (۴) سَلٰمٌ ہِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۵)

کام پر امان ہے وہ رات صبح کے نکلنے تک

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

سورة القدر مکیة

قرآن مجید کی پہلی سورت "اقرء باسم ربك الذی خلق" لیلۃ القدر میں نازل ہوئی۔ لیلۃ القدر کا اگر آج کی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو کہا جائے گا بجٹ کی میٹنگ میں حظیرۃ القدس میں ایک کام پیش ہوتا ہے اور پھر اُس پر فیصلہ ہوتا ہے۔ تو یہ کام جو جو حظیرۃ القدس میں پیش ہوا ایک ہزار ماہ کے لیے ہوا ہے۔ غرض اِس مجلس میں (حظیرۃ القدس) قرآن کے نازل ہونے کا فیصلہ ہوا تو قرآن مجید کا اثرِ شخصی (لفظی یعنی اُس کی صورت کا اثر) ایک ہزار سال تک دنیا میں قطعی طور پر کامل ہو کر رہے گا۔ (یعنی یوں تو یہ کتاب ہمیشہ کے لیے دنیا میں رہے گی مگر صحیح لفظوں میں اس پر عمل ایک ہزار ماہ تک کامل ہوکر رہے گا)۔ ہماری سمجھ میں ایک سال دس ماہ کا ہوتا ہے۔ رمضان اور ذی الحج کے دو ماہ اس عملی وقت میں شمار میں نہیں آتے۔ انہیں چھٹی کے دو ماہ سمجھنے چاہییں۔ اور سال میں عملی مہینے دس ماہ سمجھنے چاہییں۔ تو اِس طرح ایک ہزار مہینے ایک سو سال کے برابر ہو جائیں گے۔ جیسا کہ سورۃ ق والقرآن المجید میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اور اِسی کے مساوی یوں سمجھیے کہ سنہ ۸۶ ہجری میں یہ سو برس پورے ہوتے ہیں۔ اُسی سال ولید نے عمر بن عبدالعزیز رضہ کو مدینہ منورہ کا حاکم مقرر کیا۔ اور انہوں نے مدینہ کے علماء کو جمع کر کے سنت (حدیث) کے لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اُس وقت تک مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے سوائے کوئی اور قانون نہیں تھا۔ اب یہ قانون اقصائے چین سے لے کر مغرب تک پہنچ گیا۔ متمدن اقوام عالم نے اس قانون کو اپنا دستورالعمل بنا لیا اور اپنا سمجھا۔

شروع میں سنت کو قرآن مجید کا ایک شارح (Bye-laws) بنا دیا گیا۔ یعنی اساسی قانون تو قرآن مجید ہے اور یہ سنت اس کی شارح ہے۔ مگر آگے چل کر قرآن مجید کا صرف اتنا حصہ مسلمانوں میں باقی رہا جو اُس سنت کے مطابق تھا اور بہت سا حصہ چھوٹ گیا۔ اس سنت میں عربی قومیت کے خواص خاص طور پر نمایاں ہیں۔ دوسری صدی میں قرآن مجید عربی قومیت کا ایک قسم کا قانون تھا اور سنت اُس کی

پوری شارح۔ قرآن مجید کی بین الاقوامی روح اس دوسری صدی میں اتنی نمایاں نہیں رہی جتنی پہلی صدی میں تھی۔ تیسری صدی میں جب بنو ہاشم کی سرپرستی میں عجمی قومیں آگے بڑھیں تو قرآن مجید کی انٹرنیشنل روح * زیادہ نمایاں ہونے لگی۔

آیت (۱) انا انزلناہ فی لیلۃ القدر †:- ہم نے اس قرآن مجید کو لیلۃالقدر میں نازل کیا۔ یعنی جس رات انسانی فطرت کا بجٹ تیار ہوا تھا اُس رات یہ پروگرام منظور ہوا ہے۔

آیت (۲) و ما ادراک ما لیلۃ القدر:- اِس آیت میں لیلۃالقدر کی تفصیل ہے۔

آیت (۳) لیلۃ القدر خیر من الف شھر:- وہ لیلۃالقدر ایک ہزار مہینے سے اچھی ہے۔ انسان جب کسی کام کے کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو وہ کام نصف ± سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اب صحیح فیصلہ کے بعد اُس کا صحیح دور شروع ہو گا تو اس میں وہ مجموعی طاقت کے کم حصہ کا مالک ہے یعنی اِس حصہ میں پورے کام کے آدھے سے بھی کم کام رہ جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس لیلۃالقدر کی رات میں سو (۱۰۰) سال کے کام کا فیصلہ تھا تو فیصلہ کی رات اس زمانہ سے بہتر ہونی چاہیے۔ یعنی پروگرام بنانے والی رات اُس زمانے سے تو اچھی ہے جس زمانے میں یہ کام عملی طور پر شروع کر دیا جائے (کیوں کہ مصمم ارادہ کرنے سے آدھے سے زیادہ کام ہو جاتا ہے)۔ غرض کہ جس وقت یہ فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو آپ نے اپنی فطرت کے مطابق عمل کیا۔ آپ کی فطرت یہ تھی کہ جب علم ہو جائے کہ اللہ کی طرف سے فلاں فیصلہ ہے تو آپ اپنی پوری قوت اِس کام کے سرانجام دینے میں صرف کر دیتے تھے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے جھک جاتے تھے۔

غرض یہ رات زمین پر بھی ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ کیوں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی اسی طرح مکمل ہے جس طرح ملاء اعلیٰ میں مکمل فیصلہ ہوا۔

آیت (۴) تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر:- اس مصمم فیصلہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ کارکن فرشتے اور روح اس ہزار مہینے کا کام کرنے کے لیے اُسی وقت نازل ہو جاتے ہیں۔ اور ہر قسم کا کام کرنے والے فرشتے اور روح سب نازل

---

* روح کا اقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور اُس کے دیدار کا اشتیاق ہو اور ملکیت کا تقاضا، طہارت اور نظام احسن ہے۔

† حظیرۃالقدس اسی رات کے مانند ہے۔

± نصف سے کم باقی رہتا ہے جو عمل کرنے سے پورا ہو جاتا ہے یعنی عملی دور جو آئے گا وہ نصف سے کم وقت لے گا۔ ایسے وقت میں علم اور اس کا پروگرام بناکر اس پر اجتماع کرنا ہے۔

ھونا شروع ھو جاتے ھیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کام کی بنیاد ڈالنی شروع کر دیتے ھیں اور تمام شعبوں میں کام کرنے لگ جاتے ھیں اور اس کام کے مبادی، شروط اور علل کے مہیا کرنے میں وہ فوراً اپنا کام شروع کر دیتے ھیں اور وہ کام ایک ھزار ماہ میں پوری طرح مکمل ھو جاتا ھے جیسا کہ فیصلہ ھوا تھا۔

آیت (۵) سلام ھی حتی مطلع الفجر: اس رات میں جس کام کی بنیاد رکھی جاتی ھے اس میں کامیابی ھی کامیابی ھے یعنی سلامتی ھے۔ اس کا مطلب یہ ھے کہ اس کام میں ناکام بنانے والی کوئی طاقت آ ھی نہیں سکتی۔ اگر ادنیٰ آدمی کو بھی اس کام پر مامور کیا جائے تو بھی صحیح سلامت کام ھو جائے گا۔ اس لیے کہ لوگوں (انسانیت) میں روحانیت اور ملکیت کی تشنگی اس رات نازل کردی گئی تھی۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے چلانے میں تکلیف نہ ھوگی۔

سورۃ العلق میں آیت (۱۹) کلا لا تطع میں جو ذکر ھے کہ تم مخالفوں سے صلح نہ کرو، اس کے متعلق اس سورۃ میں یقین دلایا گیا ھے کہ اس سو برس کے عرصہ میں کوئی چیز تم کو ناکام نہیں بنا سکے گی۔ اس واسطے تم کو ڈٹ کر اپنا کام کرنا چاھیے۔ اگر کوئی مخالفت کرے گا تو اس کا ھم سر توڑ دیں گے۔ مطلع الفجر سے اگر قیامت مراد لی جائے تو معنی ھوں گے کہ تشنگی، ملکیت اور روحانیت کی انسانوں میں نازل ھوتی رھے گی۔ ملکیت کا تقاضا ھے نظام احسن، طہارت اور عدالت۔ روحانیت کا تقاضا ھے تعلق باللہ اور اس کے نور میں فنائیت۔ اگر روحانیت فقط ھے تو رھبانیت ھے۔

جب دنیا کا انٹرنیشنل مرکز ۱۰۰ برس میں اپنے مرکز کو مضبوط بنا لے گا تو اس کے بعد کیا پروگرام دیا جائے، اس کے متعلق ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ھے۔ اس بارے میں دوسری نسل والے خود سوچیں گے اور اس پر وقت کے اقتضا کے مطابق کام کریں گے۔ اس واسطے اس کے متعلق یہاں ذکر کرنے کی حاجت نہیں ھے۔

بعض لوگ عمر بن عبدالعزیز رض کو دوسری صدی کے خاتمے پر مجدد مانتے ھیں اور وہ ۱۰۰ ھجری میں خلیفۂ اسلام ھوئے تو اس زمانے کو ان کی تجدید کا زمانہ کہتے ھیں کہ دوسری صدی کے سر پر ایک مجدد آ گیا۔ مگر ھم اس کی تجدید ۸۷ ھجری سے گنتے ھیں جو نبوت کے ۱۰۰ برس بعد ھوئی اور چودہ (۱۴) برس مسلسل رھی یہاں تک کہ خلافت پر پہنچے۔ اور خلافت کا کام صرف دو سال کے قریب انہوں نے سر انجام دیا۔ مگر ان کا کام درحقیقت نبوت کی صدی سے شروع ھوتا ھے۔ انہوں نے انٹرنیشنل روح قائم کرنے کے لیے آیت ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان الآیہ کا خطبہ جمعہ میں داخل کر دیا جس کا مسلمانوں کے خطبہ میں آج تک اعلان ھوتا ھے۔ عمر بن عبدالعزیز رض کی تجدید کا جو دور ھے اس کے متعلق ھمیں خوشی ھے کہ اس

زمانے میں سندھ فتح ہوا۔ آپ کی خلافت کے زمانے میں جو دو سال کے قریب رہی سندھ کا اکثر حصہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان میں اسلام کا یہ اول بیج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پنجاب، کشمیر، سندھ، فرنٹیر اور افغانستان وغیرہ میں جس قدر قومیں بستی ہیں یہ ہندستان کے مسلمانوں کی مرکزی جماعتیں ہیں اور یہی امامت کی حقدار ہیں۔ دریائے سیحون درحقیقت یہی دریائے سندھ ہے جس کا حدیث میں ذکر آتا ہے۔ ہندی میں اس کا نام ہے سین۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث میں اس کا نام سیحون ذکر کیا ہے، تو یہ زیادہ اختلاف نہیں ہے، ملکی زبانوں میں ایسے اختلافات عموماً ہوتے ہیں۔ پنجاب کے پانچوں دریا اور کابل کا دریا وغیرہ درحقیقت دریائے سندھ کا احاطہ ہیں۔ ہندوستان میں ہم تمام ہندوستان ہندوؤں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں۔ مگر اِس علاقہ یعنی پنجاب، کشمیر، سندھ، فرنٹیئر، بلوچستان اور افغانستان سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے، خواہ وہ تمام دنیا کو ہمارے مقابلے پر لے آئیں۔ غرض مسلمانوں کا مرکزی حصہ یہی ہے۔ اِس طرح عربی قوموں کا مرکز نیل اور فرات کا درمیانی حصہ ہے اور عجمی قوموں کا مرکزی حصہ جیحون اور سندھ کا درمیانی حصہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس عجمی سرزمین سے تعلق رکھنے والے تھے۔

عمر بن عبدالعزیز رض نے قرآن کے ماتحت عربی ذہنیت کو مہذب کر دیا۔ ہمارا خیال ہے کہ عجمی ذہنیت کو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے زندہ اور مہذب کردیا۔ آپ بہت بڑے امام ہیں۔ آپ عجمی قوم کو قرآن مجید اور فقہ کے مطابق اور حدیث پر عمل کرانے کے لیے عجمی ذہنیت مدنظر رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت ہے کہ اُس کو حمل ہے۔ اُس کی شادی نہیں ہوئی اور وہ زنا کی بھی قائل نہیں ہوتی۔ اور اُس کے خلاف شہادت بھی میسر نہیں ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس کو رجم کی سزا دیتے ہیں مگر امام ابوحنیفہ اُس کو رد کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب وہ زنا کی مرتکب ہونے کی قائل نہیں اور اُس کے خلاف ثبوت بھی نہیں ملتا تو اس حالت میں اُسے کیسے رجم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ لیجیے کہ آپ کو حمل بھی تھا اور آپ زنا کی بھی مرتکب نہیں ہوئیں مگر اس کے باوجود آپ کی دین داری کی دنیا گواہ ہے: غرض اِسی طرح اُس عورت کا بھی معاملہ ہے۔ شک کا فائدہ ہمیشہ ملزم کو دینا چاہیے۔

امام ابوحنیفہ نے نہ امامت کا دعویٰ کیا اور نہ حکومت سے منصب لیا اور نہ کسی سے کوئی پیسہ لیا بلکہ اپنا تمام علم مسلمانوں کو دے دیا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ایک آیت تھی کہ اُس نے عجمی قوموں کی ہدایت کے لیے ابوحنیفہ

جیسا برگزیدہ انسان پیدا کیا جس نے قرآن مجید کے سمجھنے میں عجمی لوگوں کی ذہنیت بدل دی۔ ہم ابو حنیفہؒ کے فقہ کی تقلید اِس لیے نہیں کرتے کہ ہمارے آباو اجداد اس کے قائل تھے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان، ایران، افغانستان اور ترکستان میں ابو حنیفہ کے فقہ کے سوائے کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ اس میں اگر اختلاف ہے تو صرف ایران کے شیعوں کا۔ مگر ہم امام ابوحنیفہؒ کے فقہ کو ائمہ اہل بیت کے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ شیعوں کے دو فرقے ہیں ایک زیدی اور دوسرا امامیہ۔ زیدی فرقہ کے امام حضرت زید ہیں اور امامیہ فرقہ کے امام حضرت امام جعفر صادق ہیں۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ ان دونوں بزرگوں کے براہ راست شاگرد ہیں۔ اس کے علاوہ امام ابو حنیفہ امام باقر کے بھی شاگرد ہیں۔

ان بزرگوں کے علاوہ دو حسینی امام ہیں (۱) محمد بن عبداللہ بن حسن اور (۲) ابراہیم بن عبداللہ بن حسن بن حسن علی علیہم السلام۔ انہیں حسن مثنی کہتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ خلیفہ منصور سے لڑے ہیں اور امام ابو حنیفہ ان دونوں کے شاگرد ہیں اور ان دونوں بزرگوں کی تحریک خلافت کے مؤید اور معاون ہیں اور آن کو مدد دیتے رہے ان دونوں اماموں کے والد عبداللہ بن حسن بھی امام ابو حنیفہ کے آستاد تھے۔ غرض حضرت علی علیہ السلام کی اولاد میں جتنے امام گزرے ہیں امام ابو حنیفہ کا تعلق ان تمام اماموں سے ثابت ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن مسعودؓ کی اولاد میں جتنے امام پیدا ہوئے امام ابو حنیفہ کا ان تمام کے ساتھ تعلق تھا۔ اور یہ تمام ائمہ اہل بیت ظالم مسلمان بادشاہ سے لڑنا فرض سمجھتے تھے۔ اسی واسطے آپ خلیفہ منصور کے خلاف سید حسن مثنی کی تحریک کے مؤید تھے۔

امام مالک بھی مدینہ میں امام ابوحنیفہ کے مانند اس تحریک خلافت کے مؤید تھے۔ منصور کے نائب مدینہ نے امام مالک کو تو خود سزا دی اور خلیفہ منصور نے امام ابوحنیفہ کو جیل میں ڈال کر کوڑے کی سزا دلائی۔ حتیٰ کہ آپ جیل ہی میں فوت ہوگئے۔

ہارون الرشید کے زمانے میں برامکہ بڑے کامیاب اور مشہور وزیر گزرے ہیں۔ یہ تمام ابو حنیفہ کے شاگردوں کے تربیت یافتہ ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف نے ان کی خاص تربیت کی۔

آستادان امام ابو حنیفہ :-

امام زید | امام باقر | امام جعفر | امام محمد بن عبداللہ بن حسن | ابراہیم بن عبداللہ بن حسن | عبداللہ بن حسن

امام ابو حنیفہ رحمۃاللہ علیہ

امام ابوحنیفہ اگرچہ شاہی تعلقات سے آزاد رہے لیکن قوم اور ملک کے ساتھ اُن کے جو تعلقات تھے وہ خود ایک ملکی حیثیت رکھتے تھے جس کے فرائض کو اُنہوں نے اس دانائی اور ھوشمندی کے ساتھ سرانجام دیا جو ایک مدبر سلطنت کے شایان شان تھے۔ اُن کے حلقہ درس سے جو شاگرد نکلے وہ ملکی عھدوں پر پھنچے اور نہایت دیانت اور قابلیت سے اپنی خدمتوں کو انجام دیا۔ ان میں خاص طور پر قاضی ابویوسف مشہور ھیں۔ یہ صحیح ھے کہ ملکی تعلقات کے ساتھ مذھب اور اخلاق کے فرائض کو سمجھادینا نہایت مشکل ھوتا ھے۔ لیکن امام صاحب اس سے بےخبر نہ تھے۔ وہ شاگردوں کو ھمیشہ ایسی ھدایتیں کرتے تھے جن کی پابندی سے دین اور دنیا دونوں حاصل ھوں۔ *

فقہ حنفی نہایت تیزی سے تمام ملک میں پھیل گیا۔ عرب میں تو چنداں رواج نہ ھوا کیوں کہ مدینہ میں امام مالک اور مکہ میں ائمہ اور اُن کے حریف مقابل موجود تھے۔ لیکن عرب کے سوا تمام ممالک اسلامیہ میں جن کی وسعت سندھ سے ایشیائے کوچک تھی عموماً اُنہیں کا طریقہ جاری ھوگیا۔ ھندوستان، سندھ، کابل اور بخارا وغیرہ میں تو اُن کے اجتہاد کے سوا کسی کا اجتہاد تسلیم ھی نہیں کیا جاتا۔ ایک خاص بات یہ ھے کہ عنانِ حکومت جن لوگوں کے ھاتھ رھی وہ اکثر حنفی فقہ ھی کے پابند تھے۔ خلفاء عباسیہ تو اس بحث سے خارج ھیں کیوں کہ یہ خاندان جب تک عروج پر رھا تلوار کے ساتھ قلم کا بھی مالک رھا ھے۔ اُن کو خود اجتہاد کا دعویٰ تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی۔ تنزل کے بعد وہ اس قابل نہیں رھے کہ اُن کے حالات سے کسی ملکی اثر کا اندازہ کیا جائے۔ تاھم اُن میں اگر کسی نے تقلید گوارا کی تو امام ابوحنیفہ کی۔

عباسیہ کے تنزل کے ساتھ جن خاندانوں کو عروج ھوا وہ اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوق جس نے ایک بڑی مدت تک حکومت کی اور جس کے دائرۂ حکومت کی وسعت طول میں کاشغر سے بیت المقدس اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خرز تک پھنچی تھی، حنفی تھا۔ سلطان محمود غزنوی فقہ حنفی کا بہت بڑا عالم تھا۔ فن فقہ میں اُس کی ایک نہایت عمدہ تصنیف موجود ھے جس کا نام التفرید ھے اور جس میں کم و بیش ساٹھ ھزار مسئلے ھیں۔

نورالدین زنگی جس نے سب سے پھلے بیت المقدس کی لڑائیوں میں نام پیدا کیا اور جس کے دربار کا ملازم صلاح الدین فاتح بیت المقدس تھا وہ اگرچہ شافعی و مالکی فقہ کی بھی عزت کرتا تھا لیکن وہ خود اور اُس کا تمام خاندان مذھباً حنفی تھا۔ صلاح الدین خود شافعی تھا مگر اُس کے خاندان میں بھی حنفی المذھب موجود تھے۔ الملک المعظم عیسیٰ بن الملک العادل جو ایک وسیع ملک کا بادشاہ تھا حنفی مذھب

* سیرت نعمان ص۔ ۵۸۔

میں غلو رکھتا تھا۔ چراکثہ مصر جو نویں صدی کے آغاز میں مصر کی حکومت پر پہنچے اور ۱۴۸ برس تک فرماں‌روا رہے اور بہت سی فتوحات حاصل کیں، خود حنفی تھے اور اُن کے دربار میں اِسی مذہب کو زیادہ فروغ حاصل تھا۔ اب تک مصری حکومت کا قانون ہے کہ قاضی سے عہد لیتے ہیں کہ حنفی مذہب پر فیصلہ کرے۔ سلاطین ترک جو کم و بیش چھ سو برس سے روم کے فرماں روا ہیں عموماً حنفی ہیں۔ خود ہمارے ہندوستان کے فرمان روا خوانین اور آل تیمور اِسی مذہب کے پابند رہے اور اُن کی وسیع سلطنت میں اس طریقہ کے سوائے اور کسی طریقہ کو رواج نہ ہو سکا۔

تمام ممالک اسلام میں تین فقہوں نے رواج پایا:- حنفی فقہ، مالکی فقہ، شافعی فقہ۔ مسائل فقہ کی ترویج و اشاعت کا سبب اگرچہ خود اُن کے مسائل کی خوبی و عمدگی ہے، لیکن کچھ شبہ نہیں ہے کہ اِس امر میں وضع فقہ کے ذاتی رسوخ اور عظمت کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ امام ابوحنیفہ کے سوا اور مجتہدین کے فقہ کی ترویج و اشاعت کا باعث زیادہ تر اُن کی ذاتی خصوصیتیں تھیں۔ امام مالک مدینہ میں رہنے والے تھے جو نبوت کا مرکز اور خلفاے راشدین کا دارالخلافہ رہ چکا ہے اور اُن کا خاندان ایک علمی خاندان رہ چکا ہے۔ اسی طرح امام شافعی کا وطن مکہ معظمہ تھا۔ باپ کی طرف سے قریشی اور ماں کی طرف سے ہاشمی تھے۔ مکہ معظمہ کی ولادت، خاندان کا اعزاز اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نسبی ایسی چیزیں تھیں جن سے بڑھ کر حسن قبول اور مرجعیت کے لیے کوئی آلہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ امام ابوحنیفہ میں اس قسم کی کوئی خوبی موجود نہ تھی اور نہ کوئی خصوصیت تھی۔ وہ عربی‌النسل بھی نہیں تھے۔ خاندان میں کوئی ایسا شخص نہیں گذرا جو اسلامی گروہ کا مرجع اور مقتدر ہوتا۔ آبائی پیشہ تجارت تھا اور خود بھی تمام عمر اس ذریعے سے زندگی بسر کی۔ غرض کہ حسن قبول اور عام اثر کے لیے جو اسباب درکار ہیں وہ بالکل نہ تھے۔ اس کے باوجود اُن کے فقہ کا تمام ممالک اسلامیہ میں اس وسعت اور ترقی کے ساتھ رواج پانا یقیناً اِس بات کی دلیل ہے کہ ان کا طریقۂ فقہ انسانی ضرورتوں کے لیے نہایت مناسب اور موزون واقع ہوا تھا اور بالخصوص تمدن کے ساتھ جس قدر اُن کے فقہ کو مناسبت تھی، کسی فقہ کو نہ تھی۔

وضع مسائل میں شافعی اور مالکی، فقہ حنفی کی تقلید کرتے ہیں۔ علم کا پہلا درجہ ہے وضع سوال۔ جس طرح وضع سوال کی امام ابوحنیفہ نے اختیار کی اُس کو تمام فقہ والے اختیار کرتے ہیں۔ امام شافعی نے خود جا کر امام محمد سے فقہ کے قواعد سیکھے۔ اِسی طرح مدونہ کی تدوین کرنے والے امام ابوالقاسم مالکی نے امام ابوحنیفہ کے شاگردوں سے فقہ سیکھا۔ فقہ میں بڑی مشکل بات وضع سوال ہے تو یہ بات فقہ حنفی کی ایجاد شدہ ہے۔

سُورَةُ الْبَيِّنَةِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

سورہ التین مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى

نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں اهل کتاب اور مشرک باز آنے والے یہاں تک

تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ (۱) رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً (۲) فِيْهَا كُتُبٌ

کہ پہنچے اُن کے پاس کھلی بات، ایک رسول اللہ کا پڑھتا ہوا ورق پاک، اُس میں لکھی ہیں کتابیں

قَيِّمَةٌ (۳) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ

مضبوط اور وہ جو پھوٹ پڑی اهل کتاب میں سو جب کہ آچکی اُن کے پاس

الْبَيِّنَةُ (۴) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۵

کھلی بات اور اُن کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کرکے اُس کے واسطے بندگی

حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (۵) اِنَّ الَّذِيْنَ

ابراهیمؑ کی راہ پر اور قائم رکھیں نماز اور دیں زکواۃ اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی اور جو

كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

منکر ہوئے اهل کتاب اور مشرک ہوں گے دوزخ کی آگ میں سدا رہیں اُس میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمO

سورۃ البینۃ مدنیۃ

سورۃ بینہ میں ہے کہ ذہنی اور سوشل انقلاب کسی اہل کتاب یا مشرکین کی کسی جماعت نے نہیں کیا وہ ری اکشنری ہو گئے تھے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ ایک نبی آ کر انقلاب کرے۔ و ما تفرق الذی الآیہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک فرقہ اہل کتاب میں سے بھی انقلابی ہو گیا، تو وہ بھی اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اُن کو برانگیختہ کیا۔ و ما تفرق الذین یعنی فرقہ فرقہ ہوئی، ایک جماعت انقلابی ہوئی اور ایک انقلابی نہ ہوئی۔ جو انقلابی تھے اُنہوں نے پورا انقلاب نہیں کیا بلکہ انقلاب میں کچھ حصہ لیا۔

الحاصل اِس سورت کا مطلب ہے کہ قرآن، اِسلام کا ایک عمومی پروگرام ہے۔ (سورۃ القدر میں اس کا بیان ہو چکا ہے) اور اس کا عملی مجسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کوئی تعلیم جب تک انسانی شکل میں مجسم نہ ہو جائے دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتی۔ اس سورۃ کا بس اتنا خلاصہ ہے۔

آیت (۱) لم یکن الذین کفروا* من اہل الکتاب † الآیہ:۔ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ اپنے دین پر عمل کرنا چھوڑ بیٹھے وہ لوگ کبھی باز نہ آئیں گے جب تک کہ ان کے پاس البینہ نہ آجائے۔

آیت (۲) رسول من اللہ یتلوا الآیہ:۔ اس بینہ کی تفسیر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔

یتلوا صحفاً مطہرۃ:۔ ان مقدس صحیفوں میں نہ ٹوٹنے والے قانون ہیں جو فطرت

---

* حضرت شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم اپنی تصنیفات میں ایک کدائی نظام کا لفظ انقلاب کی جگہ پر فرماتے ہیں:۔ تھوڑے عرصہ میں یعنی ۱۰۰ سال میں انقلاب روحانی و مسلکیت جو کہ نصب العین کتاب اللہ کا ہے اور جس کا ذکر سورۃ القدر میں ہوا ہے وہ انقلاب نہ مشرکین سے اور نہ اہل کتاب سے ہو سکتا تھا، اگرچہ حکومتوں کے انقلاب ہوئے۔

† تین فرقے جو کہ خود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیرو جانتے تھے انقلاب روحانی و مسلکیت نہیں کر سکتے تھے اس لیے نئی جماعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اُولٰٓئِکَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ (۶) اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ

وہ لوگ ھیں سب خلق سے بدتر. وہ لوگ جو یقین لائے اور کیے بھلے کام وہ لوگ ھیں

هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ (۷) جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

سب خلق سے بہتر. بدلہ اُن کا اُن کے رب کے یہاں باغ ھیں ھمیشہ رھنے کو نیچے بہتی ھیں اُن کے نہریں

خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِکَ لِمَنْ خَشِیَ رَبَّهٗ (۸)

سدا رھیں اُن میں ھمیشہ. اللہ اُن سے راضی اور وہ اُس سے راضی یہ ملتا ھے اُس کو جو ڈرا اپنے رب سے.

انسانی کے ساتھ لازم و ملزوم ھیں۔ فطرت انسانی جب تک اس رنگ پر رھے گی جس پر کہ وہ ابتدا سے چلی آ رھی ھے اُس وقت تک وہ قانون اِسی طرح رھیں گے۔ ھر ایک سورت مقدس صحیفہ ھے.

رسول ایک انسان ھے جسے تمام مقدس کتابوں کا خلاصہ یاد ھے۔ وہ تمام مقدس کتابوں کو قانون فطرت پر جمع کر سکتا ھے۔ اس کا دعویٰ ھے کہ کوئی نبی سوائے اس کے کہ انسانی فطرت کے طبعی قوانین سکھائے اور کوئی کام نہیں کرتا۔ اِس مقصد میں تمام دین ایک ھیں اور ھر ایک دین کو اپنی صحت کے لیے اس انٹرنیشنل نقطہ کو اپنے سامنے رکھنا چاھیے.

(آیت ۴ دیکھو آیت ۵ کے بعد)

آیت (۵) و ما اُمروا اِلا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین :۔ وہ مشترک نقطہ یہ ھے کہ وہ سارا دین اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مخصوص کر دیں۔ اُن کا قانون یہ ھو کہ اللہ تعالیٰ کی پوری غلامی کی جائے اور اس کے سوائے کسی کی غلامی نہ کی جائے.

حنفاء :۔ اور وہ دین حنیفی طریقہ پر ھو کہ جس میں کسی قسم کا کوئی مجسمہ سامنے رکھ کر عبادت نہ کی جائے اس لیے کہ اگر کوئی مجسمہ سامنے رکھا گیا تو پھر ھر ایک قوم اپنے اپنے مجسمے سامنے رکھے گی اور اس طرح اتحاد نہیں ھوگا یہ ھے حنفاء کا ترجمہ۔ یعنی تم میں سے ھر ایک حنیف بن جائے۔ حنیف لقب ھے ابراھیم علیہ السلام کا۔ اس میں فائدہ یہ ھوگا کہ ایک تو تمام قومیں آپس میں متحد ھو جائیں گی اور دوسرے انسان کی عقلیت پر زیادہ زور آئے گا بنسبت اُس کی حسیّات کے اور اس سے

انسانیت کے مرکز سنبھالنے والی ایک صحیح طاقت پیدا ہو جائے گی جو عقلیات پر بحث کرنے والی ہوگی اور ایک ہی نظریہ پر متفق ہو جائے گی۔ یہ ہے فائدہ حنفاء ہونے کا۔ عقلی باتوں پر اعتقاد کرنے والی تمام قوموں میں جس قدر حکیم پیدا ہوں گے اُن کا ایک ہی مسلک ہوگا۔ اور انسانیت اُن سے باہر نہیں جا سکے گی۔ حنفاء ہونے سے یہ فائدہ پہنچ رہا ہے کہ لوگوں کو ایک مرکز پر آنے کا طریقہ بتلا دیا گیا۔

کسی انقلابی انسان کو دیکھنے کے بعد انسان میں انقلاب آتا ہے یعنی انسان کسی دوسرے انقلابی زندہ انسان کی صحبت سے انقلاب سیکھ سکتا ہے۔ تو جس زندہ انسان کی صحبت سے کسی نے کچھ سیکھا ہے اُس کی تصویر یاد رکھنے کے لیے اگر اُس کا مجسمہ رکھنے کی ضرورت ہو تو وہ بالکل پاگل آدمی ہے جو اس طرح اُس کا مجسمہ سامنے رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس انسان کی صحبت سے انسان فیض یاب ہوتا ہے اُس کی صورت تو انسان کے دماغ میں خودبخود رہتی ہے اور یہ انسان کی عقلی قوتوں کو مؤثر کرنے کے لیے کافی ہے۔ اور گزشتہ بزرگوں کی تصویریں یاد کرنا اور اُن کے مجسمے سامنے رکھنا، انسان کو حقائق سمجھنے سے قاصر کر دیتا ہے۔ اس سے انسان کے دماغ پر ہر قسم کے خرافات قابض ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ جب کوئی آدمی کسی گذشتہ انسان کی صورت اپنے دل میں بٹھاتا ہے اور وہ نہ اُس کو جانتا ہے اور نہ اُس کی حقیقت کو جانتا ہے بلکہ کسی کے بتانے پر تصور کر لیتا ہے تو اِس سے بہت سے خرافات دماغ پر قابض ہو سکتے ہیں۔ محض وہمیات کو اُس کی طرف منسوب کر کے اُن کو اعتقادیات کے درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ اِس لیے اُستاد کی دیکھی ہوئی تصویر جو دماغ میں بیٹھ جاتی ہے کافی ہے کیوں کہ اس سے فقط اُن کے اعمال و افعال کی یاداشت دل میں اُترتی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی وہمیات اُس کے دماغ پر اثر نہیں کرتیں۔

خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کو جس قدر ایک اُستاد کی صورت سامنے رکھنے کی ضرورت ہے وہ مجسمہ رکھنے کے بغیر ہی حاصل ہے۔ اگر حقیقی اُستاد کے سوا کسی دوسرے کا مجسمہ سامنے رکھا جائے تو یہ انسان کی غلط رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے تصویر سامنے رکھ کر عبادت کرنے کا طریقہ بالکل منسوخ کر دیا گیا۔ یہ ہے حنفی دین کا خاصہ کہ جس پر قانون مبنی ہے اور جس کی دعوت قرآن مجید دیتا ہے۔

و یقیموا الصلواۃ و یؤتوا الزکواۃ :- نماز پڑھیں اور زکواۃ دیں۔ اس کی تشریح گذشتہ سورتوں میں کافی ہو چکی ہے۔

و ذالک دین القیمہ :- یہ وہ قانون ہے جو نہ تو کبھی شکست پا سکتا ہے اور نہ کبھی ٹوٹ سکتا ہے۔

آیت(۴) و ما تفرق الذین اوتوا الکتاب الا من بعد ما جاءتھم البینہ* :- اور جب وہ بینہ آیا تو بھی یہ اھل کتاب اپنا جدا فرقہ بنا کر بیٹھ گئے اور اس کی اتباع نہ کی تو اپنی کتاب کے حکم سے یہ مجرم ٹھہرائے جاتے ھیں۔

جو حکم آیت:- و ما اُمروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء و یقیموا الصلواۃ ویوتوا الزکواۃ یہ عمل مشترک ھے جو تمام ادیان میں مسلّم تھا۔ اس کی دعوت دینے والا انسان راسخ القدم سامنے آ گیا۔ اب اس کے بعد کسی اھل کتاب کو کیا حق ھے کہ وہ انٹرنیشنل نقطہ سے علحدہ ھو جائے۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ ھر مذھب کی کتابوں میں اس شخص (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پیشین گوئی موجود ھے۔ (انجیل میں فارقلیط، توراۃ میں مسیخ یا مسیح اور ھندو ویدوں میں رام کے آنے کی پیشین گوئی اور اھل فارس میں اِس طرح کہ ایک شخص آئے گا جس کا نزول خدا کے نزول کے برابر ھوگا۔ وہ نہایت آسانی سے آسمانی بادشاھت زمین پر قائم کرے گا۔ ایک مبصر انسان تمام مذھبوں کی پیشین گوئیاں جمع کرے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح منطبق ھوجاتی ھیں۔ تو آنے والا آ گیا مگر یہ لوگ یعنی اھل مذھب آج تک انتظار کر رھے ھیں) اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جب وہ شخص آئے تو اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر اھل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ، مجوس اور ھندو اپنے فرقہ کو الگ رکھنے کی کوشش کریں تو ان کے مجرم ھونے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رھتا۔ ان کی کتاب میں ان کو حکم تھا کہ جب وہ شخص آئے تو اس کی فوراً اطاعت کریں۔ اور جب انہوں نے اطاعت سے انکار کر دیا تو وہ اپنی کتاب کی رو سے مجرم بن گئے۔

آیت (۶) ان الذین کفروا من اھل الکتاب‡ والمشرکین :- اھل کتاب کو

---

* اس جگہ تفسیر روح المعانی کو دیکھو کہ وہ بھی احتمال نکالتی ھے۔ ھم نے کہا ھے کہ بعض انقلابی بنے اور بعض انقلابی نہ بنے یہ معنیٰ ھے تفرق کا۔ اور روح المعانی نے اس کو اِس طرح بیان کیا ھے کہ ایک جماعت ایمان لائی اور ایک ایمان نہ لائی۔ تو ھم اس کی بھی یوں تعبیر کریں گے کہ ایک جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریات پر ایمان لائی اور دوسری ویسی کی ویسی رھی۔ یعنی اھل کتاب کے ایک فرقہ نے تعلیم کے نقطہ پر انقلاب کیا، کسی مصنوعات کے نقطہ پر نہیں۔ مگر یہ سب کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ھوا۔

‡ اھل کتاب کے ایک فرقے نے یہ انقلاب قبول کر لیا جیسے اھل شام و مصر۔ دونوں نے انقلاب مَلکیت اور روحانیت کا قبول کر لیا۔ یا تو خود مسلمان ھو گئے یا اس انقلاب سے متاثر ھو کر کام کرنے لگے۔ ایک فرقہ ترقی کا خواھاں ھو گیا اور دوسرا فرقہ (ان الذین کفروا) کے تحت اپنی ری ایکشنری حالت پر رھا تو اس کو دنیا و آخرت میں نار جہنم ھے۔ یعنی ھمیشہ غلام رھا یہ معنی ھے و ما تفرق کا۔ واللہ اعلم۔

حکم تھا کہ اس نبی کی اطاعت کرو۔ مگر وہ اس نبی کی اطاعت نہیں کرتے۔ اس واسطے وہ اپنی کتاب کے حکم کے مطابق کافر ٹھہرے۔

اب مشرکین کا ذکر آتا ہے کہ وہ اپنے سامنے صورتیں رکھ کر عبادت کرتے ہیں۔ دین حنیفی کے آنے پر یہ طریقہ بند کر دیا گیا اور یہ بات تو مشرکین مکہ پر واضح ہے۔ اس واسطے فی نار جہنم خالدین فیہا ان دونوں کی سزا جہنم ہے یعنی یہ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اولئک ھم شرالبریہ: وہ انسانیت کا بدترین حصہ ہیں کیوں کہ یہ ری اکشنری جماعت ہیں۔ ترقی پسند نہیں۔

آیت (۷) ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات:- جو لوگ اس نبی کی دعوت کو مان کر اچھے کاموں میں لگ گئے اولئک ھم خیر البریہ: وہ انسانیت کا بہترین حصہ ہے۔

آیت (۸) جزاءھم عند ربھم الآیہ:- ان کے لیے بہشت ہے۔ رضی اللہ عنھم و رضو عنہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی۔ مطلب یہ کہ یہ مرکزی جماعت ہے۔

ذالک لمن خشی ربہ:- یہ درجہ ان لوگوں کے لیے ثابت ہوگا جو ربّانی نظام کے سلسلۂ علت و معلول کو ٹھیک طرح سمجھتے ہیں۔ انہی کے دل میں سزا ملنے سے پہلے ڈر پیدا ہو سکتا ہے۔ اور ان کے دل میں عاقبت اندیشی کی وہ استعداد ہے اور یہی جماعت ہے جس کے حق میں ہے کہ انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء۔

سُورَةُ الزِّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

سورہ زلزال مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۱) وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۲)

جب ہلا ڈالے زمین کو اس کے بھونچال سے اور نکال باہر کرے زمین اپنے اندر سے بوجھ

وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا (۳) يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا (۴) بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى

اور کہے آدمی اس کو کیا ہو گیا اس دن کہہ ڈالے گی وہ اپنی باتیں اس واسطے کہ تیرے رب نے حکم بھیجا

لَهَا (۵) يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۵ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ (۶) فَمَنْ يَّعْمَلْ

اس کو اس دن ہو پڑیں گے لوگ طرح طرح پر کہ ان کو دکھائے جائیں ان کے عمل سو جس نے کی

مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (۷) وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۸)

ذرّہ بھر بھلائی وہ دیکھ لے گا اسے اور جس نے کی ذرّہ بھر برائی وہ دیکھ لے گا اسے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ الزلزال مدنیۃ

جو لوگ ربّانی نظام کو راست جاننے والے ہیں وہ اگر کسی گاؤں میں ہوں گے تو اساسی قانون کے تحت ایک چھوٹی سی جماعت پیدا کر دیں گے۔ اگر شہر میں ہوں گے تو اس طرز کی جماعت شہر ہی میں پیدا کر دیں گے۔ اگر کسی ملک میں ہوں گے تو اسی طرح گاؤں اور شہر کی جماعت کو ترقی دے کر ملک بھر میں جماعت بنا دیں گے اور پھر ترقی کر کے تمام دنیا میں اس قسم کی جماعت پیدا کر دیں گے۔ غرض جو شخص ربّانی نظامِ قدرت کو سمجھتا ہے وہ اس سے نیچے تو ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ جو شخص گاؤں میں اس اس قسم کا نظام پیدا کر دیتا ہے اسے اس کی حفاظت کا بالکل یقین نہیں ہوتا جب تک ایسا نظام شہر میں پیدا نہ کر دے۔ ورنہ شہر کا فاسد نظام گاؤں میں آ کر اچھے نظام پر غالب آجائے گا۔ اسی طرح جب ایک شہر میں اچھا نظام پیدا کر دیا جائے گا تو اس پر کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک میں ایسا نظام پیدا نہ کیا جائے۔ ورنہ ملک کا فاسد نظام اس شہر کے اچھے نظام کو کھا جائے گا۔ اسی طرح جب ایک ملک میں اچھا نظام پیدا کر دیا جائے گا تو اس پر بھی کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا جب تک کہ دنیا کی تمام متمدن قوموں کو اس نظام کا پابند نہ بنا دیا جائے ورنہ بین الاقوامیت کی اکثریت اس نظام کو فاسد کر دے گی اور بگاڑ کر رکھ دے گی۔ تو نظام قدرت کے علّت و معلول کے سمجھنے کا لوگوں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ ہر مستقبل میں آنے والے خطرے سے ڈر کر اس کی پیش بندی کردیں گے اور دنیا میں انسانیت کے لیے ایک عمدہ انٹرنیشنل مرکز پیدا کر دیں گے۔ اسلام نے اس کو پہلی صدی میں طے کرلیا ہے۔ یہ مطلب العلق، القدر اور البینہ کے ارتباط کا ہے۔

آیت (۷ و ۸) و من یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ :-
اِن دونوں آیات میں مرکزی نقطہ سمجھایا گیا ہے۔ ربّانی نظامِ قدرت (علّت و معلول) کا جو سلسلہ ہے اُس کی انتہا یہ ہے کہ انسان جو کچھ عمل کرے گا اُس کی جزا اُس کو ضرور ملے گی۔ یہ جزا خواہ اُسے اِس دنیا میں ملے یا اگلی دنیا میں، مگر اس کی جزا

مل کر رہے گی۔ انسان اگر انسانیت کے قانون کو ذرہ بھر بھی توڑے گا (اس کا نام برائی ہے) تو اس کی سزا اس کو مل کر رہے گی۔ یہ نظام کی پختگی کی دلیل ہے کہ یہ نظام کسی صورت میں ٹوٹ نہیں سکتا۔

اس موجودہ نظام کی رسیاں جب ڈھیلی پڑ جائیں گی تو زمین میں انقلاب آجائے گا اِس لیے کہ اب ڈھیلا ہونے سے یہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ جیسے خیمہ کی چوبیں اور طنابیں اگر ڈھیلی پڑ جائیں تو خیمہ کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ اور یہ قیامت کی ابتدا ہے۔

آیت (۱ و ۲) اذا زلزلت الارض زلزالھا و اخرجت الارض اثقالھا :- زمین اپنے جسم کے موافق پورے زور سے زلزلہ میں آجائے گی یعنی اِس نظام کی رسیوں میں جب خلل آجائے گا تو زمین ٹھہر نہیں سکے گی۔ یہ ابتدا ہے دوسری زندگی کی۔ اور انسان کا جو حصہ زمین میں دفن ہو گا اُس کو نکال دے گی تو انسان دوسری زندگی میں آجائے گا۔ جتنی بوجھل چیزیں ہیں زمین اُن سب کو نکال دے گی۔ انسان اس زمین پر صرف اسی شرط پر زندہ رہ سکتا ہے کہ یہ موجودہ نظام قائم رہے یعنی یہ سورج اور چاند اور آسمان قائم رہیں۔ آسمان سے بارش ہو، زمین سیراب ہو وغیرہ۔ مگر جب یہ نظام ٹوٹ جائے گا تو انسان کے یہاں رہنے کی گنجایش ہی نہیں۔ اسی واسطے انسان ایک دوسری دنیا میں منتقل کیا جائے گا۔

آیت (۳ و ۴) و قال الانسان مالھا الآیہ : جتنے انسانی اعمال ہیں وہ تمام ننگے ہو رہے ہیں اور انسان کے ساتھ چمٹ رہے ہیں۔ جیسے کسی نے چوری کی ہے تو چوری کا گناہ اب چوری کی شکل میں انسان سے چمٹ رہا ہے اور انسان حیران ہو رہا ہے کہ یہ کیسے ہو رہا ہے۔

آیت (۵) بان ربك اوحیٰ لھا :- اللہ تعالیٰ نے زمین پر ایسی بارش کر دی ہے کہ انسان کے عمل اصل شکل میں انسان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

آیت (۶) یومئذ یصدر الناس اشتاتاً الآیہ :- اُس دن تمام بنی نوع انسان گروہ وار آئیں گے۔ یعنی ایک قسم کے اعمال کے لوگ ایک ایک جماعت میں ہوں گے تاکہ وہ اپنے اعمال کو دیکھ سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو قیامت کا ذکر آتا ہے اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان کو ایک عجیب چیز بتلانی منظور ہے۔ بلکہ اُسے یہ بتانا ہے کہ تیرا جو کچھ عمل اس دنیا میں ہے وہ ضایع نہیں کیا گیا۔ اس زمین کے نظام میں ایسا انقلاب پیدا کیا جائے گا کہ انسان کے کام ذرہ ذرہ محفوظ رکھے جائیں گے۔ اور اس کا معاوضہ انسان کو دیا جائے گا۔ اسی کا نام ہے قیامت۔

سورۃ العٰدیٰت مکیۃ وھی احدٰی عشرۃ آیۃ

سورہ عادیات مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعٰدِیٰتِ ضَبْحًا (۱) فَالْمُوْرِیٰتِ قَدْحًا (۲) فَالْمُغِیْرٰتِ صُبْحًا (۳)

قسم ہے دوڑنے والے گھوڑوں کی ہانپ کر، پھر آگ سلگانے والے جھاڑ کر، پھر غارت ڈالنے والے صبح کو

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا (۴) فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا (۵) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (۶)

پھر اٹھانے والے اس میں گرد، پھر گھس جانے والے اس وقت فوج میں، بے شک آدمی اپنے رب کا ناشکر ہے

وَ اِنَّهٗ عَلٰی ذٰلِكَ لَشَهِیْدٌ (۷) وَ اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۸) اَفَلَا یَعْلَمُ

اور وہ آدمی اس کام کو سامنے دیکھتا ہے اور آدمی محبت پر مال کی بہت پکا ہے، کیا نہیں جانتا

اِذَا بُعْثِرَ مَا فِی الْقُبُوْرِ (۹) وَ حُصِّلَ مَا فِی الصُّدُوْرِ (۱۰) اِنَّ

وہ وقت کہ کریدا جائے جو کچھ قبروں میں ہے اور تحقیق ہووے جو کچھ کہ جیوں میں ہے، بےشک

۱ رَبَّهُمْ بِهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّخَبِیْرٌ (۱۱)
ع
۲۵

ان کے رب کو ان کی اس دن سب خبر ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

سورۃ العادیات مکیۃ

آیت (۱ تا ۵) والعٰدیٰت ضبحاً ... فالمغیرات صبحاً الآیات :- گھوڑوں کو بطور قسم بیان کیا گیا ہے اور ان کی پانچ قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ اُن کے سمجھنے میں مفسرین کو بہت اشکال ہے۔ اُن کی ذہنیت یہ ہے کہ جہاں کہیں قسم کا ذکر آتا ہے وہ اسے بہت مقدس سمجھتے ہیں، اس خیال سے کہ قسم ہمیشہ مقدس چیز کے لیے آتی ہے۔ اب وہ ان گھوڑوں کو بھی مقدس بنانا چاہتے ہیں۔ اس واسطے وہ ان کو غازیوں کے گھوڑے کہتے ہیں۔ مگر یہ سورت مکی ہے اس واسطے غازی کہاں اور گھوڑے کہاں! - وہ کہتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ آگے چل کر غازی اور اُن کے گھوڑے ہوں گے۔ غرض اِس طرح وہ ظاہر سے بہت دور ہو گئے۔ اس واسطے بعض مفسرین نے حاجیوں کے قافلے کے اونٹوں کو اِس جگہ مراد لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مقدس چیز ہے۔ حاجیوں کے قافلے انھی اونٹوں پر جاتے تھے اور مکی زندگی میں یہ ہوتا تھا۔ اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ قسم کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے وہ اس میں بہت تقدس مراد لیتے ہیں۔ مگر ہماری رائے اس کے خلاف ہے۔ ہم ان قسموں کو تقدس کے طور پر نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ ایک فقط لطیف شہادت ہوتی ہے جس سے لطیف ذہنیت کو بات جلدی سمجھا دی جاتی ہے۔ اگر اس نازک مسئلہ پر حجت اور دلیل قائم کی جاتی تو اس پر بہت جھگڑے پیدا ہو جاتے۔ اس واسطے ہم اس سے ڈاکوؤں کے گھوڑے مراد لیتے ہیں۔ اہل عرب ان سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس جگہ اُن گھوڑوں کا ذکر کر کے ایک نتیجہ نکالا جائے گا اور یہی قسم کا مطلب ہے۔

آیت (۱ و ۲) گھوڑوں کی تعریف ہے۔ آیت (۳) **فالمغیرات صبحاً** :- صبح کے وقت غارت ڈالنے والے گھوڑے۔ آیت (۴) **فاثرن بہ نقعاً** :- اُنہوں نے غبار اُٹھایا یعنی حملہ کر دیا۔ آیت (۵) **فوسطن بہ جمعاً** :- اور دشمن کی جماعت مرکز پر پہنچ گئی لشکر کا امیر ہمیشہ وسط میں چلتا ہے تو یہ وسط پر غالب آگئے۔ ان گھوڑوں نے اپنے مالکوں کے لیے کس قدر بڑا کام کیا اور اُن کو کس قدر فائدہ پہنچایا؟ یہی کہ اُن کی حکومت پیدا کر دی اور اس کے ساتھ اُنہوں نے خود بہت سی تکلیفیں برداشت کیں مگر گھوڑوں کو کیا حاصل ہوا؟ صرف یہی کہ ڈاکو اُن کو دانہ گھاس اور پانی وقت پر دیتے ہیں۔ اتنی بات پر ایک حیوان، انسان کا اس قدر اطاعت گزار ہو جاتا ہے۔

آیت (۶) **ان الانسان لربہ لکنود** :- اب جوابِ قسم ہے، جس پر شہادت دی گئی ہے کہ درحقیقت انسان اپنے رب کا بہت ناشکر ہے۔ اب مقابلہ کر کے دیکھو کہ

انسان اللہ تعالیٰ کی کس قدر نعمتیں کھاتا ہے۔ اور کیا وہ گھوڑے کے برابر کام کرتا ہے؟ اس کا جواب انسان کی زبان سے نکلے گا کہ نہیں کرتا۔ اور یہی کنود کا ترجمہ ہے۔

آیت (۷) و إنه علی ذالك لشهید :- اور ہر انسان اپنے متعلق خود گواہ ہے کہ وہ نہیں کر سکتا۔ اس شہادت سے مضمون کتنا زوردار ہوگیا ہے! اگر دلائل سے انسان کو قائل کیا جاتا تو یہ ناممکن تھا کہ انسان مانتا۔

آیت (۸) و إنه لحب الخیر لشدید :- اور انسان فقط یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر نہیں کرتا اور حق ادا نہیں کرتا، اس میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ اس میں کسی قسم کی کمزوری ہے بلکہ یہ روپیہ پیسہ کے لیے گھوڑے سے بھی زیادہ مشقت کرنے والا ہے (شدید لفظ کے معنیٰ دوڑنا بھی آتے ہیں، اس کی طرف اشارہ ہے) مگر انسان کبھی یہ نہیں کہتا کہ مال کی محبت کے لیے کام کر رہا ہوں۔ بلکہ یہی کہے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے یہ کام کر رہا ہوں۔ اگر انسانی فطرت کو درست کرنے کے لیے کام کیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کے کرنے میں تو انسان بہت سست ہے مگر اپنی شخصی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے (یعنے مال جمع کرنے کے لیے) بہت تیز ہے اور گھوڑوں سے بھی زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں مسکین محتاجوں کے کے لیے جمع کرتا ہوں۔ اس طرح اپنے عیب کو چھپاتا پھرتا ہے۔ غرض اس کی یہ عادت بن گئی ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتا ہے۔ وہ دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں دین کی خاطر اپنے وطن اور قوم کے لیے کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ حالت یہ ہے کہ وہ صرف دولت کے لیے کام کر رہا ہے، تو اس کی کمزوری کا اظہار ضرور ہونا چاہیے۔

آیت (۹) افلا یعلم إذا بعثر ما فی القبور :- انسان کی اس کمزوری کا نتیجہ یہ ہے کہ اسے قیامت میں لا کر کھڑا کر دیا جائے گا کہ اس نے جس قدر اپنے عیب چھپائے تھے انہیں ننگا کر دیا جائے۔ قرآن مجید میں جو قیامت کا ذکر آتا ہے اس کی یہی حکمت ہے۔

آیت (۱۰) حصل ما فی الصدور :- اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان چونکہ اقرار نہیں کرتا کہ وہ مال کی محبت میں پھنسا ہوا ہے۔ اس واسطے کہا کہ انسان کے سینے میں جس قدر مخفی ارادے تھے۔ وہ سب ظاہر کر دیے جائیں گے تو اس وقت کیا یہ بات چھپی رہے گی؟ ہرگز نہیں۔

آیت (۱۱) إن ربهم بهم یومئذ لخبیر :- جس طرح اس دن تمام دنیا جان لے گی (اس دن سے مراد قیامت ہے) اسی طرح ان کا رب آج بھی ان کو جان رہا ہے۔ عام تفسیروں میں یومئذ سے قیامت کا دن مراد لیا ہے اور یہ تفسیر غلط ہے۔ اس دن (قیامت) کو تو تمام لوگ اس کے عیب جان لیں گی تو اس میں اللہ تعالیٰ کی خصوصیت بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ اس دن سے وہ دن مراد ہے جس دن (اِس دنیا میں) انسان اپنی کمزوری چھپاتا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

حاصل مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جس طرح تمام لوگ اس کی کمزوریوں کو جان لیں گے اسی طرح اللہ تعالیٰ آج بھی ان کی کمزوریوں سے آگاہ ہے۔

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ اَحَدٰى عَشَرَةَ آيَةً

سورہ قارعہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی گیارہ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع الله کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اَلْقَارِعَةُ (۱) مَا الْقَارِعَةُ (۲) وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ (۳)

وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ کھڑکھڑا ڈالنے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (۴) وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ

جس دن ہوویں لوگ جیسے پتنگے بکھرے ہوئے اور ہوویں پہاڑ جیسے رنگی ہوئی اون

الْمَنْفُوْشِ (۵) فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (۶) فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ (۷)

دھنی ہوئی سو جس کی بھاری ہوئیں تولیں تو وہ رہے گا من مانتے گذران میں

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۸) فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۹) وَمَا اَدْرٰكَ مَا هِيَهْ (۱۰)

اور جس کی ہلکی ہوئیں تولیں تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے اور تو کیا سمجھا وہ کیا ہے

نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۱)

آگ ہے دہکتی ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورۃ القارعۃ مکیۃ

سورۃ العادیات میں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک اصول نہیں رکھتا۔ وہ جب مجبور ہوتا ہے تو بعض چیزوں کا صحیح اعتراف کر لیتا ہے اور جہاں چھپانے کی جگہ مل گئی وہاں سچ کا اعتراف نہیں کرتا۔ اس سورت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کو صحیح اصول پر مسلسل چلائے گا فقط وہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہاں قیامت کا ایک نیا پہلو ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بہت ہنگامہ خیز واقعہ ہے اور بعض انسان ایسے ہیں کہ اس ہنگامہ خیزی سے ان کے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بس یہی آدمی ہیں جو کامیاب ہوں گے۔

آیت (۱) القارعۃ :- ہنگامہ خیز واقعہ۔

آیت (۲) تا ۴) قاہرہ قوتوں کا اس نظام پر اتنا اثر پڑے گا کہ انسان ایک پتنگے کی مانند چھوٹی سی چیز دکھائی دے گا اس نظام کے مقابلہ میں۔

آیت (۵) و تکون الجبال الآیۃ :- پہاڑ روئی کے گالے دکھائی دیں گے۔ جیسے بخارات اڑ کر برف کے گالے پڑتے ہیں پہاڑ بھی بخار بننے کے بعد روئی کے گالے بن جائیں گے۔ گویا بڑا انقلاب پیدا کرنے والی قاہرہ حقیقتیں وہاں ظاہر ہوں گی۔

آیت (۶ و ۷) فاما من ثقلت موازینہ الآیات :- جس کے اعمال زیادہ اچھے ہوں گے وہی آرام کی زندگی بسر کرے گا۔ یعنی جو اپنے اصول کو نہیں بدلے گا اور اپنے سچے اصولوں پر اٹل رہے گا وہی آرام سے رہے گا۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر اچھے اعمال والے اپنی بات سے اور اپنے اصول سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ وہ اصول ہیں جو فطرت کے موافق ہیں اور حظیرۃ القدس کے ارادوں سے ان میں زیادہ وزن آ گیا ہے۔

آیت (۸ تا ۱۰) و اما من خفت موازینہ الآیات :- جس آدمی کے کام بے اصول ہیں وہ آگ میں گر پڑے گا۔ حظیرۃ القدس میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ صحیح اصول کی پابندی آخرت میں جنت کی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس انسان کی بے اصولی زندگی ہے وہ جہنم کی زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

***

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانُ آيَاتٍ

سورہ التکاثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (۱) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۲) كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳)

غفلت میں رکھا تم کو بہتایت کی حرص نے یہاں تک کہ جا دیکھیں قبریں، کوئی نہیں آگے جان لوگے

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۴) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (۵) لَتَرَوُنَّ

پھر بھی کوئی نہیں آگے جان لوگے، کوئی نہیں اگر جانو تم یقین کرکے بے شک تم کو دیکھنا

الْجَحِيْمَ (۶) ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (۷) ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (۸)

ہے دوزخ پھر دیکھنا ہے اس کو یقین کی آنکھ سے پھر پوچھیں گے تم سے اس دن آرام کی حقیقت.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ التکاثر مکیۃ

آیت (۱ و ۲) الھکم التکاثر ٥ حتی زرتم المقابر :- زیادہ طلبی نے تمہیں اصل مقصد سے غافل کر دیا۔ انسان کو یہ شوق ہے کہ وہ زیادہ کام کرے۔ تو اس شوق میں زندگی بسر کر کے وہ قبر تک پہنچ جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے۔ اِس جگہ سمجھایا گیا ہے کہ کام زیادہ مطلوب نہیں ہے مگر جو ہو وہ ٹھیک طور پر ہو، اور علمی طور پر ہو۔

آیت (۳ و ۴) کلا سوف تعلمون ثم کلا الآیات :- تم جلدی جان لو گے کہ زیادہ کام کرنا بے کار ہے یعنی حرص و ہوس کے لیے کثرتِ کار مطلوب نہیں ہے۔

آیت (۵ و ۶) کلا لو تعلمون علم الیقین ٥ لترون الجحیم :- ایسا کام کرو کہ اُس سے تمہاری علمی قوت میں جلا پیدا ہو۔ جلا پیدا ہونے کے بعد یہ نتیجہ نکلے گا کہ اِنسان اِسی دنیا میں جہنم کو اپنے آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ماہر ڈاکٹر بیماری کو ابتدا میں دیکھ کر اُس کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسے ہی کام کی خوبی سوچنے والے انسان کی نظر کام کے انجام تک فوراً پہنچ جائے گی کہ اس کام کا نتیجہ جہنم ہے۔ اگر اِس طرح سوچ سمجھ کر کام کیا جائے تو انسانیت کے لیے بہت مفید ہے۔ کثرت کار مطلوب نہیں ہے۔

آیت (۷) ثم لترونھا عین الیقین :- تمہاری علمی قوت کی یہ جِلا ہے کہ تم جہنم کو اِس دنیا میں دیکھ لو گے اور آگے چل کر آخرت اپنے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔

آیت (۸) ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم :- اِس طریقہ کا علم تمہیں قرآن مجید سکھاتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں بتاتے ہیں۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ ان کی بڑی قدر کرو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی دو بہت بڑی نعمتیں ہیں ایک تو قرآن مجید اور دوسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان دونوں کی بڑی قدر کرو۔ یہ تفسیر امام جعفر صادق علیہ السلام نے کی ہے اور یہ تفسیر خاص لوگوں کی سمجھ کے موافق ہے۔ عام لوگوں کے لیے کھانا پینا اور دوسری دنیوی نعمتیں اِس آیت کی تفسیر میں بیان کی جا سکتی ہیں۔ قرآن مجید کی تعلیم سے قیامت کا ربط اِس سورت کا خلاصہ ہے۔

سُوْرَةُ الْعَصْرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثُ آيَاتٍ

سورہ عصر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَالْعَصْرِ ۙ (١) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ (٢) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

قسم ہے عصر کی، مقرّر انسان ٹوٹے میں ہے مگر جو لوگ کہ یقین لائے اور کیے بھلے کام

١ ع ٢٨ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ؏ (٣)

اور آپس میں تاکید کرتے رہے سچے دین کی اور آپس میں تاکید کرتے رہے تحمل کی.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمo

سورۃ العصر مکیۃ

سورۃ البینہ میں مرکزی جماعت کے متعلق اساسی خاکہ بیان کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد سورت زلزال میں اخلاق کی تہ کی خوبی پر توجہ دلائی گئی تھی۔ اچھی جماعت کبھی قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اخلاق کے اندر جو بنیادیں ہیں وہ اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں.

سورت العادیات میں اخلاق کی صورت اور اعمال کی خوبی کی طرف اشارہ تھا اس کے بعد سورت القارعہ میں اعمال، کو اخلاق سے مزین کرنے کی طرف اشارہ تھا۔ سورت البینہ کے بعد چار سورتیں آئیں ان میں اس مرکزی جماعت کے اساسی کاموں کی طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے مختلف پہلو انسان کی ترقی کے لیے کیوں ضروری ہیں، ان سب کی تشریح یہاں ہو جاتی ہے.

سورت والعصر میں مرکزی جماعت کو تبدل زمانہ سے اپنے پروگرام پر نظر ثانی کرنے کی جو ضرورت ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح زمانہ آہستہ آہستہ بدلتا ہے اس کے مطابق مرکزی جماعت کو اپنی حالت درست کر لینی چاہیے۔ مگر جو اصلی بنیادی نظام ہے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے.

آیت (۱ و ۲) **والعصرo ان الانسان لفی خسر**:- والعصر کا ترجمہ ہے ہر زمانہ کا تبدل یعنی بدلنے والا زمانہ جو آہستہ آہستہ بدلتا جاتا ہے۔ اور اپنے اثرات اور نچوڑ چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ یعنی تاریخ گواہ ہے کہ انسان اجتماعی طور پر ہمیشہ نقصان میں رہا ہے۔ صرف وہی جماعت کامیاب رہی جس کا ذکر آیت ۳ میں ہے.

آیت (۳) **الا الذین آمنوا**:- جس نے اپنی ترقی کے لیے صحیح نظریات قائم کر لیے یعنی اساسی نظریات صحیح اور تجربہ شدہ ہوں.

وعملوا الصالحات:- اور زمانہ کے مطابق اپنے نظریات کو عملی شکل پہنانے لگے.

وتواصوا بالحق:- اور جماعت بنائی جو اساسی نظریات پر مشترک ہے اور سب ایک دوسرے کو اس پر پختہ رہنے کی وصیت کرتے ہیں۔ وہ ایسی جماعت ہے جو سمجھتی ہے کہ میں تو پورا کام کر لوں لیکن جب تک میرا ساتھی پورا کام نہیں کرے گا میرا کام نکما اور ادھورا رہ جائے گا۔ اس لیے وہ انتہائی کوشش سے اپنے ساتھیوں کو توجہ دلاتا ہے کہ اپنا فرض پورا کرو۔ یہ بات چونکہ ہر فرد میں پائی جاتی ہے اس واسطے جماعت کا ہر ایک فرد مساوات کی روح کا مجسم ہے۔ ایسے لوگوں کا نظام ہمیشہ قائم کرنے کے لیے چیرمین (Chairman) ہوتا ہے۔ پریزیڈنٹ نہیں ہوتا، اس لیے کہ چیرمین اساسی نظریات کی صحت پر یکساں یقین رکھتا ہے.

جب جماعت میں مختلف طبقات پیدا ہو جائیں، یعنی کچھ تو اعلیٰ درجہ کے

لوگ ہوں اور کچھ دوسرے درجہ کے. تو ایسی حالت میں نظام قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ اعلیٰ جماعت میں سے ایک آدمی کو پریزیڈنٹ نہ بنا دیا جائے۔

و تواصوا بالصبر:- اور وہ سب لوگ ایک دوسرے کے لیے انتہائی توجہ سے کوشش کرتے ہیں کہ اس راستہ میں جس قدر مشکلات پیش آ رہی ہیں اُن کو ہمت سے برداشت کرنا چاہیے۔ یعنی کسی مشکل کی وجہ سے ان کی پیش قدمی نہیں رکتی.

ہر زمانہ کی تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی منظّم جماعتوں کے سوا کبھی کوئی آدمی انفرادی طور پر کامیاب نہیں ہوا اور یہ مسئلہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر انسان آسانی سے یقین کر سکتا ہے کیوں کہ تاریخ اپنے واقعات محفوظ رکھتی ہے اور اُن کو دہراتی رہتی ہے.

سورة الهمزة مكية وهى تسع آيات

سورہٴ ہمزہ مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی نو آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ (١) الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَهٗ (٢) يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗ

خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی جس نے سمیٹا مال اور گن گن کر رکھا خیال رکھتا ہے کہ اُسکا مال

اَخْلَدَهٗ (٣) كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِى الْحُطَمَةِ (٤) وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ (٥)

سدا کو رہے گا اُس کے ساتھ، کوئی نہیں وہ پھینکا جائے گا اُس روندنے والی میں اور تو کیا سمجھا کون ہے وہ

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ (٦) الَّتِىْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (٧) اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (٨)

روندنے والی، ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی وہ جھانک لیتی ہے دل کو اُن کو اُس میں موند دیا ہے

١
ع
٢٩
فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (٩)

لمبے لمبے ستونوں میں.

بسم اللہ الرحمان الرحیم O

سورۃ الھمزۃ مکیۃ

جماعتوں کی ایک خرابی ہے سرمایہ داری۔ جہاں ایسا گروپ پیدا ہو جائے جو سرمایہ ہی کو سب کچھ سمجھے تو جماعت برباد ہو جاتی ہے۔ اِس سورت میں فقط سرمایہ داری کے عیوب دکھلائے گئے ہیں کہ اس سے انسان کے اخلاق کس طرح برباد ہو جاتے ہیں اور دنیا اور آخرت میں ایسے شخص سے زیادہ تباہ حال کوئی انسان نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مصلح ان کے پاس جاتا ہے تو اس کے وہ عیب نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم کس طرح لوگوں کی اصلاح کر سکتے ہو، تم نادار ہو۔ تم میں تو یہ عیب ہے اور پسِ پشت بھی ایسے لوگوں کی عیب جوئی کرتا ہے۔ وہ محض اپنے سرمایہ کی حفاظت کے لیے نکتہ چینی کرتا ہے۔

آیت (۱) **ویل لکل ھمزۃ لمزۃ**:- وہ آدمی جس نے اپنی فطرت ہی یہ بنالی ہے کہ وہ ہر آدمی پر طعن اور نکتہ چینی کرتا ہے اُس کے سامنے اگر کوئی بہترین آدمی بھی آتا ہے تو اُس میں بھی وہ نقص نکالتا ہے۔ اُس پر افسوس ہے اور یہ اخلاقی موت ہے۔ غرض یہ شخص ہر چیز میں برائی ہی برائی دیکھتا ہے۔ اس کے بعد اس کی زندگی حیوانوں کی طرح ہو جاتی ہے۔ انسان کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی خوبی کے متعلق اپنا نظریہ ٹھیک بنائے اور اس کے بعد جس قدر خوبی ممکن ہو سکے اپنے اندر پیدا کر دکھائے۔ مگر اس آدمی کی تو یہ حالت ہے کہ اس کے دماغ میں کسی خوبی کا نظریہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ ہر چیز میں برائی دیکھتا ہے۔ اب اس کا سبب بتایا جاتا ہے کہ اس میں یہ خرابی کیوں پیدا ہوئی۔ وہ سبب یہ ہے کہ:-

آیت (۲) **الذی جمع مالاً و عددہ**:- وہ مال جمع کرتا ہے اور پھر اُسے گن گن کر رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کی اخلاقی خوبی کم ہو گئی ہے۔

آیت (۳) **یحسب ان مالہ اخلدہ**:- پیسہ گن گن کر رکھنے کے بعد اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ رہے گا۔ یعنی اس کی ہر ایک ضرورت مال ہی سے پوری ہوتی رہے گی۔ یہ طبعی بات ہے کہ بعض کام تو واقعی مال ہی سے پورے ہوتے ہیں۔ مگر انسان کی بعض ضرورتیں ایسی بھی ہیں جن کے لیے علم و

اخلاق چاهیے ۔ ورنہ اُس آدمی پر لوگ اعتبار نہیں کرتے ۔ اور یہ بات کہ هر ضرورت مال سے هی پوری هوتی هے اخلاقی حصہ کی لغویت کو ظاهر کر دیتی هے ۔ بات دراصل یہ هے کہ جس شخص کے پاس اُصول هی نہ رهے تو اب اُس کا کام یہی هے کہ لوگوں پر طعن و تشنیع کرتا پھرے ۔

یہ سرمایہ داروں کی عادت هے کہ جب اپنی مجلس میں بیٹھتے هیں تو ایک مصلح، ریفارمر اور لیڈر کی تشنیع شروع کر دیتے هیں کہ یہ اصلاح کرتا پھرتا هے، روپیہ پیسہ تو اس کے پاس نہیں هے ۔ مال کے سوا کیسے تدبیریں چلتی هیں ۔ دوسرا کہتا هے کہ اس نے اپنے پیٹ کے لیے ایک جال بنا رکھا هے ۔ تیسرا سرمایہ دار کہتا هے کہ اس میں فلاں فلاں عیب موجود هیں اور یہ اپنی اصلاح تو کرتا نہیں ۔ کوئی کہتا هے کہ اس کی شکل بھی بُری هے ۔ اگر اس میں کوئی جوهر هوتا تو اس کی شکل منحوس نہ هوتی اور یہ کہ اس کے خویش و اقارب میں بھی بری عادتیں هیں ۔ اسی طرح سے عیب گنتے رهیں گے اور آخر میں کہیں گے کہ یہ ٹھیک هے کہ بس پیسہ کماؤ اور کھاؤ ۔ تو اُن کے هاں یہ خیال هے کہ جائز اور ناجائز طریقہ سے مساکین کو لوٹو اور کھاؤ ۔ ان کی مثال یوں هے کہ گویا بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی هے ۔ ان سرمایہ داروں میں نہ رحم هے، نہ اخلاق ۔ گویا اس طعن و تشنیع کا سبب صرف سرمایہ داری هے ۔

اس قسم کے آدمی کی سوسائٹی میں جو بری حالت هوتی هے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں هے ۔ آخرت میں اس کو جو تکلیف پیش آئے گی اس کی توضیح سورۃ کے آخر میں کر دی جائے گی ۔

آیت (۴ تا ۶) کلا لینبذن فی الحطمة وما ادراك ما الحطمة نار الله الموقدة :- وہ آگ میں ڈالا جائے گا جو اُس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی ۔

آیت (۷) التی تطلع علی الافئدة :- اب بتلایا جاتا هے کہ وہ آگ کیا هے ؟ وہ آگ ایسی هے جو دلوں سے طلوع کرتی هے ۔ تمام متمدن قوموں میں عموماً دل کو مرکزِ اخلاق سمجھا جاتا هے تو جب دل یعنی مرکزِ اخلاق میں خرابی پیدا هوگئی تو اس کے باعث دل میں آگ پیدا هوگئی ۔ انسانی بدن کے اگر کسی حصہ کو تکلیف پہنچے تو تمام بدن میں آگ (جلن) سی محسوس هوتی هے ۔ اور یہ ایک چھوٹا سا مظاهرہ هے ۔ مگر جب مرکز اخلاق یعنی دل میں خرابی پیدا هو جائے تو اس سے جو بے چینی پیدا هوگی اس کا یہاں (اس دنیا میں) صحیح تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ مثال کے طور پر ایک آدمی کسی پر عاشق هو جائے اور اس عشق میں اس کی محبت بڑھتی چلی جاتی هے اور اُسے معشوق نہیں ملتا تو اسے آگ کی سوزش جیسی تکلیف محسوس هونے لگتی هے ۔ بس اس قسم کی محبت سرمایہ دار نے روپیہ پیسہ (مال) سے

پیدا کر لی ہے۔ اور جب اس آدمی کو آگ میں ڈالا جائے گا تو اگر اس کے اخلاق اچھے ہیں تو وہ آگ اسے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ بہرحال قرآن مجید میں دوزخ کی یہ توضیح ہو جاتی ہے کہ انسان کی بد اخلاقیوں سے وہ آگ پیدا ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ انسان کو جو بخار آتا ہے وہ دوزخ کا نمونہ ہے۔ گویا بخار اندر سے طبیعت کی خرابی سے پیدا ہوتا ہے اور باہر سے نہیں آتا۔

آیت (۸ و ۹) انہا علیہم موصدۃ فی عمد ممددۃ :- وہاں ایک آگ باہر سے بھی آتی ہے اب اس کا ذکر ہے۔

گرم ممالک میں دوپہر کے وقت سخت گرمی ہوتی ہے اور یہ قدرتی چیز ہے۔ اب اگر ایک بخار والے آدمی کو ایسی زمین سے گذرنا پڑے جہاں شدت سے دوپہر کی گرمی ہے تو اس آدمی کو خواہ مخواہ تکلیف زیادہ ہو جائے گی۔ مگر یہ جو اسے تکلیف ہو رہی ہے اس کا سبب اس کی اندرونی خرابی ہے۔ اگر یہ تندرست ہوتا تو اس کو گرمی کی وجہ سے معمولی سی تکلیف ہوتی اور یہ گذر جاتی مگر چونکہ اس کے اندر خرابی ہے اس واسطے وہ سخت تکلیف اٹھا رہا ہے۔ اسی طرح جہنم ہے۔ وہاں اگر کوئی با اخلاق آدمی گذر جائے تو اسے جہنم کی آگ محسوس بھی نہ ہوگی۔ اگر ایسا آدمی وہاں سے گذرے جس کے اندر اخلاقی خرابی ہو تو اس کے لیے اس کی طبیعت میں بہت تکلیف کا اضافہ ہو جائے گا۔

اس سورت میں جماعت میں سرمایہ داری کو روکنے کے لیے اخلاقی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اور اخلاق کا اچھا رکھنا انسان کا فطری تقاضا ہے۔

سُورَةُ الفِيلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ خَمسُ آيَاتٍ

سورہ فیل مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی آٹھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيلِ (۱) اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِى

کیا تونے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ، کیا نہیں کر دیا اُن کا داؤ

تَضْلِيلٍ (۲) وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيلَ (۳) تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ

غلط اور بھیجے اُن پر اُڑتے جانور ٹکڑیاں ٹکڑیاں پھینکتے تھے اُن پر پتھریاں

سِجِّيلٍ (۴) فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ (۵)

کنکر کی پھر کر ڈالا اُن کو جیسے بھُس کھایا ہوا.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الفیل مکیۃ

عربوں میں قریش در اصل ایک حکمران جماعت تھی۔ عرب سردار اُن کے فیصلے کو شہنشاہ کا فیصلہ تسلیم کرتے تھے۔ لیکن قریش عرب کے اندرونی جھگڑے سے تنگ آ کر ایک جماعت چاہتی تھی کہ عرب کو شام سے ملحق کر دیا جائے اور اپنی تجارت محفوظ کر دی جائے تاکہ اُن سے روما کی حکومت محصول نہ لے سکے۔ دوسری جماعت چاہتی تھی کہ عرب کو ایران سے ملحق کر دیا جائے لیکن ایک تیسری جماعت اپنی خود مختاری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ انہی میں ابوبکر صدیق رض، عشرہ مبشرہ اور عتبہ وغیرہ تھے۔ جب قرآن شریف نازل ہونے لگا اور اُن کو اتحاد کی دعوت دینے لگا تو آزادی پسند کہنے لگے کہ مبادا یہ کسی دوسری سلطنت کا حامی اور وکیل ہے اور ملک کو دوسرے کے سپرد کر دینے والا ہے۔ یلحدون الیہ اعجمی وھذہ عربی مبین اور اس قسم کی دوسری آیات کا یہی محمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کچھ عربوں نے ایرانی حکومت سے ساز باز شروع کیا تھا اور بہت سے عرب قبائلی ان سے مل گئے تھے۔ مگر حجاز اپنی حالت پر مستقیم رہا۔ اس لیے روما کی حکومت کو خوف ہوا کہ مبادا قریش ایران سے ساز باز رکھیں۔ اس لیے اُن کے استیصال کی تجویزیں کر رہے تھے کہ گرجا کا حادثہ پیش آیا مگر معاملہ برعکس ہوا۔ اس سے قریش کی تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ شام اور عراق کے سردار اُن کی بڑی عزت کرنے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت با سعادت سے پچاس روز قبل واقعۂ فیل ہوا:۔ ع "پس از گذشتن پنجاہ روز عام الفیل" *

جماعت میں پہلی خرابی سرمایہ داری کی تھی (سورۃ الھمزہ) اور دوسری خرابی یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر اعتماد کر کے ضعیفوں کو دبائے۔ اس سے امپیریلزم پیدا ہوتی ہے۔ اِس سورت میں امپیریلزم کی تباہی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ حجاز کے کسی آدمی نے شاہی گرجا (یمن) میں نجاست پھینک دی۔ اس کا صحیح علاج یہ تھا کہ وہ آدمی (ملزم) اہل حجاز سے طلب کر لیا جاتا۔

---

* قصیدۂ عظمیٰ۔ مصنفہ امین الدین شاگرد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔

اور اس کے واسطے جتنی سزا ہوتی وہ دی جاتی۔ اور اگر اس کے ساتھ اس سازش میں کوئی جماعت شریک تھی تو اس کو بھی پوری سزا دی جاتی۔ اہل حجاز اگر ایسے آدمی یا جماعت کو جرم کے باوجود حکومت یمن کے حوالے نہ کرتے تو تمام حجاز پر چڑھائی ہو سکتی تھی۔ مگر یمن کی حکومت نے انصاف اور تحقیق کا کوئی درجہ ملحوظ نہیں رکھا۔ اس نے اپنی طاقت کے گھمنڈ پر حجاز کے معبد (بیت اللہ) کو گرانے کے لیے چڑھائی کر دی۔ وہ بہت ساز و سامان وغیرہ اپنے ساتھ لائے جس میں ہاتھی بھی تھے۔ ہاتھی عرب میں نہیں ہوتے اس لیے عربوں کو ڈرانے کے لیے ہاتھی لائے تھے۔

یہ واقعہ اس سال کا ہے جس سال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ تو یہ ایک قومی تاریخی واقعہ نزدیک کا ہے۔ اس کی وہی مثال ہے جیسے کہ ہندستان میں ۱۸۵۷ع کی جنگ جس کو ہندستانیوں کے بزرگ جانتے ہیں۔ میرے استاد دہلی کے جان گداز واقعہ کے کئی برس بعد پیدا ہوئے مگر ان کا علم ایسا تھا کہ گویا وہ یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے کہ اس واقعہ سے تمام قوم پر مصیبت چھاگئی تھی۔ اس طرح عرب کا یہ واقعہ نزدیک کا تھا۔ اب جو لوگ اس واقعہ سے انکار کریں ان کی عقل پر ہنسی آتی ہے۔

آیت (۱) **الم تر کیف فعل ربک باصحاب الفیل**:- ایک زور آور طاقت جو غریبوں کو کچلنے کے لیے آئی تھی، اسے کس طرح کچل دیا گیا؟

آیت (۲) **الم یجعل کیدھم* فی تضلیل**:- کیا ان کی تدبیروں کو ہم نے غلط

---

* روما کی حکومت جو یورپ کی حکومت تھی چاہتی تھی کہ حجاز پر ہماری سلطنت ہو جائے تو ہندوستان کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ ہندوستان دراصل ایرانی سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور وہ نہ چاہتا تھا کہ یورپ کو راستہ دیا جائے۔ یورپ نے مذہبی تبلیغ سے حبشہ کو تابع کر لیا اور عرب قبائل میں بھی زور شور سے تبلیغ شروع کردی تاکہ اس طریقہ سے حجاز اسے مل جائے۔ یورپ کے اشارہ پر حبشہ نے کچھ حصہ یمن کا لے لیا اور کچھ حصہ ایرانیوں کے ہاتھ چلا گیا۔ اس صورت میں فتح اس کی ہو سکتی تھی جس کی طرف حجاز ہو جائے۔ حجاز میں ایک طبقہ تھا جو رومی سلطنت کو پسند کرتا تھا مگر ان کو خوف تھا کہ ہماری تجارت پر محصول لگایا جائے گا۔ اور آزاد منش قریش اپنی حکومت کے دلدادہ تھے۔ جب کوئی ان پر حملہ کرتا تو کہتے تھے کہ میراث خلیل یعنی کعبہ پر دھاوا پڑ رہا ہے۔ پھر تو سارا عرب جمع ہو جاتا تھا۔ اس لیے زبردستی گھسنا حجاز میں تقریباً محال تھا۔ اس کے لیے یورپ والے کوئی تدبیر سوچ رہے تھے کہ گرجا میں گندگی کا واقعہ ہوا تو یورپ کی امداد سے حبشہ نے حجاز پر چڑھائی کی۔ مطلب یہ تھا

(باقی فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۳ پر دیکھو)

راستہ پر نہیں ڈالا؟ اگر یہ حقیقی مجرموں کو سزا دینے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہو جاتے بلکہ خود حجاز کے با اختیار لوگ مجرموں کو ریگستانوں اور گوشوں سے تلاش کر کے نکال لیتے مگر اہل یمن کو تو انصاف اور حق کا خیال تک نہ تھا۔ ایک مقدس با برکت عمارت جس کے ساتھ تاریخی عظمت کی سیکڑوں روایات وابستہ تھیں، اُس کو گرانا اور اُس کی بے عزتی اور توہین کرنا اُن کے پیش نظر تھا اور بس۔ یہ ہے اُن کی تدبیر کو غلط راستے پر ڈالنا۔ یعنی وہ مقدس چیز سے ٹکرانے لگے اور سیدھا راستہ جو مجرموں کو سزا دینے کا تھا وہ بھول گئے۔ اب مقدس گھر کے مالک سے اُن کی ٹکر ہو گئی۔ اگر وہ انصاف کی طرف توجہ کرتے اور اُن آدمیوں کو طلب کرتے جنھوں نے جرم کیا تھا تو تمام مجرم اہل یمن کو دے جاتے مگر اُنھوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔ اور خفیہ تدبیر (کید) یہ تھی کہ قریش لڑیں گے تو اُن کا استیصال کیا جائے گا۔ اِس طرح عرب میں حکومت روما قائم ہو جائے گی۔

آیت (۳) و ارسل علیھم طیراً ابابیل :- اتفاق ایسا ہے کہ ھندوستان میں ابابیل ایک چھوٹے سے پرندے کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں ابابیل پرندوں کے جھنڈ کو کہتے ہیں۔ وہ پرندے تھے جھنڈ کے جھنڈ جو اس موقع پر آ گئے تھے۔

آیت (۴) ترمیھم بحجارۃ من سجیل :- اُنھوں نے چھوٹے چھوٹے روڑے (پتھر) اہل یمن کو مارے۔ ان پرندوں نے اہل مکہ کی رھنمائی کی کہ اہل یمن کے ساتھ اس طرح لڑو یعنی اس طرح پتھر مارو۔ اہل مکہ نے جس قدر ممکن ہو سکا پہاڑوں پر چڑھ کر پتھر پھینکے۔ اہل یمن کے لیے دُھری مصیبت تھی کہ ایک تو پرندے روڑے مار رہے تھے، دوم اہل مکہ بھاری پتھر مار رہے تھے۔

آیت (۵) فجعلھم کعصف ماکول :- وہ پتھروں کی مار سے ایسے ہو گئے کہ سیدھے طور پر اُٹھ بھی نہیں سکتے تھے یعنی روندے گئے۔ پرندوں کے پتھر پھینکنے سے وہ مدھوش ہو گئے۔ ادھر جماعت قریش نے اُن کو پتھر مارے تو ایسے ہو گئے جیسے تباہ شدہ گھاس۔ ھزیمت یافتہ لشکر کو اہل عرب ایسی ہی مثال سے یاد کرتے ہیں

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷۲ سے آگے)

کہ قریش اپنے بیت اللہ کو گرانے نہ دیں گے اور لڑیں گے تو مارے جائیں گے یعنی بیت اللہ کا گرانا مقصود بالذات نہ تھا بلکہ قریش کی بیخ کنی مقصود تھی۔ یہ تھی خفیہ تدبیر جس کو کید کہا گیا ہے۔ اللہ کی تدبیر یوں ہوتی ہے کہ بیت اللہ کی عزت بھی برقرار رہی۔ اور قریش کی عظمت بھی قائم۔ ثقیف قبیلہ کو حبش نے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا اس لیے اب فقط قریش رہ گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے امداد دی۔

کہ گویا کوئی جانور گھاس کھا کر اِدھر اُدھر پھینک دے۔ اِسی طرح یہ لشکر ہوا۔ کوئی کہیں مرا کوئی کہیں۔

فطرت الٰہی میں ایسے بے نظیر واقعات بہت ملتے ہیں کہ جب ایک کمزور پر ظلم ہوتا ہو تو ایک حیوان اُس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ ہم اس نظام کا تعین نہیں کر سکتے کہ وہ حیوان کس طرح مدد کے لیے آ پہنچتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں میں ایسے بے انتہا واقعات ملتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک عفت دار عورت جنگل میں تن تنہا جا رہی ہے اور کوئی آدمی اُس کی عصمت دری کرنا چاہتا ہے تو سانپ اُس کے پاؤں میں آ کر لپٹتا ہے اور اُس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ کوئی طبعیات کا عالم ان واقعات کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور الٰہیات میں تو یہ مسلمہ بات ہے کہ ملاء سافل مدد کے لیے نمونہ بن کر آتے ہیں۔ بعض اوقات ملاء اعلیٰ سے برقی رو کی طرح مدد آجاتی ہے۔ ہم طبعیات کے علماء کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ واقعہ یوں ہوا، اب توجیہ تم کرو۔ مثلاً ایک سانپ بچے کو کاٹنے کے لیے آتا ہے اُس پر کتّا حملہ کر کے اُس کو کاٹ کھاتا ہے۔ اب اِس جگہ اِس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اُسے طبعیات کے ذریعے حل کیا جائے کہ یہ کیسے ہوا؟ اور نہ اِس جگہ کوئی عجوبہ چیز بتلانی مقصود ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ ظلم کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا اور مظلوم کے بچانے کے لیے قدرت کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتی ہے۔

الٰہیات میں تو اس کی حکمت ملتی ہے کہ فرشتے جو کام کر رہے ہیں وہ اس کی تدبیر الہام کے ذریعے انسان کے دل میں ڈال دیتے ہیں اور اس کے بعد انسان خود تدبیر کر لیتا ہے۔ اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔

ہمارے مفسرین نے قسم کھا رکھی ہے کہ جہاں کہیں قدرت الٰہی کا کوئی کرشمہ نظر آئے وہ اسے طبعی قوتوں سے بالکل خالی کر کے محض روحانی اثرات کا نتیجہ بتلائیں گے اور یہ غلط فلسفہ ہے۔ روحانی قوتیں جب اِس عالم جسمانی میں اپنا کام کرنا چاہتی ہیں تو جسمانی قوتوں کو کام میں لاتی ہیں۔ اس کی مثال خود انسان کا وجود ہے۔ مثلاً انسانی دماغ میں ایک خطرہ پیدا ہوتا ہے یہ روحانی چیز ہے۔ انسانی بدن اس کی تکمیل کے لیے پوری توجہ سے کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی روحانی طاقت اس زمین میں اپنا اثر کرنا چاہتی ہے تو وہاں کے قرب و جوار میں جو طبعی قوت جلدی کام کرنے والی ہوگی روحانی قوت اس پر اپنا اثر ڈالنا چاہے گی۔

مکہ کے لوگ جو ضعیف اور مجبور تھے اُن کی عقل میں بھی نہیں آتا تھا کہ اس قسم کے جابر بادشاہ سے کس طرح مقابلہ کریں گے۔ اُن کے سردار نے حکم دیا کہ تم

اِس جابر بادشاہ سے مقابلہ نہ کرو بلکہ پہاڑوں پر چڑھ جاؤ۔ وہ اس سے زیادہ اپنا بچاؤ نہیں سوچ سکتے تھے۔ اب اُن کی رہنمائی کے لیے چند پرندے ظاہر ہوئے۔ ہم نے جو فرض کر لیا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے پرندے تھے اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُن کے منہ میں تھیں یہ غلط ہے۔ وہ بڑے بڑے پرندے (مثل گدھ) تھے اور اُنہوں نے دور سے پتھر پھینکنے شروع کیے۔ جب یہ پتھر اہلِ یمن پر پڑے اور برسات کی طرح اُن پر برسنے لگے تو اُن کی صفوں میں ابتری پیدا ہو گئی۔ اور وہ پریشان ہوگئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ عرب میں بیت اللہ کی تقدیس اس فطرت کے درجہ پر پہنچی ہوئی تھی، تو اُن کو خوف ہونے لگا کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ اس خوف سے ان کے دلوں میں دہشت سما گئی۔ اہل یمن بھی اس بیت اللہ کو ابتدا سے مقدس جانتے تھے۔ یہ تحریک یعنی اس کی بے عزتی کی تحریک حبش کے نصرانیوں کی تھی۔ اس تحریک میں تو یمن والے مجبوراً داخل ہوئے تھے لیکن پھر وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور یمن کے لوگ جب بھاگے تو تمام لشکر میں اُدھم مچ گیا۔ اب حبش کے لوگوں میں بھی پریشانی پھیل گئی۔ کیوں کہ حبش کے لوگ نصرانیت سے پہلے بیت اللہ کا حج کرتے تھے۔

اہل یمن کی فوج میں فیل تھے۔ اُنہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ہاتھیوں پر اوپر سے پتھر برس رہے تھے اور عرب کی گرمی نے اُن کا دماغ پریشان کر دیا تھا۔ اہل مکہ نے جب پہاڑوں پر سے دیکھا کہ ان پتھروں سے دشمن کی فوج میں اب ابتری پھیل گئی ہے تو اُنہیں ہمت اور جرأت پیدا ہوگئی۔ اُنہوں نے پہاڑوں سے پتھر پھینکنے شروع کردیے اور اہل یمن کو بھس بنا کر رکھ دیا۔

سرسید نے اس کی تاویل کی ہے کہ یہ چیچک * کے جراثیم تھے۔ سرسید ایک حکیم عالم تھے اور وہ اس لطیفہ بازی سے اپنے نوجوانوں کو قرآن کی طرف متوجہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی غرض صرف اس قدر تھی اور بس۔ اب عربوں نے سرسید کی ایسی بات کو عربی میں ترجمہ کر دیا اور یورپ میں پیش کر کے پھولے نہیں سمائے۔ سرسید کی علمی و عملی تحریک میں سمجھدار آدمی کے لیے چند نقص نمایاں معلوم ہوتے تھے۔ اس کے متعلق جب کبھی سرسید سے سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کا جواب دینے سے گریز کیا۔ ان کا ایک مہمل سا لطیفہ ہے کہ جب تالاب بھر جائے گا تو پانی باہر نکلنے کے لیے اپنا راستہ خود تلاش کر لے گا.

سرسید اپنے نوجوانوں کو یورپین سائنس سے تعارف کرانا چاہتے تھے۔ اُن کو اعتماد تھا کہ جو غلطیاں رہ جائیں گی اُن کو ہمارے نوجوان خود درست کر لیں گے۔ ہم اس بڑے آدمی (سرسید) کی نیک نیتی کا ثمرہ اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں.

---

* محمد علی قادیانی نے بھی قرآن شریف کے انگریزی ترجمے میں ابابیل کا یہی ترجمہ کیا ہے۔ مرتب.

سرسید نے موسیٰ علیہ السلام کے سمندر سے گزرنے کے واقعہ کی تفسیر جوار بھاٹا اور مد و جزر کے ذریعہ کر دی ۔ یہ ایک مہمل سی تفسیر ہے ۔ مگر کالج اور اسکول کے پڑھنے والے طلبہ کے لیے (جن کو دینیات کا زیادہ علم نہیں ہے) یہ ایک عجیب اور نادر تفسیر ہے ۔ ایک عالم نے کالج کے انڈر گریجویٹ (عبدالقادر خان جو آج کل کراچی میں امیرالحجاج ہے) سے سرسید کی نسبت کہا کہ جو آدمی سرسید کی کتابیں پڑھتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا ۔ اُس نوجوان نے جواب دیا کہ یہ صحیح ہے کہ وہ مسلمان نہیں رہتا مگر وہ عیسائی بھی نہیں ہوتا ۔

سرسید کی تفسیر کو پڑھ کر کالج کے مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم نکلے جو علی گڑھ کے بی ۔ اے ہیں ۔ اُنہوں نے قرآن کی تفسیر عربی میں لکھی اور اس واقعہ کی تفسیر نیچرل قواعد کے ذریعہ کی ہے کہ دنیا عش عش کرنے لگی ۔ موسیٰ علیہ السلام کا سمندر سے گزرنا دنیا کی تین بڑی قومیں مانتی ہیں ۔ یہود ، نصاریٰ اور مسلمانوں کے ہاں یہ واقعہ مسلّمہ ہے ۔ سائنس کے اعتراضات تمام دنیا کو پریشان کر رہے ہیں ۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سائنٹفک طریقہ سے مولوی حمیدالدین سے بڑھ کر نوجوانوں کو کوئی نہیں سمجھ سکا ۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو پریشان نہیں ہونا چاہیے اِس لیے کہ اُن کی تاریخ بڑی شاندار ہے ۔ اُنہیں ہر فن کے عالم اول درجہ کے اُن کی اپنی قوم میں ملیں گے ۔ وہ محققانہ طور پر آگے بڑھ سکتے ہیں اور ہر مدد کے لیے اپنے گھر ہندوستان ہی سے ہر ایک چیز حاصل کر سکتے ہیں ۔

اِس سورت کی یہی روح تھی کہ اگر کوئی امپیریلزم (شاہنشاہیت) کسی کمزور کو دبانے پر مستعد ہو جائے تو قدرت ایسے سامان پیدا کردے گی جو اس طاقت کو برباد کر دیں گے ۔ اس واسطے مسلمانوں کو شہنشاہت سے پاک رہنا چاہیے یعنی کمزوروں کو نہ دبائیں ۔

اس سورت میں اشارۃً قرآن مجید کی تعلیم کا مرکز بیت اللہ ظاہر کر دیا گیا ہے ۔ اب اگلی سورت میں اس کی تصریح کر دی جائے گی ۔

عبدالمطلب کے نہ لڑنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تاجر لوگ اگر فتح کرتے تو یمن کی تجارت بند ہو جاتی ۔ اگر مغلوب ہوتے تو نادان حبشی اُن کی بیخ و بنیاد اُکھاڑ کر رکھ دیتے اور مکہ مکرمہ کو ایسا ویران کر دیتے کہ اس میں کوئی آ کر نہ بستا اور پروپیگنڈا کرتے رہتے کہ ہم نے بتوں کا مندر رضائے اللہ کے لیے توڑا اور یہ حجاز لینے کی سیاسی چال تھی ۔

سُوْرَۃُ القریش مَکِّیَّۃٌ وَّ ھِیَ اَرْبَعُ آیٰتٍ

سورہ قریش مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان ، نہایت رحم والا ہے

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱) اٖلٰفِھِمْ رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ (۲) فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ

اس واسطے کہ مانوس رکھا قریش کو مانوس رکھنا اُن کو سفر سے جاڑے کے اور گرمی کے تو چاہیے کہ بندگی

١ ع ٢١ ھٰذَا الْبَیْتِ (۳) الَّذِیْٓ اَطْعَمَھُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۵ وَّ اٰمَنَھُمْ مِّنْ خَوْفٍ (۴)

کریں اس گھر کے رب کی جس نے ان کو کھانا دیا بھوک میں اور امن دیا ڈر میں .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○

سورۃ القریش مکیۃ

اصحاب الفیل کے واقعہ کے بعد حجاز، یمن اور شام میں قریش کی بڑی عزت ہو گئی کہ یہ جماعت خدام بیت اللہ ہے جس کی حفاظت خود خدا کرنے والا ہے۔ اُمراء طبقہ کو ایسے کرشموں سے جو قوموں پر نازل ہوتے ہیں بہت تعجب اور خوف ہوتا ہے اور غرباء تو غلام بن جاتے ہیں تو اس واقعہ نے قریش میں دو باتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو ان کو تجارت میں سہولت ہو گئی۔ شام اور یمن کے بادشاہ جو نصرانی تھے اس واقعہ کے بعد انہوں نے اِن کی تجارت سے ٹیکس وصول کرنا چھوڑ دیا۔ پھر ان کے دل میں بھی سلطنت کے لیے وسوسے پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ ہم میں تو اتنی طاقت ہے کہ ہم دوسروں کو زیر کر سکتے ہیں اور پھر کوئی طاقت ہم پر حملہ نہیں کر سکتی۔ اس واقعۂ فیل سے یہ بات اُن کے دل میں پیدا کرانی مطلوب تھی۔

یمن کی فوج سے قریش نہ لڑے اس کے دو سبب تھے۔ ایک تو ان کو خیال تھا کہ اگر لڑائی شروع ہوگئی تو شام کے نصرانی بھی اُن کے مددگار ہو جائیں گے اور اگر بالفرض ہم کامیاب ہو بھی گئے تو بھی ہماری تجارت کے دونوں راستے بند ہو جائیں گے۔ تجارت پیشہ لوگوں کو اس کا بڑا خوف تھا۔ دوم یہ کہ بیت اللہ کی عمارت بہت پرانی ہو گئی تھی اور سقف میں شگاف ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے خیال میں یہ بات گوارا کر لی کہ ہم ضعیف تجارت پیشہ لوگ ہیں، بادشاہوں سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر یمن کی فوج نے ظلماً بیت اللہ کو گرا دیا تو پھر ہم اُس کو از سرِ نو احسن طریقے پر بنا لیں گے۔ یہ اُن کی آخری بُزدلی تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زمین تیار کرنا بھی اِسی واقعہ سے ہوا۔ اس واقعہ کے بعد اُن میں بھی ملک گیری کے خیال آنے لگے اور اُنہوں نے معلوم کر لیا کہ خدا تو ہمارے ساتھ ہے تو بادشاہوں کا کیا ڈر۔ یہ وہ تدبیر الٰہی تھی جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آسانی مہیا ہو سکے اور و نیسرك لليسرىٰ کا پورا پورا مضمون ظاہر ہو جائے۔

اسی زمین پر یعنی حجاز میں جو قرآن مجید کا مرکز ہے بیت اللہ ہے۔ اور اس

قرآن پر عمل کرنے والی پہلی جماعت جو نمونہ کا کام دے گی وہ قریش ہے۔ آنہی کے طریقہ پر آن کے ساتھ انصار (دوسری قوموں کے لوگ) مل گئے اور اس طرح اسلام کی ایک مرکزی جماعت پیدا ہو گئی۔ اس پر پہلی سورتوں میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ قریش میں ایک خاص قسم کا نیشنلزم تھا۔ جب تک اُس کی اصلاح نہ کر دی جائے وہ برے نتیجے پیدا کرتا ہے۔ اِس سورت میں گویا نیشنلزم تحریکوں کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے کہ اسے کس طرح درست کیا جائے۔ اس سورت کا لفظی و معنوی تعلق ظاہر ہے کہ بعض مفسرین نے لام جارہ کو ماکول سے متعلق کیا ہے۔

آیت (۱ و ۲) **لایلاف قریش O ایلافھم رحلۃالشتاء و الصیف**:- قریش کا طبعی شوق تھا کہ وہ گرمی اور سردی میں تجارت کے لیے سفر کرتے تھے۔ گرمی میں شام کی طرف اور سردی میں یمن کی طرف۔ ہندوستان کی جو تجارت یورپ کے ساتھ تھی، اہل یمن اس کا واسطہ تھے۔ عربوں کی تاریخ میں یمنی قوموں کی ترقی کا کافی ذکر ہے اور اس کی بنیاد یہی تجارت تھی۔ اِسی طرح مدینہ سے شمال میں وادی القریٰ کا عرب کی تاریخ میں ذکر آتا ہے۔

حضرت شعیبؑ مدینہ کے شمالی علاقہ میں رہتے تھے۔ آپ کی قوم نے تجارت میں بڑی ترقی کی تھی۔ آپ کی قوم کے بعد یہود کا ایک گروہ جو کہ ضرورت سے حجاز میں آ کر آباد ہو گیا تھا اُس نے تجارت اپنے ہاتھ لے لی تھی۔ آن کی بستیاں مدینہ سے لے کر شام تک چلی گئی تھیں۔ آن کی ترقی بھی قریش کے روبرو تھی۔ قریش اپنے آپ کو طبعی طور پر حجاز کے مالک اور مرکزی قوم سمجھتے تھے۔ اِن تاریخی اور اپنے زمانے کے اثرات سے ان میں تجارت کا خاص شوق تھا اور اس کے ذریعہ آنہوں نے ترقی کی بہت سی توقعات قائم کرلی تھیں۔ لیکن اس بلند خیالی کے مطابق ان کو تجارتی سامان میسر نہیں تھا تو آن کی مشکلات حل کرنے کے لیے ایک بڑا ذریعہ یہ بن گیا کہ وہ بیت اللہ کے خادم تھے۔ اور تمام عرب میں بیت اللہ کی عزت تھی جو عام طور پر مسلم تھی۔

اس واقعۂ فیل کے بعد یمن اور شام میں بھی بیت اللہ کی عزت کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔ اب لوگ قریش کو مذہبی حیثیت سے بزرگ سمجھ کر بہت سی رعایت دیتے۔ آن کے قافلے امن سے سامان لاتے اور دور دراز ملکوں میں لے جانے میں کامیاب ہو جاتے اور اس تجارتی ذریعہ سے جس کی کامیابی میں بیت اللہ کی خدمت کا بڑا دخل تھا مکہ کے تمام رہنے والوں کو روٹی پہنچتی تھی۔

یہ سورت اہلِ قریش یعنی مکہ کے رہنے والوں پر بھاری ذمہ داری ڈالتی ہے اور آن کو متنبہ کرتی ہے کہ تم اپنی قومیت کی بنیاد نسلی تنافر پر نہ رکھو۔ بلکہ اس

بیت کے رب کی عبادت کرنے کو اپنا شعار بناؤ۔ اس مختصر جملہ میں یہ مطلب آ جاتا ہے کہ ابراھیم و اسماعیل علیہما السلام کی جو توقعات ہیں کہ اُن کی نسل میں سے ایک جماعت تمام دنیا کے لیے نیک کاموں میں پیشوا ثابت ہو وہ جماعت اس نصب العین کو اپنے سامنے رکھے۔ نیشنلزم کے سامنے جب بلند نظریہ آ جائے تو اُس کی اصلاح ہو جائے اور اگر ایک اُصول کی حمایت پر ایک قوم تُل جائے تو اس اصول کے آدمی جس قوم میں ملیں وہ ضرور اُن کی عزت کریں گے۔ اس طرح ان کی نیشنلزم طاقت انٹرنیشنل ازم کے لیے مرکز کا کام دینے لگے گی اور یہ نیشنلزم کی انتہائی اصلاح ہے۔

آیت (۳) **فلیعبدوا رب ھذا البیت الذی اطعمھم من جوع و آمنھم من خوف** :- اس بیت کے رب کے غلام بن کر رہیں جس رب نے ان کی روٹی کا سامان اس بیت اللہ کے وسیلہ سے بنا دیا ہے۔ اور جابر بادشاہوں کے خوف سے امن میں بسنے لگے ہیں تو ان پر واجب ہے کہ اس پیشین گوئی کے مصداق بن جائیں جو حضرت ابراھیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی کہ اس گھر سے ایک جماعت صالحہ ان کی اولاد میں سے پیدا ہو جو تمام قوموں کی استاد بن جائے اور تمام قوموں کو اس مرکز پر جمع کر دے۔ اس لیے تم کو چاھیے کہ نیشنلزم کا خیال چھوڑ کر اس نصب العین کو سامنے رکھو۔ جس قوم میں یہ نکتہ موجود ہو اُس کو اپنے اندر جذب کر لو اور اپنے اندر یہ خصوصیات پیدا کرلو۔

یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ قریش تجارت کا شوق رکھتے تھے اور اُن کو جو تجارتی سہولتیں میسر تھیں وہ فقط اس بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے ملتی تھیں۔ اِسی بیت اللہ کے ذریعے اُن کو امن ملا ہوا تھا تو اس بیت اللہ کی تعمیر کے وقت (یعنی حضرت ابراھیم اور اسماعیل علیہما السلام کے) جو اصول مانے گئے تھے قریش کو ان کا حاصل کرنا ضروری ہے یعنی اس بیت کی تعمیر کے وقت جن اصولوں کو اساسی طور پر مانا گیا تھا اُن کے یہ حامل نہیں لیکن اگر وہ ان اصولوں کی حمایت کریں گے تو حفاظت سے رہیں گے اور اُن کو رزق میسر ہوتا رہے گا اور کامیاب ہوں گے۔

واقعۂ فیل کے بعد نوجوان قریشیوں میں ملک گیری کی ہمت پیدا ہوگئی تھی۔ عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ جب میں مصر کی طرف تجارتی سامان لے جاتا تھا تو یہی سوچتا تھا کہ مصر پر کدھر سے حملہ کیا جائے۔ اور مغیرہ بن شعبہ کا قول ہے کہ قبل اسلام جب میں ایران گیا تو بادشاہ کو سجدہ کرتا دیکھ کر دل میں آیا کہ بادشاہ کو تھپڑ مار کر اتار دوں، ایسے مخنّث لوگ بادشاھی کر رہے ہیں حالانکہ بادشاھی کے زیادہ حقدار ہم ہیں۔

سُوْرَةُ الماعُون مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعَ آيَاتٍ

سورہ ماعون مکہ میں نازل ہوئی اور اِس کی سات آیتیں ھیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ھے

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (١) فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (٢) وَلَا

تونے دیکھا اُسکو جو جھٹلاتا ھے انصاف ھونے کو سو یہ وھی ھے جو دھکّے دیتا ھے یتیم کو اورنہیں

يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (٣) فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ (٤) الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ

تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر پھر خرابی ھے اُن نمازیوں کی جو اپنی نماز سے

١ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (٥) الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (٦) وَ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (٧) ع

ع

٣٢

بے خبر ھیں وہ جو دکھلاوا کرتے ھیں اور مانگی (مانگنے سے) نہ دیویں برتنے کی چیز.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ الماعون مکیۃ

سورۃ ماعون کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اُس کا غلام ہو رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی آدمی یتیموں ، بے کسوں اور مسکینوں کی امداد نہ کرے اور تجارت وغیرہ سے سرمایہ جمع کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جماعت کے غرباء اور مفلوک‌الحال لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اگر اس میں مذہبی جماعت فیل ہوگئی تو پھر نماز میں بھی فیل ہے۔

سورۃ قریش میں قریش کی قومیت کو ایک مذہبی جماعت میں تبدیل کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ مذہبی جماعتوں میں جو عیب پیدا ہو جاتے ہیں اُن کو اس سورت میں سمجھایا گیا ہے مذہب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قوم کی خرابی دور کرنے کے لیے مذہبی رنگ اختیار کیا جائے مگر قوم میں وہ خرابیاں بدستور قائم رہیں یا آگے سے بھی بڑھ جائیں۔

آیت (۱ تا ۳) ارئیت الذی یکذب بالدین فذلک الذی یدع الیتیم و لا یحض علی طعام المسکین :- ایسے آدمی کا خاکہ کھینچا گیا ہے جو دوسری زندگی کا منکر ہے۔ ایک مذہبی آدمی اور دنیا دار میں نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ خدا کے ماننے میں تو دونوں قریب قریب شریک ہیں مگر آخرت کو ماننے والا اِنسان دین دار کہلاتا ہے اور اس سے بے پروائی برتنے والا اِنسان دنیا دار کہلاتا ہے۔ اِس سورت میں ایک دنیا دار سرمایہ دار اور دین دار کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے کہ کون نامعقول ہے۔

ارئیت الذی یکذب بالدین :- وہ آدمی جو یوم‌الدین کا انکار کرتا ہے۔ کیا تو نے اُسے دیکھا؟

فذلك الذی یدع الیتیم :- اس آدمی کی یہ حالت ہے کہ وہ یتیموں کو دھکّے دیتا ہے۔ یتیم کی لازمی وصف ہے بے کس و بے یار و مددگار۔ وہ ایسے لوگوں کو اپنی طرف آنے نہیں دیتا۔

و لا یحض علی طعام المسکین :- اور مساکین کو کھانے کی طرف نہیں بلاتا۔ ان کے طعام کا بندوبست نہیں کرتا اور ان کے گذران کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی

لوگ یکذب بالدین ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو دین دار سمجھتے ہوں.

یتیموں کو دھتے دینے اور مساکین کے کھانے سے بے پروائی برتنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کو اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا اور آخرت کا وہ قائل نہیں تو جس قدر اصول اُس کی عقل نے تسلیم کیے ہیں اُن پر یہ پورا ہے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک نیشنلسٹ جتنی چیزوں کو صحیح سمجھتا ہے وہ اگر ان کا پابند ہو تو وہ قابل تعریف مانا جا سکتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں دین دار آدمی کا ذکر آتا ہے کہ ان نمازیوں کے لیے افسوس ہے.

(آیت ۵ و ۶ آیت ۷ کے بعد دیکھو)

دوسری تقریر یہ ہے کہ مذہبی جماعت جب سرمایہ پرست ہو جاتی ہے اور جب وہ نظام عالم میں فیل ہو جاتی ہے تو اپنے آپ کو مذہبی ثابت کرنے کے لیے صلواۃ کی پابند ہو جاتی ہے لیکن چونکہ اُس نے کوئی مشقت نہیں جھیلی اس لیے باوجودیکہ وہ جماعت نماز باقاعدہ پڑھتی ہے مگر مفاجات جو روح نماز ہے اس میں نہیں ہوتی.

آیت (۷) **و یمنعون الماعون:**- جن چیزوں کو لوگ عاریۃً لے کر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں یہ نمازی لوگ اُن سے بھی لوگوں کو فائدہ حاصل کرنے نہیں دیتے۔ مثلاً کہ ایک آدمی کے پاس پتیلی ہے وہ اپنا کھانا پکا چکا ہے، اب ہمسایہ کو ضرورت ہے کہ اس میں اپنا کھانا پکا کر آسے واپس کر دے گا۔ **ماعون** اُس چیز کو کہتے ہیں جو ایک شخص کے لستعمال کے بعد دوسرے کے استعمال میں بھی (ضایع ہونے کے خطرے کے بغیر) آ سکتی ہو.

اگر کوئی شخص نماز تو پڑھتا ہے لیکن اُس کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی چیز عاریۃً دوسرے شخص کو نہیں دیتا تو اُس پر افسوس ہے۔ ایسی دین داری سے کیا فائدہ کہ لوگوں کی عام خوبیاں بھی اُن نمازیوں میں نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نیشنلزم کی اصلاح کے لیے جو دین داری پیش کی جا رہی ہے وہ ایسی ہے.

آیت (۵) **فویل للمصلین* الذین هم عن صلاتهم ساهون:**- اب یہ شبہ ہوتا ہے کہ واقعی دین دار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نماز پڑھنے والے اور خدا کو ماننے والے

---

* اصول فقہ کے مسئلہ صفت سے زید کی مثال دی جاتی ہے کہ جب وہ اُس صفت میں کمال رکھتا ہے تو وہ اس صفت میں مشہور ہوتا ہے۔ جیسے صرف میں پڑھایا جاتا ہے کہ:- **ضرب یضرب ضرباً فھو ضارب**- یعنی زمانہ گذشتہ میں زید نے مارا۔ حال کے زمانہ میں مارتا ہے اور مستقبل میں مارے گا اور مارتا بھی خوب ہے تو ایسی حالت میں اُس کو ضارب کہا جائے گا۔ اب یہاں مصلین تب بولا جائے گا جب پوری شرائط و ارکان سے نماز ادا کرے۔ اگر اِس زمانہ میں ویل للمصلین کے معنی ویل للمسلمین کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں.

کیا ایسی ہی بد عنوانیاں کرتے ہیں۔ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ لوگ سچے دین دار نہیں ہیں یہ فقط دکھلاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔ نماز کے معنی بالکل بھولے ہوئے ہیں تو حاصل یہ نکلا کہ یہ جماعت دین دار نہیں ہے۔

آیت (٦) الذی هم یراؤن :- یہ نمائشی طور پر نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن مجید ایسی دین داری کی دعوت نہیں دیتا۔ ایسے دین دار سے وہ آدمی جو لا دین ہے زیادہ اچھا ہے کیوں کہ وہ اپنے اصول کا پابند ہے۔

یہ دین دار لوگ جو ایسی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں قرآن مجید کی دین دار جماعت سے نہیں ہیں۔ یہ تو اپنی نماز سے بھی غافل ہیں۔ اور یہ مردار طاقت ہے۔ اس سے کوئی آمید نہیں کہ یہ کامیاب ہو۔ یہ جماعت اور مذہبی کام بھی رسمی طور پر ادا کرتے ہیں۔ ان کے دل میں تقرب الٰہی کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ یہاں مذہبی جماعت کے ناکام ہونے کا خاکہ کھینچا گیا ہے کہ جو جماعت یتیموں اور مسکینوں کو سنبھالنے کا اپنے اوپر ذمہ نہیں لیتی وہ جماعت دراصل بے دین ہے۔ وہ مذہبی لباس پہن کر اندرونی طور پر سرمایہ پرست ہیں، وہ خدا پرست نہیں۔ اگر آن کو ایمان بیوم الدین ہوتا تو وہ اعلیٰ کام میں (جس میں رضاے مولا یقیناً موجود ہے) سبقت کرتے اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے اور آن کو اپنے عیال کی طرح سمجھتے۔ یہی تو دین ہے اور اسی کے سبب سے یوم الدین میں بہت اجر کی توقع ہے۔ اور یہ مدعی دین جو یتیموں کو ڈھکیلتے ہیں اور مساکین کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کرتے یہ دراصل منکر بیوم الدین ہیں۔ کیوں کہ یوم الدین میں تو انسانیت کا ظہور ہوگا اور یہ انسانیت سے دور ہیں۔ (دیکھو سورۃ البلد).

اب جب یہ دین دار طبقہ ان انسانیت کے کاموں (یعنی یتیموں کو اپنے عیال کے مثل رکھنے اور مسکینوں کے کھانے کے انتظام کرنے) میں فیل ہو جاتے ہیں تو پھر نماز کی طرف دوڑتے ہیں مگر وہاں بھی فیل ہو جاتے ہیں۔ انسان خداے تعالیٰ کی طرف طبعاً آس وقت دوڑتا ہے جب آس کے اوپر بڑی مشکل آ پڑتی ہے یا آس نے ایک بڑا کام شروع کیا ہوا ہوتا ہے جیسے یتیموں اور مسکینوں کے پرورش کا انتظام۔ آنھوں نے کوئی انسانیت کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لی تو گویا آن کا دماغ بڑا عیش پسند واقع ہوا ہے۔ وہ اگر نماز پڑھتے ہیں تو فقط دکھانے کے لیے تاکہ لوگ آن کی طرف متوجہ ہوں اور ان کو دین دار نمازی سمجھیں۔ مگر آن کے دل میں اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ اپنی التجا اور تضرع رب سے نہیں کرتے کیوں کہ آن کے سر پر بار نہیں۔ اور پھر یہاں تک نالائق ہے کہ ماعون جیسی اشیا سے متعلق کہتا پھرتا

ہے کہ لوگوں کو مت دو۔ اس کو تو چاہیے تھا کہ لوگوں کو تلقین کرتا کہ یتیموں اور مساکین کا انتظام کریں تاکہ لوگوں کے دل میں انسانیت پیدا ہو اور خود بھی اُس پر عمل کرتا مگر وہ یتیموں کو دھکّے دیتا ہے اور مساکین کا کوئی انتظام نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے گھر میں کوئی چیز فارغ پڑی ہے تو فقط فائدہ اُٹھانے کے لیے عاریۃً بھی لوگوں کو نہیں دیتا اور اگر کوئی ایسی اشیاء دے دیتا ہے تو اُس پر بندش ڈالتا ہے اور طرح طرح سے لوگوں کو سمجھاتا ہے کہ اپنی اشیاء لوگوں کو استعمال کے لیے نہ دیں۔ خود بھی بخیل ہے اور لوگوں کو بھی بخل سکھاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان کے گدّی نشین پیر اس سورت کے پورے پورے مصداق ہیں۔ اور حضرات علماء میں سے بھی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ ان میں سے کوئی بھی مساکین سے ظلم دور کرنے اور مساکین کے کھانے کا انتظام کرنے والا ہو. مذہب عمل سے ترقی کرتا ہے نہ کہ محض علم سے۔ مدرسہ اور خانقاہیں بھری پڑی ہیں۔ اُن میں نہایت بد اخلاقی پھیلی ہوئی ہے۔ کیوں کہ اُن سے جو کام مطلوب ہے وہ نہیں لیتے۔ جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوئے اُن کو مدرسہ سے نکال دیا۔ آگے وہ کیا کرے اُس کی خبر نہیں۔ انسانیت کے کام اگر اُن کو مدرسوں اور خانقاہوں میں سکھائے جاتے تو آج مسلمانوں کی حالت یوں تباہ نہ ہوتی کہ سود در سود میں غرق ہیں۔ علاوہ اس کے اخلاق بھی تباہ ہیں.

سُوْرَةُ الْکَوْثَرِ مَکِّیَّةٌ وَّهِیَ ثَلٰثُ آیَاتٍ

سورہ کوثر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (۱) فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ (۲) اِنَّ شَانِئَکَ

بے شک ہم نے دی تجھکو کوثر سو نماز پڑھ اپنے رب کے آگے اور قربانی کر بے شک جو دشمن ہے تیرا

١ ع ٢٢ هُوَ الْاَبْتَرُ (۳) ع

وہی رہ گیا پیچھا کٹا۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم○

سورۃ الکوثر مکیۃ

اس سورت میں ان دینی اصولوں کا خلاصہ ہے جن کی دعوت نیشنلسٹوں کو دی جاتی ہے.

آیت (۱) إنا اعطیناك الکوثر:- اے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تجھے خیر کثیر دیا۔ خیر کثیر کو قرآن مجید میں حکمت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہے حکمت۔ اور دوسرے موقع پر حکمت کا کورس قرآن عظیم بتلایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے قرآن مجید دیا.

مشہور یہ ہے کہ الکوثر ایک حوض یا نہر کا نام ہے جو قیامت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو پانی پینے کے لیے ملے گی.

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز حجۃ اللہ البالغہ میں کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیا میں قرآن مجید کا فیض پھیلا، قوموں نے طبقہ در طبقہ قرآن مجید سیکھا اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یہی فیض حاصل کرنا حوض کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا۔ جس آدمی نے یہاں جس قدر قرآن مجید سیکھا ہے اسی انداز سے وہاں تشنگی دور کرنے والا پانی ملے گا۔ تو جن روایتوں میں حوض وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی قرآن مجید کا اثر ٹھہرا.

دنیا میں حوض کوثر یہی قرآن مجید ہے۔ حوض کوثر کی صفتیں جو حدیث میں منقول ہیں وہ قرآن مجید پر صادق آتی ہیں۔ اور قیامت میں قرآن مجید کی مثالی اور روحانی شکل وہی حوض کوثر کا پانی نظر آئے گا.

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے اعلیٰ خاندان کے سردار ہیں۔ آپ کے پاس ایک علم (قرآن مجید) ہے۔ قریش کو چاہیے کہ اپنا علمی کمال اپنے سردار کی اس کتاب کو بنالیں۔ اس سے نیشنلزم کی اصلاح ہو جائے گی.

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا بڑا ذخیرہ خیر کثیر کا دیا گیا تو آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ:-

آیت (۲) فصل لربك:- اپنے رب کو یاد کر۔ اور اس صلواۃ کے ذریعہ قرآن کی

اشاعت کا حکم ہوتا ہے یعنی اشاعت قرآن کے وقت آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو۔ اس کا یہ فائدہ ہو گا کہ جب آپ کے پاس بڑی بڑی جماعتیں آجائیں گی اور آپ کے کام میں شریک ہو جائیں گی تو آپ کے دل میں غرور اور تکبر پیدا نہ ہو گا اور آپ اللہ کے بندے اور غلام رہیں گے اور اس تعلیم کا مالک اللہ کو سمجھیں گے.

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید قوموں میں پھیلائیں۔ قرآن مجید تو اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمایا ہے۔ اب فرض یہ ہے کہ اس کو پھیلایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز پڑھتے ہیں تو اس میں بھی قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اور یہی طریقہ اشاعت کا ہے.

آیت (۳) **وانحر:**- اس طرح قریش میں ماننے والی جو جماعت تیار ہو رہی ہے اُن کے لیے کھانے کا انتظام مہیا کرو۔ اونٹ ذبح کرنے میں ایک سخاوت کی لہر ہے۔ اگر ایک آدمی کے کھانے کا انتظام کرنا ہو تو بھی ایک اونٹ ذبح کرنا ہو گا۔ اس طرح بہت سے لوگ خود بخود کھانا کھا سکیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو دریا دلی سے اپنے حال میں شریک کرو۔ اور اِسی طرح علمی و عملی اصلاح ہو جائے گی.

اِس سورت میں نماز کے ساتھ قربانی کو بھی جمع کردیا گیا ہے۔ سورت ماعون میں کہا گیا تھا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں مگر مساکین کے کھانے کا انتظام نہیں کرتے، اب اِس جگہ بتلایا کہ اُن کی یہ حالت ہے کہ ایک آدمی کے لیے سارا اونٹ ذبح کرتے ہیں.

آیت (۳) **ان شانئك هو الابتر:**- جو آدمی تیری برائی چاہتا ہے وہ ناکام رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ قریش جب تک اِس دین کو قائم رکھیں گے اُس وقت تک اُن پر کوئی غالب نہیں آ سکے گا۔ دوسری حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی حبشی ہو اور وہ کتاب اللہ کو قائم رکھتا ہو تو اس کی اطاعت کرو۔ ان دونوں آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی جس قدر عزت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس دین کے پابند تھے۔ اس میں شک نہیں کہ قریش ذاتی طور پر آپ کی قوم میں سے تھے مگر اس قومیت کو قرآن مجید سے کیا تعلق؟

غرض اِس سورت میں بتلایا گیا ہے کہ جو اس تعلیم (قرآن مجید) اور دین سے بغض رکھتے ہیں وہ ناکام رہیں گے۔ ابتر کہتے ہیں اُس شخص کو جس کا بیٹا نہ ہو۔ تو یہ ایک عام ذہنیت ہے کہ انسان یہی سمجھتا ہے کہ اگر اس کا بیٹا ہے تو اُس کا کام آگے چلتا رہے گا، ورنہ بند ہو جائے گا۔ اس واسطے ان کو بتایا گیا ہے کہ جو آدمی خدا ترس نہ ہو اور مستحقین کی مدد نہ کرے وہ ناکام رہے گا۔ اور اُس

کی تحریک بھی اسی پر ختم ہو جائے گی۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کی طرف اشارہ ہے کہ وہ تحریک کامیاب رہے گی اور آپ کا کام چلتا رہے گا۔

ہمارے مفسرین کی بڑی غلطی یہ ہے کہ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو خطاب ہوتا ہے تو اس کام کو آپ کی ذات تک محدود سمجھتے ہیں یعنی اس کو خاص بنا لیتے ہیں۔ اس میں غلطی یہ ہے کہ جو حکم آپ کو اس جماعت کے افسر کے اعتبار سے دیا گیا ہے تو اب جب کہ افسر کو حکم دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تمام جماعت بھی شامل ہے۔

اب جو کہا گیا ہے کہ اس تحریک کے خلاف کام کرنے والے ناکام رہیں گے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو جو آپ کے ساتھ چلانے والے ہیں ان کے ذریعے آپ کے کام کا سلسلہ چلتا رہے گا۔

حاصل یہ نکلا کہ اس خیر کثیر (قرآن مجید) کی اشاعت کے لیے ایک تو اس کے احکام پر سربسجود ہو جاؤ۔ اور اس کے سوا اپنا کوئی پروگرام اختیار نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے آگے سر بسجود رہو، اتصال اپنا قائم رکھو، اسی حالت میں اشاعت تعلیم قرآن مجید کیا کرو اور اس قانون کی اقامت کے لیے قربانیاں گوارا کرو خواہ گلا کاٹا جائے۔ تو جب اِس مضبوطی سے اور ہمت و استقلال سے کام کیا جائے گا تو تم ہی کامیاب رہو گے اور انقلاب اس کے سوا ہو نہیں سکتا جب تک انسان اپنے قانون پر مستعدی سے کام نہ کرے اور قربانی دینے پر تیار نہ ہو۔ جب وہ قربانی دے گا اُس وقت دشمن مغلوب ہو جائے گا اور اُس کا پیچھا چھوٹ جائے گا اور اُس کو کہیں سے مدد نہیں پہنچے گی۔ اور لشکر تازہ دم اُسی وقت رہتا ہے جب تازہ دم فوج آتی جائے۔ اور جب ایک فوج محصور ہو گئی تو مفتوح ہو گئی۔ اِسی کے لیے کہتے ہیں إِذْ حُوصِرَ سَقَطَ۔

اب اگلی سورتوں میں بیان ہے کہ اسلام کیسے غالب ہوا۔

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سِتُّ آيَاتٍ

سورہ الکافرون مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (۱) لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (۲) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۳)

تو کہہ اے منکرو میں نہیں پوجتا جس کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجو جس کو میں پوجوں

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ (۴) وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ (۵) لَكُمْ

اور نہ مجھکو پوجنا ہے اس کا جس کو تم نے پوجا اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں تم کو

دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۶) ۱ ع ۳۴

تمہاری راہ اور مجھکو میری راہ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ الکافرون مکیۃ

آیت (۱) قل یا ایھا الکافرون :- اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کو کہو (یعنی ری اکشنری والوں کو) کہ اب ہمارا تمہارا تعلق منقطع ہو گیا۔ کافر سے وہ لوگ مراد ہیں جو اسلام کے خلاف اپنے پروگرام کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ اس واسطے اُن کو پہلی آیت میں خطاب کیا گیا ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں کہا گیا ہے کہ :-

آیت (۲ و ۳) لا اعبد ما تعبدون و لا انتم عابدون ما اعبد :- ہم تمہارے معبود کی اور تم ہمارے معبود کی عبادت نہیں کرتے۔ تمہارا اور ہمارا پروگرام آپس میں نہیں ملتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمارا تمہارے ساتھ مرکزی نقطہ نہیں ملتا۔

دو دینی تحریکوں میں کم از کم اتنا اثر تو ضرور ہونا چاہیے کہ اُن کا معبود ایک ہو مگر یہاں حالت یہ ہے کہ ہمارا اور اُن کا معبود ایک نہیں۔ غرض اِن دو آیات میں بتلایا گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے معبود کو نہیں مانتے (زمانۂ حال میں).

آیت (۴ و ۵) و لا انا عابد ما عبدتم و لا انتم عابد ما عبدتم :- اِن دو آیات میں بتلایا گیا ہے کہ ہم آئندہ بھی ایک دوسرے کے معبود کو نہیں مانیں گے.

آیت (٦) لکم دینکم ولی دین :- تمہارے لیے تمہارا پروگرام اور ہمارے لیے ہمارا پروگرام۔ غرض دونوں کے پروگرام اب ایک دوسرے سے پوری طرح منقطع ہو گئے۔ حقیقت میں یہ ایک طرح کا الٹیمیٹم ہے۔ جب تک دو جماعتوں اور دو سلطنتوں میں ملنے کی توقع ہوتی ہے اُس وقت تک ان دونوں میں لڑائی نہیں ٹھن سکتی۔ مگر جب ملنے کی توقع ختم ہو جاتی ہے اُس وقت لڑائی کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اب یہ کہ لڑائی کب ہو گی، اس کے متعلق حالات خود فیصلہ کریں گے۔ سفارتی تعلقات کا منقطع کرلینا ہی لڑائی کا پیش خیمہ ہے بہت سے مفسروں نے بے سمجھی سے اس سورت کو لڑائی کے ترک کردینے پر محمول کرلیا ہے یعنی یہ کہ اس سورت میں لڑائی کو موقوف کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ درحقیقت یہ ایک قسم کا الٹیمیٹم تھا۔ مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم کی تفسیر بھی اسی طرح ہے.

سر سید نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں لڑائی مدافعانہ ہے۔ اور مولوی حمیدالدین صاحب اس سورت کو الٹیمیٹم قرار دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ سورت مکیّٔی ہے تو مکہ مکرمہ میں اعلان جنگ ہو چکا تھا جس سے قریش گھبرا رہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے متعلق دارالندوہ میں مشورہ کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ اِسے ایک بڑی عظیم جنگ سمجھتے تھے کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کے بلند ارادوں اور کام کی اعلیٰ تدبیرات کو دیکھ کر آن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا پورا یقین ہو چکا تھا۔

سُورَةُ النَّصر مَدَنِيَّة وَهِيَ ثَلٰثُ آيَات

سورہ نصر مدینہ میں نازل ہوئی اور اِس کی تین آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (۱) وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ

جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے دین میں

اَفْوَاجًا (۲) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۳) ع

غول کے غول تو پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں اور گناہ بخشوا اس سے بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ٥

سورۃ النصر مدنیۃ

الٹیمیٹم کے بعد لڑائی ہوتی ہے۔ الٹیمیٹم کا جو نتیجہ نکلا وہ اس سورت میں بتلایا گیا ہے کہ مکہ بھی فتح ہو گیا جو مرکزِ عرب تھا۔ اب ایک حکومت قائم ہو گئی ان اصولوں پر جن کا آپ نے مکہ مکرمہ میں اعلان کیا تھا اور ظاہر میں یہ حکومت نیشنلسٹ یعنی قومی تھی مگر اصولاً وہ انٹرنیشنل طاقت تھی جس میں دوسری قومیں شریک ہو گئیں۔

آیت (۱) اِذا جاءَ نصر اللہ و الفتح :- اللہ تعالیٰ کی مدد ہے، مرکزی جماعت کا قیام۔ مہاجرین اور انصار کی مرکزی جماعت اپنا فرض پہچان گئی۔ جو کام پہلے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے تعلق رکھتا تھا آپ کی تعلیم سے جو جماعت پیدا ہوئی اس نے اِس فرض کو اپنے اوپر ذمہ داری سے لے لیا یعنی اسے اپنا فرض قرار دیا تاکہ حجاز جیسے ملک میں ایسی اعلیٰ تحریک کے لیے مضبوط مرکزی کمیٹی قائم ہو جائے اور وہ بھی دس بیس برس کی قلیل مدت میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت تھی۔ اسی کو نصراللہ سے تعبیر کیا گیا اور یہ مسلسل رہے گی (یعنی یہ نصر من اللہ آپ کی اور آپ کی جماعت کے ساتھ مسلسل رہے گی) اس کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ اس مدد ملنے کے بعد مکہ مکرمہ فتح ہو گیا جو حجاز کا دارالسلطنت تھا۔

آیت (۲) ورأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجاً :- مرکز پر قبضہ ہونے کے بعد تمام ملک میں قبضہ مکمل ہو رہا ہے اور قوموں کی قومیں اِس مسلک اور دین میں داخل ہو رہی ہیں اور آپ کے پروگرام کو قبول کر کے اور آپ کی تحریک میں شامل ہو کر خدائی انٹرنیشنلزم کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ گئی ہیں۔

آیت (۳) فسبح بحمد ربك واستغفرہ :- اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو نے اپنا کام پورا کر دیا، اب تو اللہ کو یاد کر۔

اس سورت میں ذکی صحابہ کا امتحان ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے سیدنا ابوبکرصدیق رضہ اِس سورت کا مطلب یہ سمجھے کہ آنحضرت (روحی فداہ) صلی اللہ علیہ وسلم کا اب وقت ختم ہو چکا ہے۔ آپ نے اس کام کو مکمل کر لیا جس کے لیے مبعوث ہوئے تھے،

اب آپ کو اللہ تعالیٰ جل شانہ حظیرۃالقدس کی طرف بلا رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمر رضہ نے عبداللہ بن عباس کا اِس سورت میں امتحان لیا تو اُنھوں نے بھی اِس سورت کا یہی مطلب لیا.

مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے یعنی حجاز کا دارالسلطنت ہے۔ مگر ہم لوگ اِسے پولیٹیکل فتح سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس اسلام کا ایک شعبہ شروع ہو گیا اور اُس سے پولیٹیکل کام کو ترقی ہوئی.

سُوْرَۃُ اللَّھَب مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ خَمْسُ آیٰاتٍ

سورہ لہب مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (۱) مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَ مَا كَسَبَ (۲)

ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ کام نہ آیا اُس کو مال اُس کا اور نہ جو اُس نے کمایا

سَيَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (۳) وَّ امْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۴) فِیْ جِيْدِهَا

اب پڑے گا ڈیگ (لپٹیں) مارتی آگ میں اور اُس کی جورو جو سر پر لیے پھرتی ہے ایندھن اُس کی گردن میں

۱
ع
۳٦ حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۵)

رسّی ہے مونجھ کی.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورۃ اللھب مکیۃ

مولوی حمیدالدین کہتے ہیں کہ سورت اذا جاء نصر اللہ میں مسلمانوں کی فتح کی طرف اشارہ تھا اور اس سورت میں کفار کی شکست کی طرف اشارہ ہے۔ مولوی صاحب کا ذہن اس سورت سے اس طرف متوجہ ہوا کہ قریش مکہ کا فرعون کون تھا؟ قرآن مجید کسی خاص آدمی کا نام نہیں لیتا مگر اِس سورت میں اُس نے ابولہب کا خاص طور پر نام لیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب سے بڑی طاقت ابولہب تھی۔ اس واسطے اُس کا نام قرآن مجید میں لیا گیا ہے۔ اور اس شکست کا ذکر ہے۔ مگر اِسلامی روایتوں میں یہ عام نظریہ ہے کہ اس اُمت کا فرعون ابوجہل تھا۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مکہ کا حاکم ابوجہل تھا، ابولہب نہیں تھا۔ مولوی حمیدالدین صاحب کو اِس جگہ عام رائے سے ہٹ کر ایک نیا فلسفہ چھانٹنا پڑا لیکن اِس بارے میں ہمیں اُن کی تفسیر سے موافقت نہیں ہے۔ اُنہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں اِس سورت کی تفسیر کی ہے مگر ہم اور نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں پولیٹیکل طاقت انتہائی طاقت نہیں ہے یعنی مستقل طاقت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دوسری طاقت کا نتیجہ ہے۔ طاقت درحقیقت سوشل ہوتی ہے اور اس سے حکومت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ تمیز ہمیں تب سے پیدا ہوئی جب سے ہم نے یورپ کی انٹرنیشنل تحریک کا مطالعہ کیا اور اُس نے ہمیں قرآن مجید کی تفسیر میں بہت مدد دی ہے۔ ہمارے اکثر مفسرین اِس کو مدِنظر نہیں رکھتے اِس واسطے وہ بہت پریشان ہوتے ہیں۔ یورپ میں بھی ساری طاقت اِس سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر کسی قوم کو دوسری قوم پر پولیٹیکل فتح ہو جائے اور سوشل فتح نہ ہو تو یہ (پولیٹیکل) فتح عارضی ہے اور چونکہ سوشل فتح نہیں ہوئی اِس واسطے سوشل کونپلیں دوبارہ نکل آئیں گی اور اُن کے خلاف سوشل طاقت جمع ہو جائے گی۔ ہم اس سورت کو سوشل فتح سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعینہ اِسی طرح جس طرح سورت النصر میں پولیٹیکل فتح تھی۔

اب سوشل فتح میں جس چیز کا ذکر آنا چاہیے وہ ایک مقابل طاقت خاندان

کی ہونی چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے دل میں مخفی دعا مانگی جسے استعداد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کی چھپی ہوئی خواہش تھی کہ اگر کسی بُرے خاندان کی سوشل مثال کا ذکر آنا منظور ہو تو وہ ہمارے خاندان کے کسی گھر کی مثال ہونی چاہیے۔ ابولہب، رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کا چچا تھا۔ اس واسطے آپ کا یہ خیال کہ اپنے خاندان کی بری مثال پیش کی جائے ایک نہایت حکیمانہ فعل ہے۔ یہ آپ کی طبیعت کی مخفی دعا تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا اور ویسی ہی سورت نازل کی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و سلم کے خاندان کے سوا اگر کسی دوسرے گھر کا ذکر قرآن مجید میں اِس طرح آ جاتا تو وہ ساری عمر کے لیے دشمن ہو جاتا اور موجودہ صورت میں جو خرابی کا الزام ہے وہ آپ کے اپنے خاندان سے ہے اور وہ یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

ہماری سمجھ میں ابولہب کو اگر عرب کی سوشل خرابی کا نمونہ سمجھا جائے تو کوئی هرج نہیں۔ مگر اُسے حجاز کی پولیٹیکل طاقت کا نمائندہ بنا کر فرعون بنانا بالکل غلط ہے۔ مولوی حمیدالدین صاحب مرحوم کا یہ خیال کہ قرآن مجید پولیٹیکل طاقت سے سیدھا نہیں لڑتا دراصل سرسید کے خیالات کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ ان سے متاثر تھے۔

اس سورت کی تفسیر یہ ہے کہ یہ فقط ایک بد دعا ہے۔

آیت (۱) تبت یدا ابی لهب و تب :- خدا کرے ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں اور خود برباد ہو۔

آیت (۲) ما اغنیٰ عنه ماله و ما کسب :- اپنے گھر کے اجتماع کے ذریعے جو اُس نے مال کمایا ہے اور اُس نے جو آدمی پیدا کیے ہیں، خدا کرے وہ اُس کے کام نہ آئیں۔

آیت (۳) سیصلیٰ ناراً ذات لهب :- جلدی ایسا وقت آنے والا ہے کہ وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا۔

آیت (۵) وامراته حمالة الحطب :- اور اُس کی بیوی جو آگ جلانے کے لیے ایندھن جمع کرتی ہے۔

آیت (۵) فی جیدها حبل من مسد : اُس کے گلے میں کھجور کا رسّا ہو گا۔

اِس طرز پر تفسیر کرنے کا مطلب یہ بن جاتا ہے کہ پولیٹیکل طاقت کے زور سے سوشل اصلاح نہیں ہو سکتی۔ وہ لوگوں کی ذہنیت بدلنے سے ہوتی ہے اور ذہنیت بدلنے کا طریقہ یہ ہے کہ توجہ اور تاثیر سے دوسرے ذہن پر اثر ڈالا جائے۔ اس کا

دوسرا طریقہ دعا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی پوری توجہ سے پیش کیا جاتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ یہ کام ہو جائے۔ یہ سورت ایسے الفاظ میں نازل ہوئی ہے کہ یہ ہو چکا ہے۔ لوگوں نے غلطی سے اِسے پیشن گوئی پر محمول کر لیا حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اور یہ محض دعا ہے۔ ہم کسی آدمی کے متعلق بددعا کریں اور وہ قبول بھی ہوجائے تو اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا کہ اس آدمی کی قوت بھی سلب ہوگئی۔ وہ اپنی پوری قوت کے مطابق زور سے کام کر سکتا ہے مگر مقابل میں اتنی طاقت آئے گی کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ یہ شکست سوشل نوعیت کی ہو گی۔

یہاں مفسرین نے اپنی بد دماغی سے ایسے شبہات پیش کیے ہیں کہ اُن کا اِس جگہ ذکر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ مثلاً کہتے ہیں کہ جب اُنہیں بتا دیا گیا کہ ابولہب مسلمان نہیں ہوسکے گا اور وہ جہنم میں جائے گا تو پھر اُسے اسلام لانے کی دعوت دینے کا کیا مطلب؟ مگر جس طرح ہم نے ترجمہ کیا ہے اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ وہ جس وقت اپنی اصلاح کر لے گا اُسی وقت سے وہ اول درجہ کے آدمیوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ جو بری مثال پیش کر رہا ہے وہ ختم ہو یعنی بری مثال نہ رہے اور اُس کو شکست ہو۔ شکست دو قسم کی ہوتی ہے یا تو وہ جہنم میں چلا جائے گا یا ہدایت پا کر اُس کی سوشل حالت کو شکست آ جائے گی۔

اس کا حاصل ہماری سمجھ میں یہ ہے کہ یہ سورت اِسلام کی سوشل فتح کی خبر دینے والی ہے۔ سوشل اصلاح بھی تمام عرب کی اور خصوصاً قریش کی بدرجۂ اتم ہو جائے گی۔ یہ سوشل فتح و اصلاح نتیجہ ہے ذہنی اصلاح و انقلاب کا۔ معاشرہ ہمیشہ ذہنی انقلاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اِس سورت اللھب* کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر جنگ سے کسی قوم پر دوسری قوم غالب آجائے تو دیکھنا یہ ہے کہ اگر مغلوب قوم میں معاشرت وھی رھی یعنی طبعی ضروریات پوری کرنے کا طرز وھی سابقہ رہا جیسے رسومِ نکاح و شادی اور آپس میں ملنا جلنا اور خانگی عادات وغیرہ ویسے کے ویسے رہے اور اُن کی اقتصادی حالت بھی ویسی کی ویسی رھی بلکہ جن رسوم پر اُن کے لین دین تھے وہ بھی ویسے رہے اور مال کسب کرنے کے طریقے بھی ویسے رہے تو حکیم آدمی پیشین گوئی کرے گا کہ یہ مغلوب قوم فی الواقع مغلوب نہیں ہوئی۔ چند دنوں کے بعد ویسی کی ویسی برسرِ اقتدار

---

* اگر ابولھب بالفرض مسلمان ہو جاتا تب بھی یہ سورت ویسی کی ویسی ھی پڑھی جاتی کیوں کہ معاشرے میں جو غلطیاں سرزد ہو رھی تھیں یہ دراصل اُن پر بددعا ہے۔

آ جائے گی۔ اور یہی فلسفہ ہے جس پر آج کل یورپ ترقی کر رہی ہے۔ مثلاً اگر مکہ مکرمہ کی فتح کے بعد اُن کے خاندانی رسوم اور میل جول کی عادات ویسی کی ویسی رہیں اور اس کے ساتھ ہی اُن کے طریقے کسبِ رزق کے جو پہلے تھے ویسے ہی رہے (گویا پہلے کی طرح اپنے کفر پر رہے) تو چند دنوں کے بعد ویسے کے ویسے ہوجائیں گے اور پھر بھی مکہ پر قبضہ کر لیں گے بلکہ فاتح جماعت کا اثر بھی نہیں رہے گا۔

اہلِ مکہ کی معاشرت اور اقتصادی حالت میں ظلم بھی تھے اور خلافِ انسانیت کام تھے، تو جب تک اُن کی معاشرت اور اقتصادی حالت کی اصلاح نہ کی جائے گی تب تک اُن کے مفتوح ہونے پر کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا (معاشرت اور اقتصادی حالت کو انگریزی زبان میں سوشیل کہتے ہیں) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اُن کی سوشیل اصلاح کی طرف تھی چنانچہ اہلِ مکہ کی بری معاشرت اور بری اقتصادی حالت (سوشیل) کا ایک برا نمونہ دکھا کر اُس پر بد دعا کرنی تھی کہ یہ حالت اُن کی نہ رہے بلکہ اصلاح پذیر ہوکر قرآن مجید کی تعلیم پر آجائے۔ یعنی اُن کی سوشل حالت ہماری تعلیم کے آگے شکست کھاجائے۔ جیسے اسلام پولیٹیکل (جنگی) حالت سے اُن پر غالب ہوا اور وہ شکست کھا گئے، ایسے ہی اُن کی سوشل حالت بھی شکست کھا جائے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ابولہب پر لعن طعن ہو۔ بلکہ اُن کی معاشرت اور اقتصادی حالت کو شکست دینے کی بد دعا ہے کہ یا اللہ ان کی یہ حالت برباد ہوجائے اور اصلاح شدہ حالت ان پر غالب آجائے۔ نمونہ کے لیے اپنے خاندان کو مد نظر رکھا گیا۔ اس سوشیل کی شکست تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ ان میں ذہنی تبدیلی آ جائے۔ اُنہوں نے جن نظریوں پر اپنی حالت بنا رکھی ہے اور جس فلسفہ پر اُن کی سوشیل حالت کا مدار تھا وہ بدل جائے*۔ آگے فلسفۂ توحید کا سورۂ اخلاص میں کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد انسانیت کا زیادہ مطمح نظر نقصان سے بچنے کی طرف ہوتا ہے اور نفع کمانا تو خود بخود آ ہی جاتا ہے اور شر سے بچنا یہ انسانیت کا اصلی تقاضا ہے۔ جس جماعت میں یہ نظریہ آ جائے تو اُس کا کامیاب ہونا یقینی ہے۔ شر سے بچنے کا مضمون سورۃ العلق میں ہے جس میں کہا گیا ہے **من شر ما خلق** اور اس کے بعد ہی فلسفۂ حب ہے۔ اس حب سے عدل پیدا ہوتا ہے اور یہ سورت الناس میں ہے۔ ذہنیت کی تبدیلی فلسفہ سے ہوتی ہے اور فلسفہ یہ ہے کہ ایک چیز کو مرکز بنا لیا جائے اور باقی اشیاء کو اس طرف راجع کر دیا جائے۔ اب ان کی ذہنیت کو اِس طرح تبدیل کیا جاتا ہے کہ تمام انسانیت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس کے

---

* اس کا بدلنا اِس صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ نقطۂ توحید پر جس طرح قرآن حکیم کہتا ہے جمع ہو جائیں اور اس نقطۂ توحید سے جو اثرات معاشرت پر پڑتے ہیں اُن کو وہ قبول کرلیں۔

سوا کوئی شر سے بچانے والا نہیں اور وہی اللہ تعالیٰ محبوب ہے۔ اسی سے محبت رکھنی چاہیے۔ جب اہل مکہ کا فلسفہ بدل جائے گا تو ضرور ان کی سوشیل حالت بھی بدل جائے گی اور یہ فتح جو جنگی طاقت سے ان پر ہوئی وہ ہمیشہ کے لیے رہے گی اور قریش جماعت اسلام کی مفتوح ہو گئی۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ ہندوستان پر پولیٹیکل فتح مسلمانوں نے حاصل کی۔ مگر ہنود کی معاشرت اور اقتصادی حالت وہی رہی اور ان کا فلسفہ بھی وہی رہا۔ اگرچہ مسلمانوں نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا مگر دراصل وہ مغلوب نہ ہوئے۔ ان کی طاقت ویسی کی ویسی رہی، آخر انہوں نے مسلمانوں کو شکست دی۔

سُوْرَةُ الاخْلاصِ مَكِيَّةٌ وَهِيَ اَرْبَعُ آيَاتٍ

سورہ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ (۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ (۲) لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ (۳) وَلَمْ

تو کہہ وہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے نہ کسی کو جنا نہ کسی سے جنا اور نہیں

يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۴)

اس کے جوڑ کا کوئی۔

۱ ع ۲۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سورۃ الاخلاص مکیۃ

گذشتہ دونوں سورتوں (اذا جاء نصر اللہ اور تبت یدا ابی لہب) میں ہم نے دیکھا کہ پولیٹیکل طاقت درحقیقت سوشیل طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی سوشیل طاقت ذہنی ترقی سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ذہن کو ایک طرف نہ لگادیا جائے اور اس کی تبدیلی نہ کی جائے تو سوشیل تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔ اب جو ذہنی تبدیلی ہے اُس کا نام ہے فلسفہ.

ان تین سورتوں (اخلاص اور معوذتین) میں اسلام کی عقلی فتح ہے۔ پہلے پولیٹیکل اس کے بعد سوشیل اور آخر میں عقل۔ اب اس کے بعد انسانیت کے لیے کچھ اور نہیں ہے جس سے انسانیت کی اصلاح کی جائے۔ اسلام کے اصلی عقلی فلسفے کا خلاصہ بیان کرنے سے پہلے ایک عام قاعدہ یعنی تمہید بتانے کی ضرورت ہے۔

فلسفہ کا حاصل یہ ہے کہ عقل کے سامنے ایک چیز بطور مرکز کے پیش کی جائے اور تمام چیزیں اُس میں وابستہ کردی جائیں تو فلسفہ بن جائے گا اور اس سے زیادہ فلسفہ کا مطلب نہیں ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ فلسفے کے مختلف سکول ہوتے ہیں، اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمام فلاسفہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ تمام چیزوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیں (وہ مرکز جو اُن کے خیال میں ہوتا ہے)۔ چنانچہ ایک فلسفی یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے خیال کے مطابق اپنے بنائے ہوئے مرکز کے ساتھ تمام چیزوں کا اتصال کر دیتا ہے۔ اور اِسی طرح فلسفے کے مختلف اسکول بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیجیے کہ فلسفے کے ایک اسکول نے کسی ایسی چیز کو مرکز بنایا ہے کہ عام انسانیت اس کی مرکزیت کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ اور پھر تمام چیزوں کو عام فہم طریقہ سے اس مرکز سے وابستہ کیا جاتا ہے تو فلسفی کا وہ اسکول تمام اسکولوں کی بنسبت انسانیت کے لیے زیادہ قابل قبول ہو گا اور فلسفے کے دوسرے اسکولوں کو اس کے مقابلے میں کامیابی کی اُمید موہوم ہو جائے گی.

قرآن مجید نے اِس سورت کو اسلام کے مرکزی نقطہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے.

آیت (۱) **قل ھو اللہ احد** :- تمام عقلمند بآسانی مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے

اور اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ عربی میں جو واحد کا لفظ ہے اُس کے معنیٰ ہیں ایک۔ اس کے مقابلے میں اور لفظ اس مفہوم کے آسکتے ہیں مگر احد کے مقابلہ میں کوئی لفظ آ ہی نہیں سکتا۔

آیت (۲) اللہ الصمد:- صمد اُسے کہتے ہیں جس کی تمام چیزیں محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ یہ لفظ پہلے ایسی چٹان یا پہاڑ کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا تھا جس کی پناہ لے کر لشکر والے جنگ کرتے تھے یعنی لشکر کے پیچھے یہ ٹھوس طاقت، چٹان یا پہاڑی کی شکل میں ہوتی تاکہ لشکر اُس کو اپنی پشت پناہ سمجھ کر میدان جنگ میں بے خوف لڑے اور پیچھے سے خطرہ نہ ہو۔ اس کے بعد صمد کا لفظ اُس سردار کے لیے وضع کیا گیا جس کی پناہ میں جانے کے بعد کسی دشمن کا خوف نہیں رہتا اور جہاں تک اُس کی زندگی کا تعلق ہے اُسے کوئی شخص ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بعد قرآن مجید نے اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کیا کیونکہ اس درجہ پناہ دینا اور کسی دوسری طاقت سے متاثر نہ ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی خصوصیت ہے اور کسی دوسری طاقت میں یہ بات نہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یونانی فلاسفہ نے اللہ تعالیٰ کے لیے جو لفظ استعمال کیا اُس کا عربی ترجمہ ہے واجب الوجود یعنی جس کی ہستی دوسرے کی محتاج نہیں بلکہ از خود موجود ہے۔ اِسی طرح ایرانی فلاسفہ کا لفظ ہے خدا یعنی خود آمدہ۔ اس معنی کو ادا کرنے کے لیے قرآن مجید نے صمد کا لفظ استعمال کیا۔ فلسفیانہ طور پر اس کا ترجمہ ہے واجب الوجود۔

آیت (۳) لم یلد و لم یولد:- یونانی فلاسفہ کے واجب الوجود سے عقول (عقل اول عقل دوم۔ عقل سوم یعنی دس تک) ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی قوتیں خارج ہوئیں۔ یعنی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے عقول عشرہ جو مثل واجب الوجود کے قدیم ہیں پیدا ہوئیں، اگرچہ یہ عقول بھی مادّہ سے پاک ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ واجب الوجود سے یہ عقلیں خارج ہوئیں یعنی یہ عقلیں واجب الوجود سے نکلیں۔ اس سے آگے ایک بڑی بھاری غلطی پیدا ہوئی کہ لوگ جس آدمی کو خدا کا بیٹا ثابت کرنا چاہتے ہیں اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس کی روح میں یہ عقلیں گھس گئی ہیں۔ یہ اِس لیے خدا کا بیٹا ہے کہ چونکہ عقل اول بلا واسطہ خدا سے پیدا ہوئی اور یہ شخص اس کا اوتار ہے تو اس حیثیت سے اس کو خدا کا بیٹا کہنا مناسب ہے۔ مگر یہ لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ درحقیقت کسی فلسفی کا یہ مطلب نہیں ہے۔

اِسلامی فلاسفہ اِن دس عقول کو خدا کی صفات کے طور پر مانتے ہیں اور وہ سلسلۂ عقلیات کو جسے ایک عقلمند فلسفی قائم کرنا ضروری سمجھتا ہے مسلمان فلسفی اللہ تعالیٰ کی صفات میں پورا کر دیتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ تمام بڑے فلسفیوں کا

مطلب بھی تھا۔

پھر صفات الٰہی سے متعلق اس غلط فہمی کو قرآن مجید نے اِس طرح رد کیا کہ نہ تو اس کا کوئی بیٹا ہے اور نہ اُس کا کوئی باپ ہے۔

آیت (۴) و لم یکن لہ کفواً احد :- اُس کے جوڑ کا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری چیز میں یہ قابلیت ہی نہیں ہے کہ اس کو تمام چیزوں کا مرکز مان لیا جائے۔

مولوی حمیدالدین صاحب نے اس سورت کو بادشاہ کے دستخط سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح دستخط پہچان کے طور پر ہوتے ہیں، اِسی طرح اللہ تعالیٰ کو پہچاننے کے لیے اِس جگہ چار صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ اور آئندہ دو سورتیں (معوذتین) اس کی ضمیمہ ہیں۔

جس طرح سورۃ اللہب سوشیل غلبہ کی دلیل ہے اسی طرح سورۃ اخلاص عقلیت کے غلبہ کی دلیل ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ پولیٹیکل طاقت سوشیل طاقت سے پیدا ہوتی ہے اور سوشیل طاقت فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کا فلسفہ اعلیٰ ہوگا اُس کی ذہنی قوتیں ضرور تکمیل کے درجے پر پہنچ جائیں گی اور ضرور ان کی معاشرت اور اقتصادی حالت بھی اچھی ہوگی کیوں کہ ذہنی قوتوں کا اثر معاشرت اور اقتصاد پر پڑتا ہے۔ اگر سوشیل حالت جو ذہنی قوتوں سے پیدا ہوتی ہے اچھی ہو گی تو اس سوشیل (یعنی معاشرہ اور اقتصاد کی اچھی حالت) سے جو پولیٹکل قوت پیدا ہوتی ہے وہ بھی اچھی ہوگی اور غلبہ پورا ہو گا۔

الحاصل قرآن مجید میں یہ دکھانا منظور تھا کہ قرآن مجید کی فتح ہوئی مگر اس فتح کو پولیٹیکل فتح تک محدود کر دینا کافی نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسلام کو پولیٹیکل تحریک سمجھا وہ یہی کہتے ہیں کہ اِسلام کا دور گذر چکا ہے (کیوں کہ آجکل اسلام کی پولیٹیکل طاقت نہیں رہی)۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ پولیٹیکل تحریک اور اس کی فتح فقط قرآن مجید کی تعلیم کا ایک حصہ ہے۔ اور پولیٹیکل تحریک اور غلبہ کی تہہ میں سوشیل طاقت کام کرتی ہے اور جو سوشیل پروگرام آج بھی دنیا میں موجود ہے اُس پر بھی قرآن مجید کا سوشیل پروگرام فتح مند ہے اور اسلام کے پروگرام کا اس پر بھی غلبہ ہے۔ اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی دنیا بھر میں اِسلام (قرآن) سے اچھا سوشیل پروگرام کوئی اور نہیں ہے۔

سوشیل (معاشرتی و اقتصادی) طاقت ہمیشہ عقلی فلسفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسلام کا فلسفہ تمام دنیا کی عقلیت پر غالب ہے۔ اس کے مقابلے پر فلسفے کا کوئی اسکول پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اسلام و انسانیت لازم و ملزوم رہیں گے۔ جب

تک دنیا میں انسانیت ہے اُس وقت تک اِس سطح زمین پر اسلام کا رہنا خود انسانیت کے لیے ضروری ہے۔

اس کو یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فلسفہ اچھا ہے مگر سوشیل حالت گری ہوئی ہے اور ہندوؤں کا فلسفہ ردی ہے مگر سوشیل حالت مسلمانوں کی بنسبت اچھی ہے، یعنی ایک حصہ سوشیل کا جو مال سے تعلق رکھتا ہے وہ اچھا ہے اب اگر مسلمانوں کی سوشیل حالت کی کوئی شخص اصلاح کر دے گا تو مسلمانوں کو اُسی وقت پولیٹیکل طاقت بھی حاصل ہوجائے گی۔ اور جس قوم کا فلسفہ ردی ہوتا ہے وہ اگر ترقی کرتی ہے تو جلد گر جاتی ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں فقط سوشیل حالت کے انقلاب سے بڑا انقلاب ہو سکتا ہے۔

مسئلۂ واجب الوجود کو ہم نے درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ اِس جگہ اُس کی تحقیق کی جاتی ہے:۔

انسان سب سے پہلے تصور کرتا ہے "ہونا" اور "نہ ہونا" یا "وجود" اور "عدم"۔ اور "ہونا" یا "وجود" ایک ہی چیز ہے۔ وجود کی دو قسمیں ہیں:۔ ایک وہ جو کبھی معدوم نہیں ہو سکتی اسے "واجب الوجود" کہتے ہیں۔ دوسری وہ ہے کہ معدوم ہو سکتی ہے، اسے "ممکن" کہتے ہیں۔ اِسی طرح "نہ ہونا" یا "عدم" کی بھی دو قسمیں ہیں:۔ ایک ایسا عدم ہے کہ اُسے کبھی وجود کی قسم میں تبدیل کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسے ممتنع الوجود (یعنی اس میں کبھی وجود آ ہی نہیں سکتا) کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم ایسی ہے کہ اُس کا وجود ہونا ممکن ہے، اسے "ممکن" کہتے ہیں۔ اِسی طرح "ہونا" یا "نہ ہونا" کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو تین قسمیں پیدا ہوتی ہیں:۔ (۱) "واجب الوجود" جس میں کبھی عدم آ ہی نہیں سکتا۔ اور اس کے مقابلے میں (۲) "ممتنع الوجود" جس میں کبھی وجود آ ہی نہیں سکتا اور (۳) "ممکن"۔ ممکن کی دو قسمیں ہیں اور دونوں قسمیں ایک ہی لحاظ میں آتی ہیں یعنی ہر ایسا وجود جو معدوم ہو سکتا ہے اور ہر ایسا عدم جو موجود ہو سکتا ہے۔ ان دونوں قسموں کو "ممکن خاص" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک "ممکن عام" ہے جس کی عمومی تفسیر کی جاتی ہے کہ ہر ایسی چیز جس کا وجود ممتنع نہ ہو۔ اُس میں "واجب الوجود" اور "ممکن خاص" دونوں آ جاتے ہیں، اس لیے کہ ان کا وجود ممتنع تو نہیں ہے۔

ممکنِ عام کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جس کا وجود ضروری نہ ہو اور فقط اتنی بات ہو تو اس میں "ممتنع" اور "ممکن دونوں آ جاتے ہیں۔ "وجود" اور "عدم" کے متعلق یہ عقلی تقسیم ہے۔ اس سے زیادہ عقل کوئی اور قسم تجویز نہیں

کر سکتی۔ اس میں اب "وجود" کا مرکز "واجب الوجود" ہے۔ اور "ممکن الوجود" چیزیں اس کے پرتو سے پیدا ہوں گی۔ "ممتنع الوجود" کا ہم صحیح تصور تک نہیں کرسکتے، اس کی ہستی، وجود سے اس قدر دور ہے کہ اس کے تصور کرنے کے لیے ہم چند فرضی چیزوں کے آلے بنا لیتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ادھورا سا خیال دماغ میں بٹھا کر احکام جاری کرتے ہیں۔

ممکن الوجود کی جو چیزیں ہیں اُن کی تقسیم اور ہے۔ ایک ایسا بھی ممکن الوجود ہے جس کے وجود کی ابتدا اور انتہا نہیں۔ اگرچہ وجود ان کو واجب الوجود کے فیض سے ملا ہے۔ اور دوسری ممکن چیزیں ایسی ہیں کہ ان کی ابتدا اور انتہا بھی ہے کہ پہلے نہیں تھیں، پھر ہوگئیں اور پھر نابود ہوگئیں وغیرہ۔ یہ مسئلہ بھی فلسفہ میں ایک طرح پر طے شدہ ہے کہ جس کی ابتدا نہیں، اُس کی انتہا نہیں ہوسکتی اور جس کی انتہا ہے اُس کی ابتدا ضرور ہو گی۔

"واجب الوجود" کے عوض قرآن مجید نے لفظ **صمد** لیا ہے۔ چونکہ واجب الوجود کا سمجھنا ایک خاص علمی اصطلاح پر مبنی تھا اِس لیے عام لوگ اس کے مخاطب نہیں ہو سکتے۔ اس لیے لغت میں سے ایک لفظ چھانٹ لیا گیا ہے جس کے اندر واجب الوجود کے معنے خود بخود آجاتے ہیں۔ یونانی فلاسفہ کہتے ہیں کہ جب ایک چیز کی حقیقت سمجھنی منظور ہو تو ارسطو نے اس کے متعلق دس سوال مقرر کر دیے ہیں کہ یہ دس سوال دریافت کر لو اس کے بعد اس کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ ان کے نام ہیں "مقولات عشرہ، یعنی (۱) وضع (مکان کی شکل سے نسبت ہے اور مکان سے اونچی چیز ہے۔ پہلا آسمان ہے اُس کے اوپر دوسرا آسمان ہے حتیٰ کہ سب سے آخری آسمان ہے۔ اُس کا جو اوپر کا حصہ ہے اُسے وضع کہتے ہیں)۔ (۲) آین (کہاں ہے) (۳) متی (کب سے ہے)۔ (۴) کیف (کیسا ہے)۔ (۵) کم (کتنا ہے)۔ (۶) الجوہر (قائم بالذات یعنی جو اپنے پر قائم ہے)۔ (۷) الاضافة (دوسرے سے کیا نسبت)۔ (۸) الملک (مثلاً کپڑا اور قمیص وغیرہ کسی کی ملکیت ہے) (۹) الفعل (دوسری چیز میں اثر کرنا)۔ (۱۰) الانفعال (دوسری چیز سے اثر قبول کرنا)۔ جب اِن دسوں کے جواب مل جائیں تو پھر اس چیز کو معین کہا جا سکتا ہے۔ اس کا نام ہے مقولات عشرہ۔ سوال اِس طرح ہو گا:۔ ماھو، پھر آین ھو، پھر متی ھو، علیٰ ھذا القیاس۔

اب دس عقول کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

سب سے اول واجب الوجود سے جو صادر ہو گا اُس کو "صادر اول" کہتے ہیں یعنی ظاہر ہوئی۔ ایک چیز جو چھپی ہوئی تھی وہ ظاہر ہوگئی۔ واجب الوجود میں سارے کا سارا وجود محفوظ ہے۔ اس کا کوئی حصہ ظاہر ہو جائے گا تو پھر اُس کا

اپنے موقع پر جانا ضروری ہے۔ واجب الوجود سے باہر وجود کا ایک ذرّہ بھی نہیں ملتا۔ اس لیے وجود کو یوں کہنا پڑے گا کہ وہ واجب الوجود سے صادر یعنی ظاہر ہوا۔ تو سب سے پہلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ نور محض ہے اور وجود کے جتنے حصے واجب الوجود سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صادر ہوتے رہیں گے وہ سب اسی صادر اول (نور محض) سے ظاہر ہوں گے۔ یعنی اب آئندہ تمام چیزیں اس صادر اول کے وسیلہ سے ظاہر ہوں گی اور واجب الوجود سے براہ راست ظاہر نہیں ہوں گی۔ اس کو عقل اول کہا جاتا ہے۔ یہ ظلمت اور جسمانیات سے پاک ہے۔ اس لیے اس کے لیے عقل کے سوا کوئی اور لفظ مناسب نہیں ہو سکتا۔ صادر اول (نور محض) کے مسئلہ میں دنیا کا کوئی عقلمند اختلاف نہیں رکھتا۔ تمام عقلمند اس کو اسی طرح مانتے ہیں۔ اگر کسی کا اختلاف ہوتا ہے تو صرف نام کا اختلاف ہوتا ہے۔ کسی عقلمند نے اس کا نام صادر اول رکھ دیا ہے اور کسی نے کچھ اور۔ (ہندو فلسفے میں اس کا جو نام ہے وہ اپنی جگہ بیان ہو گا) ورنہ حقیقت میں یعنے معنی کے لحاظ سے سب متفق ہیں۔ اس عقل اول کے بعد یونانی فلاسفہ نے جس طرح خاکہ کھینچا ہے اس پر تمام فلاسفہ کی موافقت ضروری نہیں ہے۔

یونانی فلاسفہ کو ستاروں اور آسمان کی رصد گاہ قائم کرنے میں سات سیارے معلوم ہوئے جو باقاعدہ حرکت کرتے ہیں:- (۱) سورج (۲) چاند (۳) زہرہ (۴) مشتری (۵) زحل (۶) مریخ (۷) عطارد۔ پھر ایک سیارہ دوسرے کو چھپا لیتا ہے جسے ہبوط کہتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں کہ سب سے پہلے چاند ہے اور سب سے آخر زحل ہے۔ ان کی حرکتیں باقاعدہ کرنے کے لیے ان کا تخیل اِس طرح پر ہے کہ ایک شفاف گول کرّہ ہے اور اس میں ایک ایک سیارہ ٹھونسا ہوا ہے۔ **یعنی** اس گول شفاف کُرّے کے اندر ایک ایک سیارہ قائم کردیا گیا ہے۔ ان کے ابتدائی نظریات میں یہ مقرر ہے کہ گول کرّہ کے سوا باقاعدہ حرکت اور کوئی نہیں کر سکتا۔ کرّہ اپنے مرکز پر ایک ہی قاعدہ سے متحرّک رہ سکتا ہے۔ چونکہ یہ کرّے ایک دوسرے کی نظر کو روکتے نہیں اور پردہ نہیں بنتے اس لیے ان کو شفاف مانا گیا ہے۔ اور چونکہ ان سیاروں کی حرکتیں گول نہیں ہوتیں اس لیے ہر کرّہ کے اندر ٹیڑھے کرّے اور فرض کرنے پڑے۔ اور اِس طرح ان کی حرکتوں کو باقاعدہ بنا دیا گیا ہے کہ مرکز ایک ہی رہے گا جس پر وہ حرکت کر رہے ہیں۔ اِسی طرح انہوں نے سات فلک مانے۔ فلک کہتے ہیں چرخے کے اس گول حصے کو جو مٹھی کے پھرانے سے پھرتا ہے۔

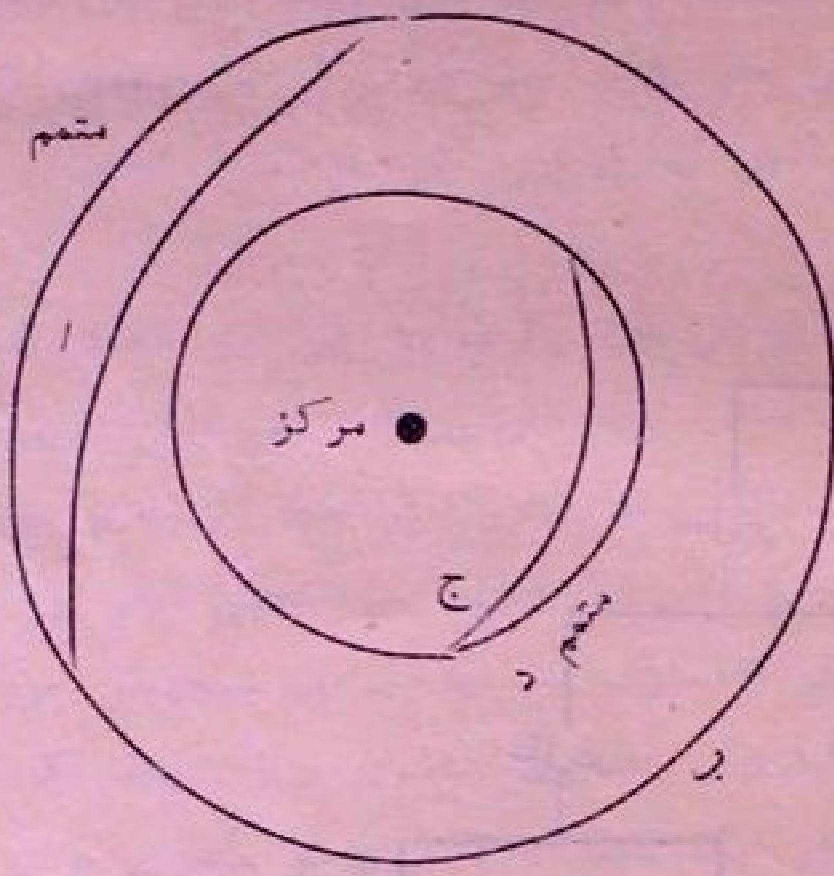

ب۔ بڑا گول شفاف کرہ۔ د۔ کرہ گول شفاف ج۔ یہ حصہ ٹیڑھا کرہ ہے اور حرکت کو باقاعدہ بنانے کے لیے بنانا پڑا ہے۔ الف۔ اس کا ٹیڑھا حصہ یعنی ٹیڑھا کرہ جو حرکت کو باقاعدہ بنانے کے لیے بنانا پڑا۔

غرض یونانی فلاسفہ نے دیکھا کہ بہت سے چمکنے والے ستارے اکٹھے حرکت کرتے دکھلائی دیتے ہیں تو اُن کو انھوں نے ثوابت کہا یعنے ایک جگہ ٹھونسے ہوئے۔ وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور حرکت نہیں کرتے۔ ان سات سیاروں کے علاوہ جس قدر چمکنے والے ستارے ہیں وہ ثوابت ہیں اور وہ ایک فلک میں ٹھونسے (گاڑے) ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اس طرح آٹھ فلک فرض کرکے ان ثوابت اور سیاروں کی خصوصی حرکتوں کو باقاعدہ کردیا۔

اب ایک چیز باقی رہ گئی کہ یہ دن رات کیسے ہوتے ہیں کہ ہم ۲۴ گھنٹے میں یہ تمام سیارے اِس چکر میں پھر جاتے ہیں۔ اس کے لیے ان کو ۹ فلک ثابت کرنے پڑے۔ ان کو "فلک اطلس" کہتے ہیں اور ان میں کوئی سیارہ نہیں ہے۔ تو اس طرح نو (۹) فلک مان کر انھوں نے موسموں اور دن رات کا صحیح "تخمینہ بنا لیا اور اپنا علم ہیئت مکمل کر لیا۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد ان کا ایک نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل اول سے دو چیزیں نکلیں (۱) عقل ثانی اور (۲) نواں فلک۔

یعنی یہ دونوں عقل اول سے نکلے۔ باقی عقول اور فلک ان سے اسی طرح بتدریج نکلتے گئے۔

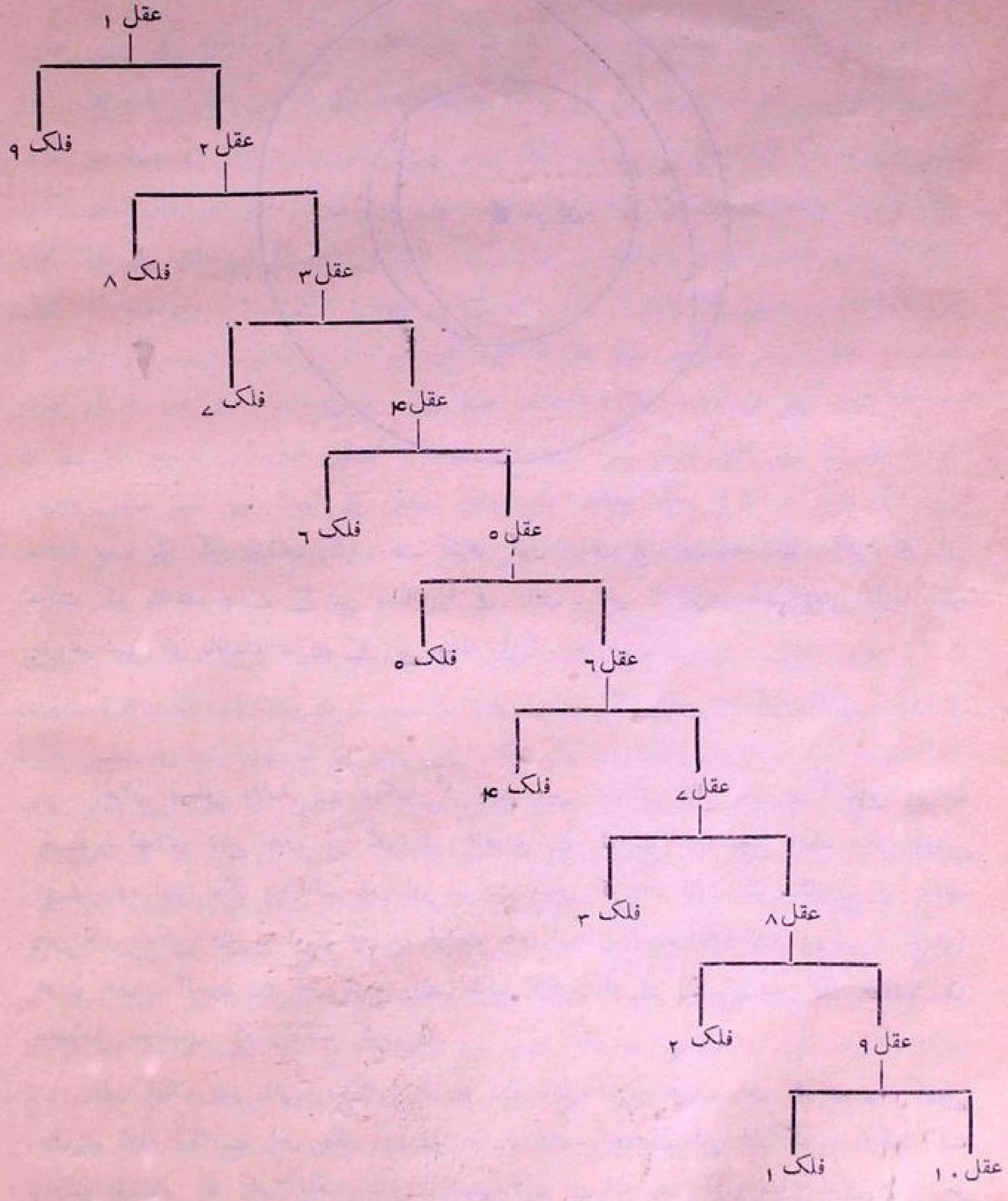

فلک نمبر ایک اور عقل نمبر دس کے نیچے عناصر ہیں اور ان کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے جسے اربعہ عناصر کہتے ہیں۔ ۱- ہوا، ۲- آگ، ۳- پانی، ۴- مٹی۔ یہ عقل نمبر ۱۰ نے پیدا کیے۔ غرض ان اربعہ عناصر کا مشترکہ مادہ عقل

نمبر ۱۰ سے پیدا ہوا۔ اسی پر فلکوں کی حرکتوں کا اثر پیدا ہوا اور اس پر مختلف رنگ پیدا ہونے شروع ہوئے۔ اس رنگ کو صورت کہتے ہیں جو مادہ، کا خاص رنگ لے کر ایک مخلوق بن جاتی ہے۔ سب سے پہلے چار صورتیں ظاہر ہوئیں جن کا نام اربعہ عناصر ہے۔ پھر انہی کی ترکیب سے معدنیات، نباتات، حیوانات اور انسان پیدا ہوئے۔ *

یونانی فلسفہ یوں تو بنی امیّہ کے زمانے ہی سے آہستہ آہستہ عربی میں داخل ہونے لگا تھا اور خاص خاص لوگ اس سے آشنا تھے لیکن خلیفہ مامون کے زمانے سے مستقل طور پر عربی میں منتقل ہوا۔ اور اسی خلیفہ کے زمانے میں عربی تراجم کی وجہ سے اس کا عام رواج ہوا۔ اور اسی زمانے سے مذہبی عالم اور حکیم دو حصوں میں بٹ گئے۔ اس سے پہلے فقط ایک نام تھا کہ جو سمجھدار ہوتا وہ فقیہ کہلاتا اور عام آدمی غیر فقیہ کہلاتے۔ ہمارے مفسرین نے دیکھا کہ قرآن مجید میں سات آسمانوں، ایک کرسی اور ایک عرش کا ذکر ہے تو حکمائے یونان کی طرح جنھوں نے (۹) نو فلک قرار دیے تھے انہوں نے بھی سات آسمان ایک کرسی اور ایک عرش ملا کر نو آسمان بنا دیے۔ یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہے۔ اس قسم کا ایک اور غلط استعمال ہوا وہ یہ کہ یونانی فلاسفہ نے چونکہ ہر فلک کو بارہ (۱۲) حصوں (ٹکڑوں) میں تقسیم کر رکھا ہے اور وہ ہر ایک حصہ کو بارہ برج کہتے ہیں تو قرآن مجید میں لفظ بروج (والسماء ذات البروج) کو بھی ہمارے مفسرین یونانی اصطلاح میں لے آئے۔ یہ دوسری غلطی ہے۔

یونانی فلاسفہ کا یہ نظریہ ہے کہ عقول اور افلاک کے لیے ابتدا اور انتہا نہیں ہے۔ یہ اگرچہ ممکن چیزیں ہیں مگر قدیم ہیں ان کا یہی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کو ماننے کے بعد جسمانی حشر اور جسموں کا جنّت اور دوزخ میں جانا ممکن نہیں رہ جاتا۔ اسی زمین پر ایک ٹکڑے کا نام جنّت اور دوزخ رکھ دیا جائے تو یہ قرآن مجید کی غلط تفسیر ہو گی اور افلاک پر جنّت ماننا اور افلاک کے نیچے دوزخ ماننا یہ اس نظریہ کے ماتحت معقول ہو ہی نہیں سکتا۔ اس قسم کی پیچیدگیوں نے مسلمان حکماء کا ایک ایسا طبقہ پیدا کردیا جو یونانی فلاسفہ کے ان نظریات کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف بنیادی چیزیں مان لیتے ہیں مگر جس شکل سے یونانی فلاسفہ ان کی تفسیر کرتے ہیں مسلمان حکماء ان کو نہیں مانتے۔ امام غزالی اِس قسم کے

---

* مجلس میں جب ادنیٰ درجے کے شاگرد موجود تھے تو مولانا نے تنزلاً یہ تقریر فرمائی اور میں تو:-

ع آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

حکماء کے ایک بہت بڑے پیشوا ہیں مگر بد قسمتی سے امام غزالی بھی یونانی نظریہ کے مقابل کوئی مکمل نظریہ پیش نہیں کر سکے۔ اس لیے مسلمان حکماء کی رائیں بھی کوئی صحیح قواعد پر مکمل نہیں ہو سکیں.

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ عقل اول کے ماننے میں کوئی فلسفی اختلاف نہیں کرتا مگر یونانی اس کے بعد نو (۹) عقول مانتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت کا نظریہ نو (۹) افلاک پر مرتّب ہوتا تھا۔ اگر ان میں کوئی ایسا عالم پیدا ہو جائے جو نویں فلک سے زیادہ ماننے پر مجبور ہو جائے تو وہ لازمی طور پر عقول بھی اسی قدر زیادہ مانے گا۔ مطلب یہ ہے کہ عقول کی تعداد کسی عقلی تقاضا سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ آسمانوں کی ایسی ہیئت معین کرنے کے بعد ہی ایسا خیال پیدا ہوا.

ہندوستان اِس مسئلہ میں کسی سے کم نہیں تھا۔ افلاطون کہتا ہے کہ ہماری ریاضی ہندیوں کے سوا اور کوئی جان ہی نہیں سکتا۔ آسمان کی اس ہیئت کے متعلق ہندوستانی نظریہ بالکل نیا ہے۔ اسے وہ ایک ایسا نورانی لطیف جسم مانتے ہیں جسے آکاش کہتے ہیں جو ہوا سے زیادہ لطیف اور سورج سے زیادہ نورانی ہے اور یہ عقل اول کا فیض ہے جو آکاش کو پیدا کیا ہے۔ آکاش میں یہ تمام سیارے تیر رہے ہیں۔ اور اس آکاش کی قوت کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ باقاعدہ حرکت نہیں کرتے۔ نو (۹) افلاک تو الگ رہے انہیں ایک فلک کو ماننے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور وہ کسی فلک کو نہیں مانتے۔ ہر متحرک چیز کے ساتھ وہ اس کی ایک خاص روح مانتے ہیں اور یہ کہ اس روح کے ذریعہ سے عقل اول کا فیض اس جسم تک پنہچتا رہتا ہے۔ اس کے بعد ہندو فلاسفر نے بھی اِس فضا کو جسے آکاش کہتے ہیں سات سیاروں کی طرح سات حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ فضا کے ایک طبقہ کو آسمان کہتے ہیں۔ یہ ہندی فلسفہ یا ہندی حکماء کی حکمت قدیم زمانہ سے لے کر آج تک چلی آتی ہے.

ایران دونوں فلسفوں (یونانی و ہندوستانی) کا مجموعہ تھا۔ قدیم زمانہ میں اهل عرب یونانی فلسفے کی بنسبت ہندی فلسفے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ امام غزالی کے بعد ایران میں ایسے عالم پیدا ہوئے جو اس ہندی فلسفہ کو جس کے ساتھ ایرانیوں کا بھی ایک حصہ موافق تھا خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ انہوں نے ارسطو کے فلسفہ کو رد کر کے اس کی جگہ اسلامی تشریحات کے لیے ہندوستانی فلسفہ (یا اسے ایرانی فلسفہ سمجھیے ایک ہی بات ہے) کو پیش کر دیا۔ اس میں ایک مشہور شخص شہاب الدین سہروردی مقتول رح تھے۔ یہ حکیم سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں گذرے ہیں۔ یہ ایک بڑے حکیم تھے اور ایرانی فلسفہ خوب جانتے تھے۔ انہوں نے

اسلامی تعلیمات کی تشریح ایرانی فلسفے کے مطابق کرنی شروع کی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ مامون الرشید کے زمانے سے لے کر اس زمانے تک جو علم الکلام مسلمانوں میں مرتّب ہو چکا تھا وہ ان نظریات کے مطابق تھا جو ارسطو وغیرہ کے نظریے تھے۔ یعنی ان کا علم الکلام شہاب الدین کے نظریات سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ شہاب الدین کے نظریات کے تحت اسلامی تعلیمات بہت وضاحت سے سمجھ میں آسکتی تھیں۔ جن مسائل کو متکلم حل نہیں کر سکتے تھے یہ نہایت آسانی سے ان کو حل کردیتے۔ مگر بد قسمتی سے سلطان صلاح الدین اس پہلے یونانی فلسفے پر جس پر مسلمانوں نے اپنی عمارت کھڑی کی تھی شرعی طور پر عقیدہ رکھتا تھا۔ اس لیے علماء نے سلطان صلاح الدین کو سمجھایا کہ شہاب الدین اسلام کی تردید کرتا ہے۔ اس واسطے انہیں قتل کردیا گیا۔

اس کے بعد ہلاکو کا بغداد پر حملہ ہوا۔ اس زمانہ میں اس کا وزیر نصیرالدین طوسی تھا جو مذھباً شیعہ تھا اور ارسطو کے فلسفہ کا معتقد تھا۔ ابن سینا جو ارسطو کے فلسفے کا اچھا شارح ہے، اس کے فلسفے کا معتقد تھا۔ ہلاکو کی سلطنت کے ساتھ ساتھ نصیرالدین طوسی کا علمی عروج انتہا تک پہنچا۔ اب علماء اور حکماء اھل سنت والجماعت بہت پریشان ہوئے کہ اگر وہ ارسطو کے فلسفے کو رواج دیتے ہیں تو اس کے اندر شیعہ پن رواج پاتا ہے۔

نصیرالدین طوسی کا شاگرد علامہ قطب الدین شیرازی ہے۔ اس نے شہاب الدین کے فلسفے کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ شہاب الدین مقتول کا فلسفہ جو دراصل ھندوستانی فلسفہ تھا قطب الدین شیرازی کی تشریح کے بعد علماء میں بہت مقبول ہو گیا۔ علماء کو سب سے زیادہ فائدہ یہ ملتا تھا کہ اس سے انسان شیعہ نہیں بنتا تھا۔ ایرانی حکماء اس زمانہ میں قدیم ایران پر فخر کرتے تھے اور ان کا مقابلہ تاتار سے تھا۔ اس واسطے تاتار کے مقابلہ میں ایرانی حکماء میں نیشنلزم پیدا ہو گئی جو پہلے دبی ہوئی چیز تھی۔ یہ پہلے اسلام سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے مگر اب وہ زور پکڑ گئے۔ اس کی تاثیر سے شہاب الدین مقتول کا فلسفہ (جسے ھندوستانی یا ایرانی نام سے تعبیر کیجیے) زیادہ پھیل گیا۔

علامہ قطب الدین شیرازی کے بعد اس فلسفہ کا سب سے بڑا علمبردار جلال الدین دوانی ہے جو شیراز کا ایک زبردست عالم تھا۔ جلال الدین دوانی کا شاگرد میر فتح اللہ شیرازی ہے جو اکبر بادشاہ کا نورتن تھا۔ یعنی ایک واسطے سے وہ جلال الدین دوانی کے شاگرد کا شاگرد ہے۔ اسی طرح شیخ مبارک (ابوالفضل اور فیضی کا باپ) جلال الدین دوانی کے دوسرے شاگرد کا شاگرد ہے۔ میر فتح اللہ اور شیخ مبارک نے

جب شہاب الدین مقتول کے فلسفہ پر نظر ڈالی اور اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے ہندوؤں کا فلسفہ دیکھا تو اُنہیں علم ہوا کہ وہ یونانی فلسفہ کے زمانہ میں ایک نہر کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور اب ہندوؤں کے فلسفے کے زمانے میں ایک سمندر کے کنارے پر تھے۔ اکبری دربار کے انقلاب کی یہی روح تھی۔

اس فلسفہ کے رواج سے ہندوستان میں مذہبی قوت کو جس قدر صدمہ پہنچ سکتا تھا پہنچا۔ اور امام ربّانی رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کی تلافی کردی۔ اور اس صدمہ سے ہم کو بچا لیا۔ امام ربّانی رح، کی زیادہ تر توجہ اشراق (کشف) سے متعلق ہے۔ اشراق کا مطلب ہے طلوع نور جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور یہی مطلب کشف کا ہے۔ امام ربانی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں میں ایسے فاضل پیدا ہوئے جو یونانی اور ہندوستانی فلسفہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور جلال الدین دوّانی کی تحقیقات اسلامیہ کے ماہر تھے۔ اس جماعت کے علمبردار بعد میں شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے اپنا اِسلامی فلسفہ مکمل کر لیا جس میں بعض چیزیں ارسطو کی باقی رہ گئیں اور باقی چیزیں ایرانیوں سے لیں اور بعض چیزیں ہندو فلسفے سے اخذ کر لیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز مکہ میں دینی علوم کے بہت بڑے ماہر تھے اِس لیے وہ ہر جزوی مسئلہ کو تفصیل سے بیان کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے ہاں افلاک کا نظریہ باقی نہیں رہا۔ اُن کے ذہن کو ہندی اور یونانی فلسفہ زیادہ اپیل کرتا ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب مرحوم نے ستاروں کو قرآن کے ترجمہ میں " تیرتا ہوا " ذکر کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز کے زمانہ کے بعد ہندوستان کا یورپین سائنس سے تعارف ہوا۔ اس حملہ کی برداشت فقط شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفہ میں تھی مگر بدقسمتی سے جس طرح مسلمانوں کی سیاست بکھر گئی تھی اسی طرح اُن کی علمی قوّت بھی پریشان (منتشر) ہو چکی تھی۔ اس واسطے وہ ایک راستہ سے جلدی سے سیدھے نہیں چل سکے۔

سر سید اور اُن کے ساتھیوں نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ سے کام لینا شروع کیا۔ ان کے فلسفے میں اُن کو بہت سی ایسی چیزیں ملیں جن کا چھوڑنا ضروری تھا۔ اس کے عوض وہ یورپین فلاسفی کی نئی چیزیں پیش کر سکتے تھے۔ اس سے عام مذہبی طبقہ بھڑک اُٹھا۔ جس طرح سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں ہوا تھا یعنی ایک طرح کا جمود پیدا ہوا تھا۔ نئی تحریک سے پہلے سر سید کی اوائلی تعلیم و تربیت شاہ ولی اللہ کے اسکول میں ہوئی۔ سر سید نے (۱) شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین (جو شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے) سے تعلیم حاصل کی۔ اور (۲) مولانا مملوک علی صاحب سے بھی جو مولانا رشیدالدین کشمیری، پرنسپل عربک کالج دھلی

کے شاگرد تھے۔ پھر (۳) عقلی اور ادبی فنون شاہ رفیع الدین سے حاصل کیے جو شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی تھے۔ مولانا رشیدالدین صاحب کشمیری کو شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر تربیت دی تھی۔ اور انہوں نے اسی طرح مولانا مملوک علی کو تیار کیا تھا۔ مگر سرسید کے تمام ساتھی اس اسکول کے نہیں ہیں۔ جس قدر فرصت ایک نئے فلاسفر کو ایک نیا نظریہ سوچنے کے لیے ملنی چاہیے ہمارا خیال ہے کہ سیاسی جھمیلوں کی وجہ سے سرسید کے لیے ممکن نہیں تھی۔ اگر سید محمود کی زندگی دوسرے طریقہ سے نکمّی نہ بنا دی جاتی تو ہمارا خیال ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں صحیح اور بہترین فلاسفر ہوتے اور یورپ کے سامنے اسلام کو پیش کرنے کی اُن میں سب سے زیادہ قابلیت ہوتی۔ انہیں چند اسلامی مسائل پر غور کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنے والد کی تمام خامیاں دور کر دیں اور جس عالم نے اُن کی بات سنی وہ عش عش کرنے لگا۔

مولوی عبدالحق صاحب دہلوی (مفسر حقانی) ایک دفعہ سرسید کے ہاں مہمان تھے۔ سرسید اُن کو جب کالج کی عمارت دکھلا کر واپس کمرے میں لائے تو سرسید نے کہا مولانا! یہ عمارت آپ کو رو رہی ہے (یعنی آپ کے جھگڑوں کے سبب ناقص رہ گئی ہے) تو مولانا عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ اس قسم کا یورپین فلسفہ مسلمانوں کے سامنے پیش نہ کرتے تو مسلمان آپ کو یہ کالج سونے کا بنا دیتے۔ اُس وقت سید محمود صاحب نے جو دوسرے کمرے میں تھے یہ بات سنی تو آکر کہا کہ مولانا میں اِن مسائل میں اپنے والد کے ساتھ نہیں ہوں۔ مگر افسوس کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ سید محمود نے اِسلامی فقہ پر جو تھوڑا بہت لکھا ہے وہ ایک بہترین نمونہ ہے۔

سرسید کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ کے پس ماندہ لوگوں میں ایک حکیم پیدا ہوئے جن کا نام مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز تھا۔ وہ مدرسہ دیوبند کے بانی اور علوم اِسلامیہ کے ازسرنو اشاعت کرنے والے تھے لیکن آپ کے دماغ میں سیاسی مخالفت کی تلخی نے گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ آپ یورپین سائنس پر غور کرتے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آپ شاہ ولی اللہ صاحب کے اسکول کے بہترین ترجمان تھے اور آپ نے اپنے شاگردوں کی ایک کافی تعداد چھوڑی۔ آج ہندوستان کی مذہبی علمی قوّت کا اچھا بقیہ وہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو شاہ ولی اللہ صاحب سے مربوط جانتے ہیں۔

سُورة الفلق مَدنيّة وَهِىَ خمسُ آياتٍ

سوره فلق مدینہ میں نازل ہوئی اور اِس کی پانچ آیتیں ہیں

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

شروع الله کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ (۱) مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ (۲) وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا

تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی، ہر چیز کی بدی سے جو اُس نے بنائی اور بدی سے اندھیرے کی جو

وَقَبَ (۳) وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِى الْعُقَدِ (۴) وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (۵) ع ۱ ۳۸

سمٹ آئے اور بدی سے عورتوں کی جو گرھوں میں پھونک ماریں اور بدی سے بُرا چاہنے والے کی جب لگے ٹوک لگانے.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

سورۃ الفلق مکیۃ او مدنیۃ

سورۃالفلق اور سورۃالناس کی یہ تفسیر حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ العزیز کی تقریر کا خلاصہ ہے۔ یہ تفسیر مولانا شبیر احمد صاحب نے حاشیۂ ترجمہ مولانا شیخ الہند قدس سرہ‌العزیز پر لکھ دی ہے.

فلسفہ کا اہم حصہ یہ ہے کہ تمام کائنات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ اس کے متعلق اِس سورت میں بحث ہے۔ یعنی تمام مخلوقات کو ایک مرکز سے ربط دے دینا اِس سورت میں بتلایا گیا ہے.

یہ ایک فطری بحث ہے کہ تمام کائنات میں انسان اپنی ضرورت کے مطابق اِن چیزوں کے متعلق غور کرتا ہے اور اِس سے زیادہ اس میں دماغی قوت ھی نہیں یعنی جن چیزوں کی اسے ضرورت ہے اُنھی کے متعلق وہ غور کرتا ہے اور باقی کے متعلق نہیں کرتا۔ کیونکہ انسان میں یہ فطری تقاضا ہے کہ پہلے وہ شر سے بچنے کی تجویزیں سوچتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تم اپنی توفیق، طاقت اور استطاعت کے موافق اطاعت کرو اور جس سے میں منع کروں اُس سے بالکل ھٹ جاؤ، کیونکہ ضرر دینے والی اشیاء سے بچنا ضروری ہے۔ جب شر سے بچ گیا تو آگے منفعت کے ھزاروں دروازے کھلے ھوتے ھیں۔ گویا یہ سورت فلسفۂ وحدت‌الوجود کا تتمہ ہے جو سورۃ اخلاص میں تھا.

آیت (۱) **قل اعوذ برب الفلق** :- چیر کر پیدا کرنے والے کی پناہ میں آتا ھوں۔ تمام مخلوقات ایک دوسرے سے چیر کر پیدا ھوتی ہے۔ چیر کر پیدا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ھی ہے۔ اُس کی پناہ میں آتے ھیں کہ دنیا کی کوئی چیز ھمیں ضرر نہ پہنچائے۔ ھر چیز کے اول درجہ کا فائدہ یہی ہے کہ اُس سے ضرر نہ پہنچے۔ مادّہ جب مرکّب ھوتا ہے تو اُس کے لیے صورت لازمی ہے اور وہ تیسری چیز بن جاتی ہے۔ یعنی مادّہ و صورت مل کر تیسری چیز بن جاتی ہے یہ **خلق** ہے.

آیت (۲ تا ۴) **من شر ما خلق و من شر غاسق اذا وقب الآیات** :- مخلوقات کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اِن آیات میں ایک ایک حصہ کا ذکر کیا

گیا ہے۔ مگر اتنے مشکل مضمون کو آسان کرنے کے لیے انسان کو نبات فرض کر لیا گیا ہے۔ جیسے آم یا کھجور کا درخت۔ جب انسان کو نبات کی حیثیت میں فرض کر لیا گیا تو اب یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسے کون سی چیزیں نقصان پہنچاتی ہیں۔ ان پر اب درجہ وار بحث ہو گی۔

درخت کے لیے سب سے پہلے وہ چیز نقصان دہ ہے جو سبزہ (نباتات) کو کھا جائے یعنی اس چیز کو اس سبزہ کے کھانے سے فائدہ ہو اور نباتات کو نقصان ہو۔ سبزہ خور جانور نباتات کو اِس غرض سے نہیں کھاتے کہ نبات (سبزہ) کو نقصان پہنچائیں بلکہ اِس واسطے کھاتے ہیں کہ اُن کی ضرورت اِس سبزے سے پوری ہوتی ہے۔ اِسی واسطے کاشتکار کھیتی کے اِرد گرد باڑ بنا لیتے ہیں تاکہ سبزہ خور جانور سبزہ نہ کھا سکیں۔

من شر ما خلق :- اِس آیت میں ارشاد ہے کہ ہر اُس چیز سے جو شر سے پیدا کی گئی ہے۔ عربی ترکیب اگر اس طرح کی ہو جس طرح اِس آیت میں ہے تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کی پیدائش کا تقاضا ہے کہ ہمیں ضرر پہنچائے جیسے سانپ، بچھو وغیرہ۔ اِس قسم کی تمام مخلوقات کے شر سے ہم اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔

و من شر غاسق اذا وقب :- ڈوبنے والی چیز جس سے تاریکی پیدا ہو۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ہے **غاسق**۔ اس سے اشارہ ہے تمام ایسی قوتوں کی طرف جن کے نہ ہونے سے ہمیں ضرر پہنچے۔ جیسے نباتات کو پانی یا غذا نہ ملے تو وہ سوکھ جاتے ہیں اور چاند کی روشنی نباتات کو ایک طرح کی زندگی بخشتی ہے تو جب یہ گم ہو جائے گی تو زندگی کا ذریعہ نہ ہونے سے نباتات کو ضرر پہنچے گا۔ اِسی طرح ہماری ضروریاتِ زندگی نہ ہونے سے جتنے ضرر ہمیں پہنچ سکتے ہیں اُن سے بھاگ کر ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں کہ وہ ہمیں ان ضرروں سے بچائے اور ہماری زندگی کی جس قدر ضروریات ہیں انہیں ہمارے لیے مہیا کر دے۔

آیت (۴) **و من شر النفّاثات فی العقد*** : اور ہمیں ان جماعتوں کے شر سے بچا

---

* نبات یا اشجار جب دو پتّی ہوتے ہیں تو اس جگہ گرہ ہوتی ہے، پھر اشجار میں جہاں شاخ نکلتی ہے وہاں گرہ ہوتی ہے تو ان گرہوں کے زور اور طاقت سے پانی صاف ہو کر اوپر جاتا ہے اور پھر وہ بار آور ہوتے ہیں۔ انسان کے اعتقادات بھی اسی طرح ہیں۔ اگر ان اعتقادات میں کسی کی نفث سے خرابی آجائے تو اس کی تمام ترقی بند ہو جاتی ہے **حبطت اعمالہم**۔ اعمال کے وزن، ثقل اور عفت کی بنا اعتقادات پر ہیں۔ بغیر اعتقاد کے عمل **ھباءً منثوراً** ہیں۔ انما الاعمال بالنیات۔

جو پھونک مار مار کر عقلی عقیدے کو کمزور کردیتے ہیں۔ ہمارے مفسرین یہاں کئی روایتیں لکھ دیتے ہیں جن کی صحت کے متعلق ہمیں اس جگہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان سے جو نتیجہ وہ نکالتے ہیں وہ قرآن مجید سے ربط نہیں کھاتا۔ جیسے ایک عورت جادوگرنی فرض کر لی جاتی ہے (بقول انکی روایت کے) کہ وہ اپنی بتوں سے جادو کراتی ہے اور اب قرآن مجید میں اس کے شر سے پناہ مانگی جا رہی ہے۔ اس کی اس قسم کی تاویل اگرچہ ہو سکتی ہے کہ اس کا آیت سے تعلق پیدا کردیا جائے مگر ہمارا ترجمہ بہت صاف ہے۔ اس آیت سے جادوگرنیاں مراد لینا قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا۔ اور یہ قرآن یا نبوت کی شان کے خلاف بھی ہے۔ ہم عورتوں کی جگہ جماعتوں کو لیتے ہیں اور جماعت کو عربی میں مؤنث کے صیغے میں لیا جاتا ہے یعنی اُن جماعتوں کے شر سے پناہ مانگی جاتی ہے جو اپنے غلط پروپیگنڈے سے انسان کی فطری ترقی کو روکتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا گیا کہ یورپین اقوام بہت بڑی چیز ہیں اور ہندوستانی ان کا کبھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس غلط پروپیگنڈے نے ہماری ذہنیت برباد کردی، ہماری کمر توڑ دی اور ہمیں پست ہمت بنا دیا، حتیٰ کہ ہم اپنی ہستی کو بھول گئے۔ اس کی مثال عام نباتات میں ایسی ہو گی جیسے اوپر سے برف گر رہی ہو۔ اس طرح کا جو پروپیگنڈا ہوتا ہے، اسے عربی میں جادو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی تندرست ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ کام نہیں کر سکتا۔ حالانکہ وہ کام اسکی طاقت کے اندر ہے، اس حالت کو عربی میں جادو سے تعبیر کیا جائے گا کہ اس پر سحر ہوگیا ہے اور پروپیگنڈے کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ صرف ایک آدمی ہی نہیں بلکہ قوموں کی قومیں سمجھنے لگ جاتی ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے حالانکہ وہ سب کچھ کرسکتی ہیں۔ تو ایسی تمام طاقتیں جو باہر سے اثر ڈال کر ہماری ترقی کو روک دیں، ہم ان کے ضرر سے خدا کی پناہ میں آتے ہیں۔ گندم کے کھیت میں جو عقدہ ہوتا ہے وہ اچھا پانی جمع کر کے آگے پہنچاتا ہے۔ یہاں تک کہ انتخاب در انتخاب سے دانہ ہوتا ہے لیکن اگر کیڑا بھی اس عقدہ میں لگ جائے اور وہ اپنے زہریلے سانس کی پھونک لگائے تو گرہ اور عقدہ سست ہو جائے گا، پھر نباتات بڑھ نہیں سکتیں اور خوشہ پیدا نہیں ہوتا۔

آیت (۵) **و من شر حاسد اذا حسد** :- حاسد کو یہ تکلیف ہوتی ہے کہ فلاں آدمی کو یہ نعمت کیوں ملی، یہ چیز مجھے ملنی چاہیے تھی یعنے اس سے چھین کر اس (حاسد) کو ملنی چاہیے تھی۔ یہ ہے حاسد کی تعریف۔ (اگر انسان کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھے اور ایسی چیز کی تمنّا کرے تو یہ حسد نہیں ہے)۔ غرض

حاسد کو نظام قدرت پر اعتراض ہوتا ہے کہ اس شخص کو یہ چیز کیوں دی گئی، اس کے بجائے مجھے کیوں نہیں دی گئی۔ اس کی مثال یوں ہو سکتی ہے کہ کسی شخص کو کاشتکار سے دشمنی ہے اور فقط اس دشمنی کے باعث وہ نباتات کو کھیت سے اکھاڑ کر باہر پھینک دیتا ہے، حالانکہ اسے نباتات سے کسی قسم کی دشمنی نہیں تھی۔ اسی طرح ایسی چیزیں جن کو نظامِ قدرت پر اعتراض ہے اور محض اسی لیے وہ ہماری دشمنی پر آمادہ ہوتی ہیں، ہم ان کے ضرر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس طریقہ سے ہم نے تمام مخلوقات پر ایک اجمالی نظر ڈالی ہے اور انہیں اپنے نفع کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر حصہ سے نفع حاصل کرنے کی اصل قوت ہم اللہ تعالیٰ میں ثابت کرتے ہیں اور اسی کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس طرح عام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ کی طرف ربط دینے کی قوت ہمارے اندر پیدا ہو جائے گی اور اس سورت میں یہی مقصد تھا کہ ایک ایسی مثال پیدا کر دی جائے کہ انسان تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع کر سکے۔

سُوْرَةُ النَّاس مدنية وهى ست آيات

سورۂ ناس مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی چھ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱) مَلِكِ النَّاسِ (۲) اِلٰهِ النَّاسِ (۳) مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۵

تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی لوگوں کے بادشاہ کی لوگوں کے معبود کی، بدی سے اس کی جو پھسلائے

۱ ع ۳۹ اَلْخَنَّاسِ (۴) الَّذِىْ يُوَسْوِسُ فِىْ صُدُوْرِ النَّاسِ (۵) مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ (۶)

اور چھپ جائے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں جنوں میں اور آدمیوں میں۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم○

سورۃ الناس مکیۃ او مدنیۃ

سورت قل اعوذ برب الفلق میں تمام مخلوقات کو مرکز یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف ربط دے دیا اور اب یہ مطلب ہے کہ تمام انسانیت کو اس مرکز یعنی اللہ تعالیٰ سے ربط دے دیا جائے۔ یہ ہے فلسفے کا مطلب کہ آخر میں انسانیت کو مرکز سے ربط دے دیا جائے, تو فلسفہ مکمل ہو گیا یعنی ایک مرکز ثابت کرکے (قل ھو اللہ) پہلے بڑے نظام کو اس سے ربط دیا جائے اور آخر میں انسانیت کو بھی اس سے ربط دے دیا جائے.

آیت (۱ تا ۳) قل اعوذ برب الناس، ملک الناس، الہ الناس :- اللہ تعالیٰ کے تین نام بتلائے گئے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسانیت کا ربط واضح ہو جاتا ہے۔

(۱) قل اعوذ برب الناس :- لوگوں کے پالنے والے کی پناہ میں آتا ہوں۔ وہ انسانیت کا رب ہے اور انسانیت کے لیے جس قدر سامان پرورش چاہیے وہ سب کچھ دیتا ہے۔ اس کا نمونہ ماں باپ ہیں کہ انسان ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کی پرورش کرتے ہیں۔ اس سے وہ ایک مفہوم لیتا ہے اور اس مفہوم اور معنے کو تربیت سمجھتا ہے۔ ماں باپ کی جتنی قوت ہے وہ بہت تھوڑی اور محدود ہے اور احاطہ بھی ان کا چھوٹا ہے۔ بچپن میں آدمی اسی تربیت کو اپنے خیال میں بہت کافی سمجھتا ہے۔ مگر جب انسان ذرا بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی اتنی ضرورتیں ہوتی ہیں کہ ماں باپ ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ اور اگر پورا کریں، تو بھی اس کی عقل اور دماغ اطمینان حاصل نہیں کرتا اور نہ اس کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میرے ماں باپ محنت کر کے کچھ حاصل کرتے ہیں اور میری حالت یہ ہے کہ میں مفت خوروں کی مانند ان کے ساتھ لگا ہوا ہوں۔ اسے اپنی یہ حالت ناگوار گزرتی ہے تو وہ اپنی ذمہ داری پر کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اسے اپنے کام میں ایسی مشکلات درپیش آتی ہیں کہ ان کو اس کے ماں باپ حل نہیں کر سکتے۔ پھر وہ اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف منعطف کرتا ہے اور اسی کو پکارتا ہے۔ اس وقت اس کی مشکل حل ہو جاتی ہے اور اس حالت میں وہ اپنے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب (پالنے والا) سمجھتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ میرا رب میرے ساتھ ہے.

جس انسان نے اپنی عقل اور تجربہ سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مان لیا اس کو ہم اهل اللہ کہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ سنی سنائی باتوں سے اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتا ہو بلکہ اپنی عقل اور تجربہ سے اسے اپنا رب جانتا ہو۔ مثلاً اس شخص نے اپنے ماں باپ کو دیکھا کہ ان کے کام بھی اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور اس کی پرورش بھی وہی کرتا ہے تو اس فہم و فراست کے ساتھ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ شخص ولی اللہ ہے۔

آیت (۲) ملک الناس :- اس کے بعد انسان کی دوسرے درجے کی ترقی ہے کہ وہ خاندان سے نکل کر سوسائٹی کا میمبر بن جاتا ہے اور سوسائٹی اپنا نظام قائم کرنے کے لیے اپنا ایک بادشاہ بنا لیتی ہے۔ تو اس سے انسان ایک نیا مفہوم لیتا ہے کہ ایک ہے بادشاہ اور دوسری ہے رعیت تو یہ اپنے آپ کو اس سوسائٹی کے سربراہ کی رعیت مانتا ہے۔ ایک حد تک اس کی ضرورتیں اس نظام میں پوری ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کا دل و دماغ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ اس موجودہ سوسائٹی پر قانع نہیں رہ سکتا اور وہ اس سے اونچی سوسائٹی پیدا کرنے کی ہمت کرتا ہے اس لیے وہ تمام انسانیت کے بادشاہ یعنے اللہ تعالیٰ سے رجوع ہوتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت اسی بارگاہ میں مطمئن ہو سکتی ہے۔

آیت (۳) الہ الناس :- انسان کی جو مجموعی خواہشیں ہیں ان کی ترقی سوسائٹی اور بادشاہ تک ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد انسان کی ذہنی ترقی باقی رہتی ہے اور وہ ہر اس چیز سے جس میں وہ دلکشی کا سامان پاتا ہے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

دنیا میں بہت سی چیزیں محبوب ہیں اور ان سے انسان ترقی کرتا ہے۔ گویا ایک محبوب کے بعد دوسرے محبوب سے محبت کی اور اسی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔ انسان کو آخر درجہ کی ایسی صورت میسر آسکتی ہے کہ ایک اس کا باپ ہے پھر بادشاہ ہے اور پھر جتنی چیزوں کو یہ شخص دوست رکھ سکتا ہے وہ موجود ہیں۔ یعنی اس کا محبوب دوست مل جاتا ہے تو اس پر انسانی طبیعت کافی حد تک اطمینان اور سکون میں رہتی ہے۔ مگر انسانی زندگی محدود ہے۔ اس کو ذہنی بے چینی ہوتی ہے اور تکلیف ہوتی ہے تو اب اگر اس کا اللہ تعالیٰ سے ایسا تعارف ہو جائے جو تمام محبوبوں سے زیادہ محبوب ہے تو اس کی ترقی اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہے اور وہ بے انتہا ترقی کر سکتا ہے اور یہ محبت کا سلسلہ رک نہیں سکتا۔ یہی صفت ہے جسے اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ تمام انسانیت کا محبوب ہے۔ انسان کا ان تین صفتوں میں اللہ تعالیٰ سے تعلق ہو تو اس کی عقل کو پوری غذا مل جائے گی۔ اس محبت کو عام فہم بنانے کے لیے ضرر سے بچنے کا سامان بنا دیا گیا ہے کیونکہ انسانی طبیعت

ابتدا میں نفع اور نقصان کے سوائے کسی اور چیز کو نہیں سمجھ سکتی۔

آیت (۴) **من شرالوسواس الخناس** الآیہ:- پروپیگنڈے کی تشریح جس طرح پہلے کی جا چکی ہے (سورۃ الفلق میں) ایسی ہی تشریح یہاں بھی آتی ہے۔

محبت کی وجہ سے انسان کو ملامت کرنا سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ہے۔

ع ملامت شحنۂ بازارِ عشق ست

اب اگر انسان کو اس کے محبوب سے ہٹانے والی کوئی جماعت ہو جو چاہے کہ اس کی یہ محبت نہ رہے تو اس جماعت کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اسے اس کے محب سے ہٹانے میں ایک ضغطہ پیدا کرتی ہے۔ اس کو وسوسہ کہا جاتا ہے یعنے اس کے دل میں ایسے خطرات وقتاً فوقتاً پیدا کرتی ہے جس سے وہ محبت میں پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس واسطے ہم اس عقیدے سے ہٹانے والی جماعت کے شر سے اور اس تعلق کو کمزور کرنے والی جماعت کے شر سے (جو وسوسہ ڈال کر اور طبع میں جس وسوسہ سے خطرات پیدا ہوں ان کو قلب میں ڈال کر پھر الگ ہو جاتی ہے) اپنے رب بادشاہ اور محبوب کی پناہ میں آتے ہیں۔ چونکہ وہ وسوسہ نہایت ملامت دہ چیز ہے (تکلیف دہ) اس لیے وہ ہمیں ایک ایک نقطہ پر ایذا دے گا لیکن اگر ہم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہمارا اپنے رب سے دائمی تعلق پیدا ہو جائے گا۔ پہلے بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اپنی عقل اور تجربہ سے اپنے اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے اسے ہم اہل اللہ کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ سے دائمی محبت پیدا کر لے اسے ولی اللہ کہیں گے اور انسانیت کی یہ آخری ترقی ہے۔ انہی لوگوں میں سے جو اللہ تعالیٰ کے دوست ہوتے ہیں فرشتے اور مقرب درگاہِ الٰہی کے اور سب کچھ ہوتے ہیں۔ یعنے محدثین اور ملہمین اور انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین۔

وسوسے سے بچنے پر ہم نے بات کو ختم کر دیا تھا اب اس کا ذکر آتا ہے:-

آیت (۴) **من شرالوسواس** :- وسوسہ ڈالنے والے شخص یا جماعت کا نام وسواس یعنے ہمیشہ وسوسہ ڈالنے والی جماعت اور اس کا کام بھی یہی ہے۔ **الخناس** وہ ہے کہ جب اس پر حملہ کیا جائے تو وہ چھپ جائے یا چھپنے والی طاقت۔ وہ اِس طرح پیش آتی ہے کہ انسان اس پر حملہ نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ بعض وقت اس کو اپنا دوست سمجھتا ہے کہ یہ مجھ کو خیر خواہانہ مشورہ دے رہا ہے۔ وہ کسی وقت ایسی بات بھی کہہ دیتا ہے کہ انسان کی ادھر توجہ نہیں ہوتی اور اس سے درحقیقت محبتِ الٰہی میں نقصان آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

آیت (۵) **الذین یوسوس فی صدورالناس** :- وہ طاقت یا جماعت جو تمام انسانوں

کے سینے میں وسوسہ ڈالتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ وسوسہ ڈالتی ہے، ہمیشہ وہ یہی کام کرتی ہے۔

آیۃ (۶) **من الجنة و الناس**:- وہ طاقت جنّات اور آدمیوں میں سے ہے۔ جنّات کے معنے چھپی ہوئی طاقت۔ چند آدمی جو ظاہری طور پر وسوسہ ڈال رہے ہیں وہ تو آدمیوں میں سے ہیں اور چند ایسی چھپی ہوئی طاقتیں اور جماعتیں ہیں جو خفیہ طور پر وسوسہ ڈالتی ہیں اور یہ دونوں بہت زور شور سے اپنے کام میں مصروف ہیں اور برسات کی طرح خطرات کی بارش کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ ہم ان کے وسوسے کے شر سے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جب ہم نے وسوسہ کی جڑ ہی کاٹ دی تو اس کا خیال بننا، پھر ارادہ بننا، پھر عملی صورت اختیار کرنا، ہم ان تمام درجوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اولاً انسان کے دل میں شبنم کی طرح خطرات آتے ہیں اور عقل اس کی طرف دیکھتی ہے۔ اگر اس کو وہ نا پسند ہوئے تو پھر ان کی طرف دوسری بار توجہ نہیں کرتا۔ اگر عقل کی نظر میں وہ خطرہ اچھا نظر آیا تو پھر اگر ایسا دوسرا خطرہ پیدا ہوگا تو وہ اس کو جگہ دے گا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ عقل کی اس سے محبت ہو جاتی ہے، تو اب اس کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر عقل نے چاہا کہ اس کو عملی صورت دی جائے تو یہ ارادہ ہوا۔ اس کے بعد جب وہ کام کیا تو اس کے بعد اس کو اس کام میں سرور حاصل ہوگا یا ندامت۔ یہ خطرات کا ایک دورہ ہے۔ اب اس نے وہی کام دوسری، تیسری بار کیا تو اس کو ملکہ کہا جاتا ہے اور جب اس نے ہمیشہ اس پر مداومت کی تو اس کو اس کی طبع ثانی یا فطرت ثانی کہا جاتا ہے۔ یہ کمال ہے۔ اسی طرح انسانیت میں ایک طرف تو بصیرت بیدار رہے گی اور اسے علم رہے گا کہ کون سی چیز ضرر دے رہی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ جل شانہ سے محبت تازہ بہ تازہ بڑھتی جائے گی۔ انسانیت کا اللہ تعالیٰ سے ربط آخری شکل میں بھی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

سُوْرَةُ الفاتحه مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ

سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی سات آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱) الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (۳)

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا، بے حد مہربان رحم والا، مالک روز جزا کا،

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۴) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۵)

تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں، بتلا ہم کو راہ سیدھی،

١ ع ٤٠ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۶) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (۷)

راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا، جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم O

سورۃ الفاتحہ مکیۃ

آیت (۱) الحمد للہ رب العالمین :۔ تمام جہانوں کا رب اللہ تعالےٰ ہے اور وہی ستائش کے قابل ہے ۔ کائنات عالم کو پیدا کرنے والی ایک ایسی ہستی ہے جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ڈور ہے ۔ ریت کے ذرّات سے لے کر انسان جو اشرف المخلوقات کہلاتا ہے تمام اُسی کے تابع ہیں*۔ اُس کی صفتیں یہ ہیں:۔

آیت (۲) الرحمٰن الرحیم :۔ باپ اپنی اولاد کو کس شفقت اور پیار کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ تمام عالم میں سب سے زیادہ عزیز اُسے اپنی اولاد ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنی اولاد کو بعض اوقات کسی بات پر سر زنش کرتا ہے ۔ اس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی اولاد کی اصلاح ہوجائے ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات رحمٰن ہے وہ اپنے بندوں پر شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جب کبھی ان سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو جس طرح باپ یا اُستاد سرزنش کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصیبت آتی ہے ۔ اس میں بھی یہی راز مضمر ہے کہ میرے بندے اپنی غلطی کی اصلاح کریں ۔ اِسی خیال کو مد نظر رکھ کر عیسائی لوگ خدا کی ذات کو باپ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ماں اپنی اولاد کو جس شفقت کی نگاہ سے دیکھتی ہے ! وہ وصف رحیم ہے اگر کسی قصور پر استاد سزا بھی دے تو ماں کی مامتا اُس سزا کو برداشت نہیں کرسکتی اور جھٹ شکایت کے لیے تیار ہوجاتی ہے ۔ اسی جذبے کے تحت ہندو لوگ ماں کو ماتا دیوی کہتے ہیں ۔ غرض ان دونوں جذبات کو مد نظر رکھ کر اسلام کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ماں باپ سے بڑھ کر اپنی مخلوقات کو عزیز رکھتی ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہوکر آئی ۔ اس کا بچہ گم ہوگیا تھا ۔ محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو اُسے سینے سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو حاضرین سے فرمایا کہ " کیا یہ ہوسکتا ہے کہ عورت اپنے بچے کو آگ میں

* اس کی مثال عدالت عالیہ ہے کہ ہر اپیل کا فیصلہ وہاں سے ہوتا ہے

U-109118

ڈال دے" لوگوں نے عرض کیا، ہرگز نہیں - فرمایا " تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچے سے ہے" - ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں ایک پرندہ کو چادر میں مع اس کے بچّوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کی "یا رسول‌اللہ، میں نے ایک جھاڑی سے ان بچّوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا - ان کی ماں نے جب یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی - میں نے زرا سا کپڑا کھول دیا تو وہ فوراً اپنے بچّوں پر گر پڑی" - ارشاد ہوا " کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے - جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے" - اللہ تعالیٰ اس سے بدرجہا زیادہ رحمت کی نظر سے اپنے بندوں کو دیکھتا ہے - اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ایک سو حصّوں میں سے ایک حصہ دنیا پر نازل کیا ہے - جس کا نتیجہ ہے ماں باپ کی اپنی اولاد سے محبت، انسان کی انسان سے محبت، حیوان کی حیوان سے محبت وغیرہ - اب اگر کوئی شخص تمام کائنات کی محبت کو ازل سے لے کر ابد تک جمع کرے اور پھر اس مجموعے کو ایک سو (۱۰۰) سے ضرب دے تو اللہ تعالیٰ کی محبت کا کچھ اندازہ لگا سکتا ہے -

آمدم برسر مطلب - جب انسانی سوسائٹی بن چکی تو ضرور ہے کہ اس میں باہمی تعلقات قائم ہوں - اس لیے حکم ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات رحیم ہے اسی طرح اس کے بندوں کو ایک دوسرے پر رحم کرنا چاہیے - ایک کا حق دوسرا غصب نہ کرے - اتفاق اور یک جہتی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں - اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر زیادتی کرے گا تو حکم ہوتا ہے کہ :-

آیت (۳) **مالک یوم الدین** :- یعنی بندوں کو اس نے پیدا کیا ہے تو ان کا وہ حساب بھی ایک دن لے گا - حساب لینے سے یہ مدّعا نہیں کہ انسان کو سزا دی جائے بلکہ وہ ذات تو غفور رحیم ہے - مدّعا یہ ہے کہ انسان کی آلودگی کو دور کر کے اسے دوسری زندگی یعنی جنّت میں از سرِ نو زندگی بخشی جائے -

آیت (۴) **ایاک نعبد و ایاک نستعین** :- ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں - انسان نے تمام کائنات کو دیکھا اور اس سے اندازہ لگایا کہ اس تمام عالم کے اوپر ایک ذات ہے - ہم اپنا سر نیاز اسی کے آگے ختم کرتے ہیں کیونکہ وہی ہمارا مالک اور کارساز ہے اور اسی سے ہم مدد مانگتے ہیں - بڑے بڑے توند والے جس قدر دنیا میں ہیں انہوں نے انسان پر ظلم وستم کر کے انسانی حقوق

غصب کرلیے اور انسانوں سے اپنی بندگی کرانے لگے - اے اللہ! ہم ان سے بیزار ہیں اور اب تجھی سے مدد مانگتے ہیں -

آیت (۵) اھدنا الصراط المستقیم :- اے اللہ ! جب تونے ہمیں بصارت عطا کی تو ہمیں سیدھے راستے پر چلنے کی ہمت اور توفیق دے -

آیت (۶) صراط الذین انعمت علیھم :- سیدھا راستہ ان لوگوں کا جن پر تونے نعمتیں نازل کیں - ابن عباس فرماتے ہیں :- جن پر نعمتیں نازل ہوئیں آن کے چار مراتب ہیں: نبی، صدیق، شہداء اور صالحین (سورہ النساء - آیت ۶۹) - مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار ایک ایسی سوسائٹی عطا کر جس کے اراکین ان چاروں مراتب والے ہوں -

غرض کہ مراد ہے آن لوگوں کا راستہ جنہوں نے قرآن مجید یعنی فطرت الٰہی کے قانون کی پابندی کی اور پھر دنیا میں کامیاب زندگی بسر کی - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین رض جو حضرت عثمان کی شہادت کے فتنے سے پہلے گزر چکے ہیں، وہ ہمارے لیے نمونہ ہیں - آن کے بعد جو کوئی آن کے نمونہ پر عمل کرے، وہ **انعمت** کا مصداق ہے - اس واسطے کہا گیا کہ اے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تونے اپنا انعام نازل کیا ہے -

آیت (۷) غیر المغضوب علیھم ولا الضالین :- نہ ان لوگوں کا جن پر تونے غضب نازل کیا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جن پر غضب الٰہی نازل ہوا وہ یہود ہیں - اور بھٹکے ہوؤں سے مراد عیسائی ہیں - یہود پر غضب اِس لیے نازل ہوا کہ آنہوں نے توراۃ کی آیات مسخ کر ڈالیں اور آن کے معانی اور مطالب اپنے مطالب پر ڈھال لیے - بعینہ اہل اسلام کے چند علماء بھی اسی طرح کر رہے ہیں اور قرآن کے معانی کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے ہیں اور اِس طرح مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں - موجودہ زمانے میں بھٹکے ہوؤں سے مراد آج کل کا نوجوان طبقہ ہے جو گویا سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہے - مگر سیدھا راستہ پانے کی جستجو کر رہا ہے، اِس لیے آمید ہے کہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے گا -

اور ان لوگوں کا راستہ نہ دکھلائیو جن پر تیرا غضب نازل ہوا - مراد ہے ان لوگوں کا راستہ جنہوں نے قرآن حکیم یعنی فطرت الٰہی کے قانون کی نافرمانی کی - اس لیے وہ دنیا میں ناکام رہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی نشانی ہے - جو لوگ اِس نمونے کو سمجھتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کا نمونہ، فتنہ تک) مگر اس پر عمل کرنے کی ہمت نہیں رکھتے یا اللہ ! ہمیں ان لوگوں کا طریقہ نہیں چاہیے، وہ الضالین ہیں - اسی طرح جو لوگ اِس نمونہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین) کو نہیں سمجھتے،

ھمیں اُن کا بھی طریقہ نہیں چاھیے، خواہ وہ کسی قدر ھی سمجھدار کیوں نہ ھوں۔

اس سورہ کا نام فاتحہ ھے۔ اور ایک حدیث میں اس کا نام صلواۃ بھی آیا ھے۔ اس حدیث میں ھے کہ جب انسان کہتا ھے کہ الحمد للہ رب العالمین تو اللہ تعالیٰ فرماتا ھے کہ حمدنی عبدی۔ اور بھی اس سورہ کے بہت نام ھیں۔ مگر اِس کی تاریخ نزول یقینی نہیں کہی جاسکتی۔ یہ ایک عقلی بات ھے کہ پہلے سورہ العلق نازل ھوئی اس میں ھے:- ارءیت الذین ینھیٰ عبدا اذا صلّی۔ گویا نماز ابتدائے نبوت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ پڑھتے تھے۔ تو یہ بات عقل میں نہیں آتی کہ نماز میں سورہ الفاتحہ نہ پڑھی جاتی ھو۔ اِسی لیے گمان ھوتا ھے کہ یہ سورۃالفاتحہ ابتدائے سال نبوت میں نازل ھوئی ھو۔ واللہ اعلم۔ مگر کوئی روایت نہیں ملتی۔ اور حدیث میں آتا ھے کہ سورہ الفاتحہ کے مثل نہ توراۃ میں ھے اور نہ انجیل میں ھے۔ وغیر ذالک۔ تو یقیناً سمجھا سکتا ھے کہ سورہ الفاتحہ بعد اقرء کے نازل ھوئی۔ ابن مسعود رضہ نے اپنے قرآن میں سورہ الفاتحہ اس لیے نہیں لکھی تھی کہ وہ تو نماز کے لیے سکھلائی گئی ھے۔ پس ان تمام باتوں سے یقین ھوتا ھے کہ جب سے نماز فرض ھوئی اسی وقت یہ سورۃ الفاتحہ نازل ھوئی ھے۔

تمت بالخیر

مطبوعہ
سندھ یونی ورسٹی پریس - حیدرآباد (پاکستان)
شائع کردہ
نظام الدین ھالی پوٹہ - پروپرائٹر، انٹر نیشنل بک کارپوریشن -
ھیرآباد - حیدرآباد (پاکستان)

تصحیح نامہ

نوٹ:- افسوس ہے کہ باوجود سخت محنت اور کوشش کے پروف کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ قارئین حضرات براہ کرم مندرجہ ذیل اغلاط کی تصحیح فرمائیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳	۱۴	دوست	درست
۱۷	۴	انداز	انذار
۱۹	۲۷	سجا	سبحا
۲۲	۲۷	معاوضہ	معارضہ
۲۳	۲	فطرف	فطرت
۲۳	۱۲	فیامت	قیامت
۳۲	۱۰	چوڑے	جوڑے
۳۹	۱۶	ملول	معلول
۴۵	۸	ملھوظ	ملحوظ
۴۵	۱۸	وظن	یظن
۵۱	۱	الانشاق	الانشقاق
۵۳	۱۶	قدے	قدرے
۵۵	۱۱	مضحمل	مضمحل
۶۴	۸	گھاٹیاں	کھائیاں
۶۷	۲۱	پزید	پذیر
۶۹	۵	وما	وماً
۶۹	۶	آسمان اور کی	آسمان کی اور
۷۰	۱۴	سمجھانے	سنبھالنے
۷۴	۲	بولے گا	بھولے گا
۷۶	۱۲	(جننا)	جتنا
۸۲	۲	کیا اسکو	کیسا اسکو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۴	۷	الذی	لذی
۸۶	۸	کرتے	کرتے هو
۸۷	۱۰ - ۱۱	خطیرۃ القدس	حظیرۃ القدس
۹۱	۴	اقلیت	عقلیت
۹۱	۱۴	تالیٰ	تعالیٰ
۹۱	۲۴	طرف	طرز
۹۳	۱۷	ایمپائر	ایمپرر
۹۴	۶	شہر کی	شہر میں
۹۴	۶	جننے	جنے
۱۰۲	۶	عمل نے	عقل نے
۱۰۵	۱	نہیں دینا	نہیں جانے دینا
۱۰۷	۲۱	خطرات نہیں	خطرات هیں
۱۱۰	۳	تعالیٰ اِس	تعالیٰ کے اِس
۱۲۱	۲۰	مدات	معدات
۱۲۲	۱۸	کیا	کرو
۱۲۶	۶	کوشش	کشش
۱۳۸	۶	کصری	کسرے
۱۴۵	۱۰	حسینی	حسنی
۱۷۹	۳۰	نسلی تنافر	نسلی تفاخر
۱۸۳	۱۲	مفاجات	مناجات
۱۹۸	۲۴	العلق	الفلق